بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ سورة لقمان (14)
(اسے یہ حکم دیا) کہ تو میرا (بھی) شکر اداکر اور اپنے والدین کا بھی.

اسلامی ٹیلیفون سروس کا تعارف

اسلامی ٹیلیفون سروس کی بنیاد عرب جمہوریہ مصر میں فضیلت مآب امام اکبر شیخ ا لازھر کی منظوری سے اگست 2000ء میں ڈالی گئی اور گذشتہ آٹھ سالوں کے دوران اس سروس نے اپنے متعدد اعلی کامیابیوں کے ذریعے دین اسلام کی اعتدال پسندی کو احسن انداز سے پیش کیا ہے-

ان میں پہلی نمایاں کامیابی سوال وجواب کی سروس ہے۔ اس سروس میں کوئی بھی شخص اپنے ملک میں اسلامی ٹیلیفون سروس کے کسی بھی نمبر پر رابطہ قائم کرکے اپنا مسئلہ مکمل آزادی اور رازداری سے ریکارڈ کرتا ہے پھر چوبیس گھنٹوں کے بعد رابطہ قائم کرکے ازھر شریف کے چنیدہ ممتاز علماء کرام کی جانب سے دئیے گئے اپنے سوال کا جواب پاتا (سن سکتا) ہے.

دوسری یہ کہ رابطہ کرنے وا لا شخص ارکان اسلام کے بارے میں مختصر مذھبی خطابات بھی سن سکتا ہے اسی طرح اسلامی ٹیلیفون سروس نے پورے قرآن کریم کی آیات کریمہ کی آسان فھم اور مکمل تفسیر بھی پیش کی ہے اور رابطہ کرنے وا لا انسان آیت کریمہ کی صحیح تلاوت اسکے الفاظ کے معانی، اسباب نزول اور اسمیں علمی وسائینسی اعجاز کوبھی سن سکتا ہے-

اور یہ کتاب اسلامی ٹیلیفون سروس کی کوئی پہلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے قبل یہ سروس"فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ" پس تم اھل ذکر سے پوچھ لیا کرو "کے زیر عنوان بھی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے. جو منتخب اور تصحیح شدہ فتوؤں اور ازھر شریف کے جید علماء کرام کے قلم سے دئیے گئے جوابات پر مشتمل ہے.

جہاں تک پیش نظر اس کتاب کا تعلق ہے تو یہ ان بعض سخت اور متشدد فتوؤں کا علمی رد ہے جو اسلام کی رواداری طبیعت کی صحیح عکاسی نہیں کرتے، اور انکے مفتی حضرات کو لوگوں کی زندگیوں پر انکے (منفی) اثرات اس غلط تصویر کا ادراک اور شعور بھی نہیں جو یہ متشدد فتوے اسلام اور اھل اسلام کے بارے میں پیش کرتے ہیں-

ان دنوں اسلام اور اھل اسلام کی تصویر کو جس طرح بگاڑ کر پیش کیا جا رہا ہے(وہ بہت خطر ناک ہے) اس صورتحال پر ھمیں خاموش تما شائی نہیں بننا چاہیئے بلکہ ہر غیور مسلمان اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ اگر ہم مذھبی امور کو ان لوگوں کے حوالے کر دین جونہ تو اسلامی شریعت کے اعلی مقاصد کا ادراک رکھتے ہیں اورنہ ہی اس رحمت سے واقف ہیں جو اسلام سارے جہانوں کے لئے لیکرآیا ہے. تو اس مذھب کی تصویر میں کس قدر لگاڑ پیدا ہو سکتا ہے-

لوگوں کی کسی جماعت کی عادات وتقالید کو یہ سمجھتے ہوئے منتقل کرنا یا انکی پیروی کرنا کہ مذھب ہے غلط اور اللہ تعالی پر بھتان ہے. تشدد، سنگدلی، سخت روی اور دیہاتی گنواروں کی بد سلوکی کو اسلام سے منسوب کرنا بہت بڑا جرم ہے. حضرت عائشہ سے مروی حدیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ. "مَا خُيِّرَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلاَّ اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا".

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو"جب دو امور میں اختیار دیاگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے آسان کو اختیار فرمایا بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو" ایک اور حدیث مقدسہ میں ہے:

"إِنّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ"، اسکا مفہوم یہ ہے کہ" کسی بھی چیز میں نرمی اور ہمدردی ہی اسکی زینت ہوتی اور صرف اسکے عیب ہی ختم کئے جاتے ہیں"-

ھماری نسل نے ان علماء أفاضل کے زیر سایہ پرورش پائی جنھوں نے ھمارے اندر دین اسلام کی محبت پیدا کی. اسی طرح انکے بعد پیغام پنہچانے، ادائیگی أمانت اور تبلیغ اسلام کو جاری رکھنا چاہئیے، آنے والی نسلوں کو ان لوگوں پر چھوڑ دینا جو اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور نہ ہی انہیں اس پیغام کا(صیح) ادراک ہے جو اسلام میں پوری انسانیت کی بہتری کے لئے موجود ہے. تو یہ دین حق کے خلاف خیانت کی مانند ہے.

اس وجہ سے ہر اس شخص پر جو کسی تشدد اور مبالغے کے بغیر اس مذھب کی آسانی کو بیان کر سکتا ہے واجب ہے کہ وہ ایسا کرے تاکہ ھم نوجوانوں کو اس مذھب سے متنفر کرنے کے موجب نہ ہوں، یہ دین اسلام دنیا وآخرت میں انکی سعادت اور نجات کا سبب اور ذریعہ ہے- اس سلسلے میں، میرے نزدیک الله رب العزت کے اس فرمان مبارک سے زیادہ جامع اور عمدہ، اور کوئی بات نہیں ہے جس میں ارشاد باری ہے کہ: ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران 159).

ترجمہ. اور اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے اطراف سے چھٹ کر بھاگ جاتے.

آخر میں، میں ان علماء کرام کا پر خلوص شکریہ اداکرتا ہوں جنہوں نے غلط مفاھیم کی تصحیح اور دین اسلام کی صحیح خوبصورت تصویر کشی کی ذمہ دأری اپنے کا ندھوں پر لی، اور وہ ہیں:

1- پروفیسر ڈاکٹر شیخ/ احمد عبد الحمید ـ استاد فقہ اسلامی ـ کلیہ شریعہ وقانون
2- پروفیسر ڈاکٹر شیخ/ محمد فؤاد رشاد ـ استاد فقہ اسلامی ـ کلیہ شریعہ وقانون
3- پروفیسر ڈاکٹر شیخ/ علی منصور عثمان ـ استاد فقہ اسلامی ـ کلیہ شریعہ وقانون
4- پروفیسر ڈاکٹر شیخ/ یاسر عبد العظیم ـ استاد فقہ اسلامی ـ کلیہ شریعہ وقانون
5- پروفیسر ڈاکٹر شیخ/ انس ابو شادی ـ استاد فقہ مقارن ـ کلیہ شریعہ وقانون
6- پروفیسر ڈاکٹر/ محمود عبد الجّواد ـ استاد فقہ اسلامی ـ کلیہ شریعہ وقانون

اس کتاب کی نظر ثانی پر میں پروفیسر ڈاکٹر محمود خیامی حسن/ صدر شعبہء اسلامیات. فیکلٹی آف میڈیسن. ازھر شریف، اور پروفیسر ڈاکٹر محمود عبد الجّواد استاد فقہ اسلامی، کلیہ شریعہ وقانون کا شکریہ ادا کرتا ہے. اور اسلامی ریسرچ اکیڈمی کے رکن اور ازھر شریف کے کلیہ شریعہ وقانون کے سابق ڈین / پروفیسر ڈاکٹر امام محمد رأفت عثمان کا خصوصی طور پر ممنوں ہوں جنھوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا، اور اس کی طباعت کیلئے ڈاکٹر ایھاب عیوطی اور پروفیسر سمیر طلبہ جنہوں نے اس پر نظر تانی کی کا بھی ممنون ومشکور ہوں.

آخر میں، میں اپنے والدین کی مسلسل مدد اور اس مفہوم. (لا یصح إلا صحیح) کو مضبوطی سے قائم کرنے پر ان دونوں انتھائی ممنون ومشکور اور زیر بار احسان ہوں-

شریف عصمت عبد الحمید

صدر مجلس انتظامیہ

نوٹ: ان علمي ردود اور تبصروں میں بیان کردہ آیات قرآنیہ کا ترجمہ، شیخ الإسلام پروفیسر ڈاکٹر **محمد طاھر القادری** مدظلہ العالی، کے ترجمہ عرفان القرآن سے ماخوذ ہے.

بسم لله الرحمن الرحيم

مقــدمـہ

أحمدالله - - - - - - إلي يوم الدين.

اللہ تبارک و تعالی کی حمد و ثنا کرتا ہوں اسی سے معاونت اور ہدایت کا خواستگار ہوں صلاۃ و سلام ہو ہمارے آقا و سردار حضرت محمد مصطفی - صلی اللہ علیہ وسلم، آپکی اولاد، اور قیامت تک آپ - صلی اللہ علیہ و سلم - کی اتباع کرنے والوں پر۔

اسلامی ٹیلفون سروس کی مجلس انتظامیہ کے صدر محترم شریف عصمت عبدالمجید نے مجھ سے کتاب فتاوی اور شریعت کے آسان احکام کا مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ یہ ملاحظہ کیا گیا ہے بعض فتووں کا انداز بہت سخت ہے جبکہ احکام میں آسانی ، اسلامی تشریع کی بنیاد ہے ۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾.

اللہ تعالی تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمھارے لیے دشواری نہیں چاہتا.

ایک اورمقام پر فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ اوراس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھي.

فقہ اسلامی کا مسلمہ امر یہ ہے کہ ظنی مسائل میں کئی آرا ہو سکتی ہیں بشرطیکہ فقہی رائے شریعت اسلامی کے سر چشموں کے د لائل میں سے کسی ایک دلیل پر مبني ہو ۔ چنانچہ ہمارے علم کے مطابق فقہ اسلامی کے کسی بھی امام یا بڑی مشہور شخصیت میں سے کسی نے اور نہ ہی شرعی علوم کی کسی بھي غیر فقہی شخصیت نے کبھی یہ نہیں کیا کہ اسکی رائےہی حق ہےجسمیں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ، بلکہ انکے بارے میں ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ وہ اپنی آراء سے اختلاف کرنے والوں کا مکمل احترام کرتے تھے ۔ اسوجہ سے ہم فقہ اور دیگر شرعی علوم کی کتابوں میں کئی اختلافی آراء پاتے ہیں انکے ساتھ ساتھ مؤلف کتاب کے لئے رحمہ اللہ تعالی اللہ تعالی ان پر رحمت فرمائے جیسے دعائیہ کلمات بھی ہوتے ہیں ۔

حضرت امام ابو حنیفہ - رضی اللہ تعالی عنہ - کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ رائے ہے اور ہماری صلاحیت کے مطابق یہی بہترین رائے ہے پس اگر کوئی اس سے بہتر لائے تو ہم اسے قبول کرتے ہیں۔

حضرت امام شافعی - رضی اللہ تعالی عنہ - کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: میری صحیح رائے میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے، دوسرے کی غلط رائے صحیح ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ - صلی اللہ علیہ و سلم - کے بعد کسی کا قول غلطی سے محفوظ نہیں ہے (یعنی ہر ایک سے غلطی ممکن ہے) اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد اور مالک بن انس - رضی اللہ عنہم - فرماتے ہیں کہ کوئی ایسا نہیں جس کا کلام لیا گیا ہو اور پھر اسے اس کی طرف رد نہ کر دیا گیا ہو سوائے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ و سلم کے۔[1] (رسول اللہ - صلی اللہ علیہ و سلم - کے کلام مقدس کے علاوہ کسی اور شخص کا کلام نا قابل رد نہیں ہے)۔

ایک ہی مسئلہ کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے سے فقہ اسلامی ما لامال (میں ترقی ہوئی) اور اسکا دائرہ وسیع ہوا ۔ اور فقہائے اسلام کی آراء ایک ہی کارخانے میں ایک

---

[1] ا لانصاف فی بیان اسباب ا لاختلاف فی ا لاحکام الفقھیہ. از شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم الفاروقی الدھلوی صـ 20، المطبعہ السلفیہ بالقاھرہ سنہ 1385ھ ۔

ہی سانچے میں ڈھلے ہوے نمونے کی مانند نہیں تھیں ۔ بلکہ انمیں تنوع اور رونما ہونے والے متعدد قضیئے ہوتے ہیں جو افراد، جماعتوں اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور اس سے آزادی رائے کے اصول کے احترام، عظمت اور شریعت اسلامی کی بلندی واضح ہوتی ہے ۔ اگر شریعت اسلامی میں آزادی رائے اور اسکا احترام نہیں ہوتا تو ہمارے سامنے فقہ اسلامی کا یہ عظیم اور زبردست ذخیرہ نہیں ہوتا۔ فقہی مسالک کے درمیان کثرت رائے اور تعدد کے ساتھ ساتھ ہمارے علمائے کرام کا مقصد دوسروں کی شان کو کم کرنا ہرگز نہیں تھا اور نہ ہی کسی ایک رائے کے خلاف تعصب پایا گیا ۔ سوائے بعض حالتوں کے جن میں بعض لوگوں نے اپنے مسلک کے لئے شہرت اختیار کی ہے اور یہ بات خود ان کے اپنے مذہب کے بانی کے اصول کے خلاف ہے اور ہمارے علم کے مطابق ایسا بہت ہی کم حالتوں میں ہوا ہے ۔ اور یہ مسالک بھی اسوقت سامنے آئے جبکہ دوسرے مذاہب کے خلاف تعصب عام ہوا لیکن مذاہب کے اماموں نے اپنے مذاہب کے لیے شہرت اختیار نہیں کی.

اس سلسلہ میں فقہ حنفی کے ایک عالم کے بارے میں مبالغہ آرائی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہیں حضرت عبید اللہ بن الحسن الکرخی جنکا وصال سنہ 340 ھ ہجری میں ہوا تھا انہوں نے کہا ہر آیت جو ہمارے اصحاب (جن سے انکا مقصد حنفی مسلک کے بڑے فقہاء ہیں) کی آراء کے (بظاہر) مطابق نہیں ہیں وہ تاویل شدہ یا منسوخ ہیں، اسی طرح حدیث شریف بھی تاویل شدہ یا منسوخ ہے ([2])۔

لیکن یہ بات اس عام قاعدے سے ہٹ کر ہے چسپر مسالک کے آئمہ کرام عمل پیرار ہے ۔ اور یہ قول فقہ اسلامی کے صرف اس ایک دور کا اظہار کرتا ہے. جسمیں اجتہاد نہیں بلکہ اماموں کی تقلید کا رجحان عام تھا ۔ جبکہ یہ فقیہ جس مسلک سے وابستہ ہیں اس مسلک کے بانی امام ابو حنیفہ - رضی اللہ تعالی عنہ - نے نہ تو خود اور نہ ہی فقہی مسلک کے کسی اور امام نے اپنے صحیح ہونے اور دوسرے کے صحیح نہ ہونے کا دعوی کیا ہے۔

چنانچہ آئمہ کرام واضح طور پر یہ کہتے تھے کہ ان میں سے کسی سے بھی مسائل کے استنباط میں غلطی ہو سکتی ہے۔ یہانتک کہ ایک سے زائد آئمہ سے یہ قول منقول ہے "اگر حدیث صحیح ہے تو یہ میرا مسلک ہے اور میری بات کو ترک کر دو "یہی وہ منہج اور اسلوب علم ہے - جسپر صحابہ کرام - رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین - عمل پیرار ہے.

حضرت ابو بکر صدیق - رضی اللہ تعالی عنہ - جب کسی مسئلہ کے بارے میں اجتہاد فرماتے تو کہتے: یہ میری رائے ہے اگر صحیح ہے تو اللہ رب العزت کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے ہے اور میں اللہ رب العزت سے استغفار کرتا ہوں ۔ حضرت عمر بن خطاب - رضی اللہ تعالی عنہ - کے کاتب نے جب یہ لکھا کہ یہ اللہ رب العزت کی جانب سے ہے اور یہ عمر کا خیال ہے تو حضرت عمر - رضی اللہ تعالی عنہ - نے فرمایا: تم نے برا کہا، کہو یہ عمر - رضی اللہ تعالی عنہ - کی رائے ہے۔ اگر صحیح ہے تو اللہ رب العزت کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہے تو عمر کی طرف سے ہے۔ اور کہا سنت وہ ہے جو اللہ اور اسکے رسول - صلی اللہ علیہ و سلم - کا طریقہ ہے غلط رائے کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ۔(2)

جب بعض لوگ اس عورت کے بارے میں جسکے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اسکا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا ۔ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود - رضی اللہ تعالی عنہ

---

[2] تاریخ التشریع ا لاسلامی ، از شیخ محمد الخضری صــ 325 ، 347 .

[3] تاریخ التشریع ا لاسلامی ، از شیخ محمد الخضری صــ 117، 118.

- کے پاس گئے۔ تو آپ نے جواب کے لیے ایک ماہ کی مدت مقرر کی ۔ ایک ماہ کے بعد آپ - رضی اللہ تعالی عنہ - نے فرمایا۔ اس مسئلہ کے بارے میں،میں اپنی رائے کہتا ہوں اگر صحیح ہو تو اللہ رب العزت کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو ایک غلام کی ماں کے بیٹے کی جانب سے ہے ۔ اسکا مہر اسکی مثل عورت کے مہر کی مانند ہے نہ کم اور نہ زیادہ، اسکے لیے میراث ہے اور اسپر عدت ہے۔

چنانچہ متعدد آراء میں کوئی ممانعت نہیں ہے. رسول اللہ - صلی اللہ علیہ و سلم - کے بعد کسی کا قول غلطی سے محفوظ نہیں ہے۔

اس کتاب میں دی گئیں آراء ازہر شریف کے علماء کی ہیں۔ انہوں نے علماء کی بعض آراء سے اختلاف کیا جوان سے پہلے دی گئیں تھیں اور جب مسائل ظنی ہوں تو اختلاف میں کوئی حرج نہیں۔ ظنی مسائل میں متعدد آراء ہو سکتی ہیں اور وہ رائے ہی معتبر ہوگی جو دلیل پر مبنی ہو۔

اور اللہ رب العزت صحیح راہ کی جانب ہدایت دینے والا توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

28 صفر سنہ 1430 ھ
بمطابق 23 فروری سنہ 2009 م

ڈاکٹر محمد رأفت عثمان
پروفیسر تقابلی فقہ، سابق ڈین کللج آف شریعہ و قانون
جامعہ الازہر الشریف،
رکن اکیڈمی اسلامی تحقیقات.

تمہید

بسم الله والحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله صلى الله عليہ وسلم.
شرعی نصوص جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ نصوص جن سے عقیدے، فرائض اسلام اور اسکے متواتر ممنوعہ أمور کے احکام استنباط کئے جائے ہیں ان نصوص میں زبان ومکان کے اختلاف کے باوجود بھی کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ ہر زمانے میں ملّت اسلامیہ کا ٹھوس تصور پیش کرتی ہیں.

انکے علاوہ اکثر شرعی نصوص ظنی ہیں انکے سمجھنے اور احکام استنباط کرنے میں مجتھدین کے درمیان مختلف اراء ہو سکتی ہیں اور یہ الله رب العزت کی رحمت ہے. اور آسانی کی خاطر امت مسلمہ کو اجازت ہے کہ وہ ائمہ مجتھدین کی ان آراء میں سے کسی کی رائے کی اتباع کرے.

حضرت امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز فرمایا کرتے تھے کہ میرے لئے باعث مسرت ہے کہ صحابہ کرام کی متعدد اراء ہیں اگر ان میں اختلاف رائے نہ ہوتا تو سہولت کی اجازت نہ ہوتی. کئی صدیوں سے ملت اسلامیہ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ائمہ مجتھدین بالخصوص وہ چار ائمہ کرام جنکے مذاهب، اسلامی ممالک میں عام ہو چکے ہیں کے اقوال کی اتباع کرنے میں کوئی حرج نہیں.

لیکن آجکل ملّت اسلامیہ ایک مصیبت سے دوچار ہے کہ بعض لوگ اس سہولت اور تخفیف کو منسوخ، اور امت کو اس رحمت سے محروم کرنے اور لوگوں کو مذھب حنبلی کے شدید ترین ایک ہی قول کا پابند بنانے کی اس لیئے کوشش کررہے ہیں کہ یہی سنت ہے جبکہ یہ قول جملہ معروف اقوال اور مروّجہ مذاهب سے خارج ہے.

ان کی اس کوشش سے تمام اسلامی ممالک میں اختلاف اور انارکی پھیل رہی ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ اس چیز نے ملت اسلامیہ کو کمزور کردیا ہے جبکہ یہ ملت اسلامیہ تفرقے اور اختلافات کی بجائے اتحاد اور شیرازہ بندی کی انتھائی شدید ضرورتمند ہے تاکہ یہ ہر جگہ اپنے دشمنوں کی مکاریو ں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے.

اگر امت مسلمہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے اقوال کو چھوڑ کرالبانی، ابن باز کے اقوال کو اپنا لے تو اسے کو نسا فائدہ فاصل ہوگا بلکہ یہ توبہتر چیز کو ادنی سے بدلنے کی مانند ہے.

ان فتوؤں میں اختیار کر دہ سخت رجحان سے وسعت میں تنگی آئی ہے. الله رب العزت نے لوگوں کو جو وسعت عطا فرمائی اسکا دائرہ لوگوں پر تنگ ہو گیا اور اس دور میں بہت سارے مسلمانوں کو اذیت وتکلیف سے دوچار کیا اور ا نکے درمیان اختلاف اور انتشار پیدا کر دیا ہے.

یہ متشدد فتوے اور انکے جوابات کئی ایک اسلامی، بالخصوص عربی زبان بولنے والے ممالک سے جمع کئے گئے ہیں.

یہ مطالعے اوراستفادے میں آسانی کی خاطر فقھی ابواب میں جمع اور مرتب کئے گئے ہیں. اس کتاب کی نمایاں، خصوصیات یہ ہیں.

1- فتوؤں، کو انتھائی دیانتداری سے انکے دینے والوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے انکی مطبوعہ کتابوں یا علمی رسالوں، انکے اجزاء اور صفحات یا معلومات کے بین الأقوامی نظام (انٹرنیٹ) یا سمعی یا بصری ذرائع سے اخذ کرنے کی صورت میں انکے مکمل اور صحیح حوالے دئیے گئے ہیں.

2- قران کریم کی سورتوں اور آیات کے نمبر کا بیان.
3- حسب ضرورت احادیث شریف کے حوالے.
4- ایک فتوی کئی ایک مفتیؤں نے ملکر دیا ہے اس حالت میں تمام مفتیوں کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ انکا تعلق مختلف ممالک سے ہے اور بعض اوقات ایک ہی فتوے کے ایک سے زیادہ جوابات ہیں اور ہر جواب میں اضافی استفادہ ہے.
5- قارئین کی آسانی کے پیش نظر متشابھہ فتوؤں کو ایک جگہ جمع کرنا.
6- غیر معروف الفاظ اور مفردات کی وضاحت اور مفھوم بیان کیا گیا ہے.
7- مصری دار الإفتاء جیسے سرکاری اداروں، متعدد فقھی دائرہ معارف اور بعض مفتیان کے فتوؤں کی عبارتوں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ انکے مطلوبہ مفھوم تبدیل نہیں ہوئے.
8- عبارت کی وضاحت کیلئے ممکنہ حد تک نکتے، کامے اور استفھام جیسی مختلف علامات ترقیم/ رموز اوقاف بھی لگائے گئے ہیں.
9- ہر فتوے کارد دو حصوں پر مشتمل ہے. پہلا فتوے پر مختصر تبصرہ جبکہ دوسرا تفصیلی تبصرہ ہے. ان فتوؤں پر تبصرہ اور انکے علمی جوابات ازھر شریف کے کبار علماء کرام اور پروفیسر نے لکھے ہیں.

ازھر شریف کی میڈیکل فیکلٹی کے شعبہء اسلامیات کے سر راہ اور فقہ مقارن کے پروفیسر ڈاکٹر محمود خیامی حسن نے نظر ثانی کی اور اسکا مقدمہ ازھر یونیورسٹی کی فیکلٹی آف شریعہ وقانون کے پروفیسر ڈاکٹر محمد رأفت عثمان نے لکھا ہے.
اللہ تعالی ان جوابات کے لکھنے والوں کو جزائے خیرعطا فرمائے. اور مشرق ومغرب کے مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں. بیشک اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے. اسکے آغاز اور اختتام پر اللہ تعالی کا شکر ہے.

باب أول عقیدہ

1- اسلام سے خارج کرنے والے دس امور اور معصیت پر اصرار کرنے والے شخص کی تکفیر کرنا

سوال: اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل(فرق) کیا ہے؟ اور کیا وہ شخص جو زبان سے کلمۂ شہادت (دو شہادتیں) ادا کرنے کے بعد اسکے منافی اعمال کا مرتکب ہو تو کیا وہ اپنے روزوں اور نمازوں کی ادائیگی کے باوجود کفارکے زمرے میں شامل کیا جائے گا؟ اور معصیت پر اصدار کرنے والے کا کیا حکم ہے.

خلاصۂ فتوی: اسلام سے خارج کرنے والے دس امور:

1- شرک..
2- اللہ تعالی اور اسکے بندوں کے درمیان واسطے بنانا.
3- مشرکین کی تکفیر نہ کرنا.
4- کسی شخص کے کلام اور حکم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور حکم کو ترجیح دینا.
5- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رائے ہوئے دین کی کسی بات سے بغض رکھنا.
6- دین اسلام کی کسی بات کا مذاق اڑانا.
7- جادو.
8- مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی مدد ومعاونت کرنا.
9- یہ عقیدہ رکھنا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واجب نہیں ہے.
10- اللہ تعالی کے دین سے روگردانی، اسکی تعلیم حاصل نہ کرنا اور نہ ہی اس پر عمل کرنا.

(شیخ محمد بن عبد الوهاب. الدرر السنية ط 5(10/ 91)

معصیت پر اصرار کرنے وا لا شخص وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے چنانچہ یہ حلال سمجھنا ہوا اور یہ اسکا ظاہری کفر ہے گویا وہ یہ کہتا ہے. سود، میں جانتا ہوں کہ یہ حرام ہے لیکن میں یہ لونگا اور زنا، حرام ہے لیکن میں اسے کرونگا چنانچہ یہی حلال قرار دینا ہے اسمیں واضح طور پر جائز ٹہرانے کی خواہش ہے اس جیسے شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں.

(ابو اسحاق الحوینی اتباع اور اسکے اثر کے زیر عنوان انکی ٹیپ)

تبصرہ:

یہ فتوی غیر دقیق یعنی مکمل طور پر صحیح نہیں ہے یہ عام اور انشائیہ عبارتوں میں لکھا ہوا ہے جو کہ انتہائی خطر ناک نتائج کا موجب ہوتی ہیں. کیونکہ اس سے ان مذہبی لوگوں کیلئے مسلمانوں کی تکفیر کے دروازے پورے طور پر کھل جاتے ہیں جو اسکی عبارتوں کو غلط سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں.

چنانچہ کسی بھی غافل انسان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاپروا ہی کا شکار یعنی وہ اللہ تعالی کے دین سے روگردانی کرتا ہے، نہ تو اسکی تعلیم حاصل کرتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرتا ہے جیسا کہ اس فتوے میں کہا گیا ہے. نتیجہ کے طور پر وہ کافر ہوگا. مثال

کے طور پر اگر کوئی شخص علمی دروس میں بلائے جانے کے باوجود حاضر نہیں ہوتا۔ یا وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور حکم پر کسی اور کے کلام اور حکم کو ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی کافر ہوگا۔اور اگر اس نے داڑھی منڈائی تب بھی کافر ہوگا-
اور معصیت پر اصرار کرنے والے کی تکفیر کرنا خوارج کا مذہب ہے-

علمی رد:

مسلمان جس سے صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد ہو جائیں وہ اللہ تعالی کے اس فرمان کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالی: ﴿إِنَّ اللَّهَ لا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (النساء 116)، ترجمہ: بے شک اللہ تعالی اس(بات) کو معاف نہیں کرتا کہ اسکے سا تو کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جو(گناہ) اس سے نیچے ہے جیسکے لئے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔

اور حضرت عبادہ بن صامت سے مروی حدیث مبارکہ جسمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا".....ومن أصاب من ذلك شيئا ثم ستره الله ، فهوإلي الله إن شاء عفا عنه وإنشاء عاقبه"
اور جس نے ان چیزوں میں سے کسی کی خلاف ورزی کی پھر اللہ تعالی نے اسکی پردہ پوشی فرمائی تو اسکا معاملہ اللہ تعالی پر ہے چاہے تو وہ اسے معاف فرما دے اور چاہے تو اسے سزا دے ([3])۔

اور علماء کرام نے بیان کیا ہے کہ بے شک کفر بہت بڑی چیز ہے چنانچہ جبتک کسی کے کفر نہ کرنے کا احتمال پایا جائے تو مسلمان کی تکفیر نہیں جاتی. سوائے اسکے کہ علماء اسکے کسی ایسے عمل پر متفق ہو جائیں کہ جس سے مرتد ہونا واجب ہوتا ہو. اور اسی طرح اس مسلمان کو بھی کافر نہیں کہا جائیگا جسکے کلام اور عمل میں عدم کفر پر دور کا احتمال بھی پایا جائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: «وَمَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْكُفْرِ أَوْ قَالَ عَدُوَّ اللَّهِ وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِلَّا حَارَ عَلَيْهِ»، "اور جس نے کسی آدمی کو کافرکہ کر پکارا یا(اسے) اللہ تعالی کا دشمن کہا اور وہ ایسا نہیں تھا تو اس کا اطلاق اسی(کہنے والے) پر ہوگا".

اور یہ اس کیلئے بہت بڑی وعید ہے جس نے مسلمانوں میں سے کسی کو کافر کہا اور وہ ایسا نہیں تھا. اور یہ ایسا گڑھا ہے جسمیں تکفیر کا حکم لگانے میں تساھل کرنے والے بہت سے گر چکے ہیں. کیونکہ انکا مخالف حقیقتًا ایسا نہیں تھا۔

در حقیقت اھل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کی جاتی سوائے اسکے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا تسلسل سےھم پہنچنے کا انکار کرے۔ تو اس حالت میں وہ شریعت کو .جھٹلانےوا لا ہے۔

تو وہ شخص جس نے اس چیز کو حلال سمجھا جسکے حرام ہونے پراجماع ہے اور مسلمانوں میں یہ حکم معروف ہے جیسے خنزیر کا گوشت، زنا اور اسی طرح کے دوسرے امور جن میں کوئی اختلاف نہیں، تو اس نے کفر کیا. اور اگر بے گناہوں کے قتل اور کسی شبہ کے بغیر انکے مال غصب کرنے جیسے ظاھری گناہوں کو حلال سمجھتا ہے تویہ کفر کی علّت نہیں. اگرچہ خوارج جیسوں کی تأویل کے مطابق ایسا ہے۔ لیکن اکثر فقھاء(انہیں) مسلمانوں کے خون اور انکے اموال کو انکی جانب سے حلال جاننے کے باوجود انکے عدم کفر کے قائل ہیں اور ہر ممنوعہ امر کو حلال سمجھنے والے شخص پر کفر کی تأویل نہ ہونے کی بناپر یہی حکم لگایا جاتا ہے۔

[3] البخاري، ص 18.

ابن قدامہ نے کہا ہے کہ قدامہ بن مظعون کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے شراب کو حلال جانتے ہوئے پی لیا، تو حضرت عمر نے ان پر حد لگادی مگر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا.
اسی طرح حضرت ابو جندل بن سھیل اور انکے ساتھ ایک جماعت نے شام میں شراب کو حلال سمجھتے ہوئے اسے پی لیا، اور انہوں نے اس آیت کریمہ سے استد لال کیا.
﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾([4])، ترجمہ: ان لوگوں پر جو ایمان رائے اور نیک عمل کرتے رہے. اس(حرام) میں کوئی گناہ نہیں جو وہ(حکم حرمت اتر نے سے پہلے) کھا پی چکے ہیں.
چنانچہ انہیں کافر قرار نہیں دیا. جب انہیں اسکی حرمت سے اگاہ کیا گیا تو انہوں نے توبہ کی اور ان پرحد لگائی گئی(اب) جو انکی مانند ہیں ان پربھی انہی جیسا حکم لگایا جائے گا. اسی طرح کسی چیز کا علم نہ رکھنے وا لا شخص ہو سکتا ہے کہ اُس سے نا واقف رہے اس سے اسپر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا یہاں تک کہ وہ اسے جان لے اور اسکے بارے میں شبہ دور ہو جائے اور اسکے بعد وہ اسے حلال سمجھے.([5])
ابن قدامہ جیسے اہل علم محققین سے منقول یہ ٹھوس قواعد تکفیر میں جلدی کرنے، اسلام کو توڑنے والے دس خود ساختہ امور جیسی عمومی غیر صحیح اور غیر دقیق عبارتیں وضع کرنے سے کہیں بہتر ہیں، اور یہی مسلمانوں کی نا حق تکفیر میں مبتلا ہونے کے راستے ہیں اور جنکے چالوں میں اس زمانے کے بہت سے مذھبی نوجوان گر چکے ہیں اور اسکی وجہ ان عبارتوں کا عمومی، غیر صحیح اور کسی بھی دلیل وحجت کے بغیر تکفیر کا دروازہ کھولنا ہے. والله أعلم بالصواب.
شیخ ڈاکٹر عبد الوھاب بن ناصر الطریری کہتے ہیں ابو الحسن ا لأشعری کے بارے کسی نے کہا کہ جب انکی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے کہا. تم شھادت دو کہ میں کسی بھی اھل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتا کیونکہ سارے لوگ ایک ہی معبود کی جانب اشارہ کرتے ہیں.
امام ذھبی نے کہا یہی انداز زیادہ دینی ہے اور ھمارے شیخ ابن تیمیہ اپنے آخری ایّام میں اسی طریقے پر تھے. وہ کہتے ہیں کہ میں امت میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتا اور کہتے ہیں کہ رسول الله صلی الله علیہ وسلم نے فرمایا: وضوء کی حفاظت صرف مومن ہی کرتا ہے. چنانچہ وضوء کے ساتھ نماز کی پابندی کرنے وا لا مسلمان ہے. اب آپ ان ائمہ کرام ابو الحسن ا لاشعری، ابن تیمیہ اور امام ذھبی کو دیکھئیے وہ فرقوں سے واقف تھے انہوں نے انکے حا لات انکی شخصیتوں کے مطالعے کئے اور انکے افکار کے جوابات دئیے چنانچہ یہ لوگ ان فرقوں کے خیا لات سے سب سے زیادہ واقف تھے اسکے باوجود وہ کسی کی تکفیر کرنے میں انتھائی

---

[4] سورة المائدة، ص 93.

[5] المغنی ابن قدامة، 9/ 31، حاشہ ابن عابدین میں ہے کہ کفر بہت بڑی چیز ہے تو جب تک کسی کے کفر نہ کرنے کی روایت موجود ہو تو میں اسے کافر قرار نہیں دیتا ہوں. الخلاصہ وغیرہ میں ہے کہ اگر کسی مسئلے میں اکثر وجوھات کفر ثابت کر رہی ہوں اور ایک وجہ کفر سے منع کر رہی ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ وہ مسلماں پر حسن ظن کی وجہ سے کفر سے منع کرنے والے سبب کی طرف مائل ہو، بزازیہ مزید بیان ہے کہ اگر وہ کفر کے موجب ارادے کا واضح اظہار کرے تو اس کیلئے تأویل سود مند نہیں ہے. اور کتاب التتارخانیہ میں ہے کہ احتمال کی بنا پر کافر قرار نہیں دیا جاتا کیونکہ کفر آخری سزا ہے چنانچہ یہ حرام کی انتھائی آخری حد کی متقاضی ہوتی ہے. اور احتمال کی کوئی آخری حد نہیں. اور جو شخص مسلماں پر کفر فتوی دیتے کا عزم کرے تو اسکی اس بات خوش کن سمجھا جاتا ہے یا نیک نیتی سمجھی جائے گی، یا اسکے کفر میں خواہ کمزور روایت ہی سے اختلاف ہو اس پر کفر کا فتوی نہیں لگایا جائے گا اسی بنیاد پر تکفیر کے اکثر مذکورہ الفاظ پر عدم کفر کا حکم لگایا جائے گا اور میں نے اس امر کفرکو اپنے اوپر لازم کیا کہ ان چیزوں میں سے کسی کے بارے میں فتوی نہیں دو نگا، کلام البحر باختصار حاشية ابن عابدین، 4/ 334.

محتاط تھے، چانچہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ جو انکے علم تک نہیں پہنچتے اور کسی بھی دلیل کے بغیر لوگوں کی تکفیر کرین انکے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ ([6])
ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز میں مسلمان کی تکفیر نہیں کی جاتی بجز اسکے کہ وہ کوئی ایسا قول یا فعل یا عقیدہ لے کر آئے جو کتاب وسنت کی رو سے بڑا کفر ہو اور وہ ملت اسلامیہ سے نکلتا ہو یا علماء کرام کا اتفاق ہو کہ یہ بڑا کفر ہے، کسی مسلمان کی تکفیر کفر کی شرطیں پوری ہو نے ، اس راہ میں مانع ساری باتیں ختم ہونے پر ہی کی جاتی ہے انہیں میں سے ہے کہ وہ بالغ، عاقل اور خود مختار ہو اور لا علمی یا تأویل جیسا عذر نہ ہو([7]) اللہ أعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمد فؤاد

2۔ ترک نماز

سوال: دریافت کیا گیا کہ نماز نہ پڑھنے والے شوھر کے ساتھ عورت کا رہنا یا نماز ادانہ کرنے والی بیوی کے ساتھ مرد کے رہنے کا کیا حکم ہے.

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا ہے کہ بے نمازی شوہر کے ساتھ بیوی کا رہنا جائز نہیں کیونکہ تارک صلاۃ کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے اور اسکا نکاح ختم ہو چکا ہے، وہ وراثت حاصل نہیں کریگا، اگر وہ فوت ہو جائے تو اسے غسل بھی نہیں دیا جائے گا نہ ہی اس کی نماز جنازہ اداکی جائے گی، نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائیگا بلکہ اسے صحراء میں لے جاکر اسکے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے کیونکہ اسکا کوئی احترام نہیں ہے.
شیخ ابن عثیمین. رسالۃ صفۃ صلاۃ النبي صلی اللہ علیہ وسلم، 29- 30

تبصرہ:
اس فتوے نے بیک قلم پوری دنیا کے تقریبًا ایک چوتھائی یا ایک تہائی مسلمانوں کو اسلام سے خارج کر دیا ہے یعنی تقریبًا 500 ملین مسلماں مرتد ہوگئے اور انکا قتل کرنا واجب ہوگیا ہے اور انکے انتقال پر نہ تو انکی نماز جنازہ اداکی جائے اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے نہ وراثت حاصل کریں اور نہ ہی انکا کوئی وأرث بنے گا اور شوہروں اور بیویوں کے درمیان اس وجہ سے علیحدگی ہو گئی کہ وہ نماز نہیں پڑھتے، اور تاریخ اسلام کے کسی زمان ومکان میں اسلامی ممالک میں بے نمازیوں کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں، وراثت سے حصہ لیتے اور دیتے ہیں اور(فوت ہونے پر) مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ مسلمان ہیں، ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ ان کمزور آراء پر قائم رہنے، ائمہء کرام، ملت اسلامیہ کے جمہور علماء کی مخالفت اور مسلمانوں کو اللہ کے دین سے فوج در فوج نکالنے کا مقصد کیا ہے.

علمی رد:
نماز اسلام کے بنیادی ارکان میں سے اہم رکن ہے اور ایمان میں اسکا مقام ومرتبہ ایسے ہی ہے جیسے جسم میں سر کا ہے. پابندی نماز کی فرضیت ، اسے ترک کرنے یا اسے ہیچ سمجھنے پر

[6] فضیلت مآب شیخ ڈاکٹر عبد الوهاب بن ناصر الطریری، امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی کے تدریس عملے سابق رکن. یہ اقتباس"اسلام الیوم" ویب سائیڈ سے لیا گیا.
[7] ڈاکٹر عبد اللہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز فتوی نمبر 6، 81.بعنوان: وہ امور جن کی بنا پر انسان پر کفر کا حکم لگایا جاتا ہے، تاریخ فتوی، 28 صفر 1422ھ.

تحذیر وتنبیہ کے بارے بہت سی نصوص آئی ہیں. اور ترک نماز کے سلسلے میں سب سے اھم امام مسلم کی روایت کر یہ حدیث شریف ہے: «بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ» ترجمہ: آدمی اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز ہی ہے.
اس حدیث پر امام نووی کی شرح کا خلاصہ یہ ہے کہ تارک نماز اگر اسکی فرضیت کا منکر ہو تو وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر ملت اسلامیہ سے خارج اور کا فر ہے. سوائے اس کے کہ اسے اسلام لائے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا اور مسلمانوں سے اس قدر ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ نماز کی فرضیت سے وأقف ہو. اور اگر کسی نے نماز کی فرضیت پر عقیدہ وایمان رکھتے ہوئے کاہلی اور سستی سے نماز ترک ہو جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے. تو جمہور علماء کے نزدیک اسے کافر نہیں بلکہ فاسق کہا جاتا ہے اور اسے توبہ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے. جبکہ امام احمد بن حنبل سے مروی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق وہ اسے کافر قرار دیتے ہیں.
اور انہوں نے مذکورہ حدیث شریف کے ظاھری مفہوم سے استد لال کیا ہے.

تارک نماز کی تکفیر نہ کرنے والوں کے د لائل:
1- ارشاد باری تعالی ہے.﴿إِنَّ اللَّهَ لا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (النساء116)، ترجمہ: بے شک اللہ تعالی اس(بات) کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جو گناہ اس سے نیچے ہے جس کیلئے چاہے معاف فرما دیتا ہے.
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آرشاد گرامی اسی پر د لالت کرتا ہے. جسمیں آپ نے فرمایا: "مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" جس نے. لا الہ ا لا اللہ کہا. اس پر جہنم حرام ہو گئی.
اور وہ لوگ جو تارک نماز کو کافر قرار نہیں دیتے وہ اس حدیث پاک. "بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ" آدمی اور کفر وشرک کے درمیان حد فاصل نماز ہی ہے، کے بارے میں جواب دیتے ہیں کہ اسکا مفہوم یہ وہ کفر کی سزا کا مستحق ہے. اور وہ ہے قتل بشرطکہ اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور وہ ترک نماز پر مصّر رہا یا حلال سمجھنے پر قائم رہا یا یہ کہ اسکے اس عمل سے کفر کی تاویل کی جائے. یا اسکے اس فعل کو کافروں کا فعل قرار دیا جائے.
امام السبکی طبقات الشافعیہ میں بیان کرتے ہیں. تارک نماز کے موضوع پر امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے درمیان مناظرہ ہوا: تو امام شافعی نے امام احمد سے کہا کیا آپ کہتے ہیں کہ اس(تارک نماز) کو کافر کہا جائے؟ امام احمد بن حنبل نے کہا. ھاں.
امام الشافعی نے کہا: اگر وہ کافر ہے تو پھر مسلماں کس سے ہوگا
امام احمد نے کہا: وہ کہے. لا الہ ا لا اللہ محمد رسول اللہ
امام شافعی نے کہا: وہ ہمیشہ یہ قول کہتا ہے اور اس نے کبھی ترک نہیں کیا
امام احمد نے کہا: واسلام قبول کرتا ہے کہ نماز اداکرے
امام شافعی نے کہا: کافر کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے اور (نماز ادا کرنے) سے اسکے اسلام کا حکم نہیں لگایا جاتا. تو امام احمد خاموش ہو گئے([8])

[8] فتاوی دار الإفتاء المصرية. موضوع 35. مفتی شیخ عطیہ صقر مئی 1996ء. اور یہ معمولی رد وبدل کے ساتھ انٹرنیٹ سے مصری وزارۃ اوقاف کی ویب سائیٹز سے نقل کیا گیا ہے.

امام ابن قدامہ نے اپنی کتاب"المغنی" میں اسی رائے کہ ترجیح دی ہے کہ وہ(تارک نماز) امام احمد بن حنبل کے مذھب کے مطابق بھی کافر نہیں ہے. تو ثابت ہوا کہ تارک نماز چاروں ائمہ کرام اور جمہور اهل علم کے نزدیک کافر نہیں ہے.
چنانچہ اسکے بعد اسمیں بھی کوئی شبہ نہ رہا کہ اسکے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات بھی صحیح ہیں.
ابن قدامہ نے مزید بیان کیا هیکہ پوری اسلامی تاریخ میں یہ ثابت نہیں کہ کسی مسلماں جج نے ترک نماز کی وجہ سے بیوی اور شوهر میں علیحدگی کرائی ہو. باوجود اسکے کہ تمام زمانوں میں بےنماز یوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے... اور انہوں نے کہا کہ همیں یہ معلوم نہیں کہ کسی زمانے میں تارک نماز کو غسل دئیے بغیر، اس پر نماز جنازہ کی ادائیگی اور مسلمانوں کے قبرستان میں اسکی تدفین نہ کی گئی ہو، اور نہ ہی اسکے ورثاء کو اسکا وارث بننے اور اسے اپنے مورث کا وارث بننے سے منع کیا گیا. اور نہ ہی تارکین نماز کی کثرت کے باوجود زوجین میں سے کسی کے تارک نماز ہونے کی وجہ سے ان میں علیحدگی کرائی گئی، اور اگر وہ کافر ہوتا تو یہ سارے احکام ثابت ہوتے([9])
فضیلت مآب ڈاکٹر سعود بن عبد الله الفنیسان کہتے ہیں:
پوری اسلامی تاریخ میں آجتک ایسی بات سامنے نہیں آئی کہ کسی شخص کو نماز ترک کرنے کی وجہ سے مرتد کے طور پر قتل کیا گیا ہو- علاوہ ازین اس قول کی وجہ سے اسکی بیوی کو طلاق اور اسکی اولاد نا جائز ہوگی جبکہ نماز ترک کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے.
اور میرے نزدیک سستی اور عدم اهتمام کی وجہ سے نماز ادا نہ کرنے والوں کی تکفیر نہ کرنے والا قول صحیح ہے([10]) والله أعلم بالصواب.
اس بناپر نماز نہ پڑھنے والا شوهر اس وقت تک کافر نہیں سمجھا جاتا جبتک کہ وہ اسکے یعنی نماز کے واجب ہونے پر ایمان رکھتا ہے، اور بیوی کو چاہیے کہ اسکو سلسل نصیحت کرتی رہے اور نا ہوئے بغیر اسے نماز کی طرف بلاتی رہے اور اسے نماز ترک کرنے کے انجام کا خوف دلائی رہے اور ایسی اچھی صحبت دے جو اسے راہ حق پر لے آئے ان حالات میں اچھی صحبت جادوئی اثر رکھتی ہے. اور نماز نہ پڑھنے والی بیوی کا بھی یہی حکم ہے اور هم اسکے شوهر کو بھی یہی نصیحت کرتے ہیں. کہ وہ اسے نماز اور استقامت کی ترغیب دے اور اسے طلاق دینے میں عجلت نہ کرے اور الله رب العزت کا یہ فرمان. ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ

[9] المغنی لابن قدامہ 2/ 158. اس نے کہا کہ رسول کریم صلی الله علیہ وسلم نے فرمایا:
"صلّو علی من قال لا اله الا الله" کہ جو لا اله الا الله کہے اس پر نماز پڑھا کرو. اور یہ کہ یہ اجماع امت ہے.. اور مسلمانوں کے درمیان اسمیں بھی اختلاف نہیں کہ تارک نماز پر اسکی قضاء ہونے والی نمازوں کی ادائیگی واجب اور فرض ہے اور اگر وہ مرتد ہوتا تو اس پر روزوں اور نمازوں کی قضاء لازم نہ ہوتی-
اور جہاں تک بیان کر دہ احادیث مبارکہ کا تعلق ہے تو یہ سختی اور کفار سے اسے (تارک نماز) تشبیہ دینے کے طور پر لائی گئی ہیں حقیقت کے طور پر نہیں جیسا کہ آپ صلی الله علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے. "سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر" مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کُفر ہے.
ایک اور حدیث مبارکہ ہے-
" ومن آتى حائضا أو أمرأة في دبرها فقد كفر بما أنزل على محمد" کہ جس نے حائضہ عورت سے ہم بستری، یا کسی اور عورت سے لواطت کی تو اس نے حضور صلی الله علیہ وسلم پر نازل شدہ(شریعت) کا انکار کیا.
ایک اور حدیث شریف ہے- "ومن قال مطرنا بنوء الكواكب فهو كافر بالله، مؤمن بالكواكب". جس کسی نے کہا کہ هم پر سیّاروں نے بارش کی چنانچہ وہ الله تعالی کا منکر اور سیاروں پر ایمان رکھنے والا ہے. ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:
"من حلف بغير الله فقد أشرك" جس نے الله تعالی کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانی یس اس نے شرک کیا. اور ایک اور حدیث مبار کہ ہے"شارب الخمر كعابد وثن" شراب نوشی کرنے والا بتوں کی عبادت کرنے والے کی مانند ہے، اور اسی طرح کی دوسری احادیث مبارکہ جن سے وعید کی شدت بتانا مقصود ہے. اور دونوں اقوال میں صحیح ترین یہی(عدم کفر) ہے.
[10] فضیلت سعود بن عبد الله الفنیسان، سابق ڈین کلیہ الشریعہ. جامعہ اسلامیہ امام محمد بن سعود. الاسلام الیوم ویب سائیٹز. بتاریخ آٹھ ذیقعد 1427ھ

عَلَيْهَا﴾ (سورة طه 132). سورہ طہ کی اس آیت کریمہ کا مفہوم ہے اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم فرمائیں اور اس پر ثابت قدم رہیں.
اور ان دونوں کو چاہئے کہ وہ نماز تہجد اور فجر کی دعاؤں سے مد د حاصل کریں اور اسے یہ جان لینا چاہیے کہ اگر اللہ رب العزتٔ بے نمازی کو ھدایت عطا فرمائے توبہ اسکے دین و دنیا اور جو کچھ اسمیں ہے اس سے کہیں بہتر ہے. و اللہ أعلم بالصواب.
ڈاکٹر محمد فؤاد

3- انبیاء کرام اور صالحین سے توسل اور استغاثہ
سوال: انبیاء کرام اور صالحین سے توسل اور استغاثہ کا حکم دریافت کیا گیا.

خلاصہ فتوی: جس کسی نے غیر اللہ کی موت کے بعد اسے پکارا یا اس سے مدد طلب کی تو وہ شخص شرک اکبر کا مرتکب مشرک ہے اور انبیاء کرام اور صالحین کو وسیلہ بنانا بدعت اور وسائل شرک میں سے ہے.
شیخ ابن باز ۔ مجموع فتاوی 5/ 319
الشیخ احمد فرید ۔ www.Alsalafway.com

تبصرہ:
یہ فتوی سابقہ فتوؤں کی مانند کمزور آراء، د لائل اور اکثر مسلمانوں کے با رے میں سوء ظن کی بناپر مسلمانوں کی ناحق تکفیر کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور انہیں کافر کہتا ہے۔ جبکہ اکثر علماء کے نزدیک انکا دامن اعمال غبار سے پاک ہے اور نا واقفٔ لوگ جو عقیدے یا عبادت میں غلطیاں کرتے ہیں وہ ہمیشہ موجود ہیں. اور ھم پر واجب ہے کہ ھم انہیں وعظ ونصیحت کریں. انہیں تعلیم دیں. انکے ساتھ شفقت ونرمی سے پیش آئیں اور انہیں أسلام سے خارج کریں اور نہ ہیٔ کفار کا نام دیں اور مسلمانوں میں سے غالبًا کوئی شخص بھی ممنوع اور کافرانہ انداز سے مدد طلب نہیں کرتا اور نہ ہی توسل کی تمام اقسام بدعت اور ممنوع ہیں.
علمی رد:
مخلوق سے مدد چاہنا اگر ایسے سوال سے ہو کہ مستغاث بہ بھی اسکی قدرت نہیں رکھتا. گویا اس سے یہ مانگنا کہ وہ اسکے دکھ ومصیبت اور بے قراری کو دور کردے یا اسٰے رزق عطا کرے تو یہ نا جائز اور شرک ہے. اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلاَ تَدْعُ مِن دُونِ اللّهِ مَا لاَ يَنفَعُكَ وَلاَ يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ﴾ (یونس 106). ترجمہ: یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے امت کو دیا جا رہا ہےاورنہ اللہ کے سوا ان(بتوں) کی عبادت کریں جونہ تمھیں نفع پنچا سکتے ہیں اور نہ تمھیں نقصان پنچا سکتے ہیں پھر اگر تم نے ایسا کیا تو بے شک تم اس وقت ظالموں میں سے ہو جاؤ گے.
لیکن اگر اس نے کسی کے توسل سے اللہ تعالی سے تکلیف ومصیبت کو دور کرنے کا سوال کیا اور متوسل بہ سے کوئی چیز نہیں مانگی جیسا کہنے والے کا یہ قول: اے اللہ اپنے عالی مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمٰ کے وسیلے سے میرٰی تکلیف دور فرما تو اس صورت میں وہ

شخص متوسل بہ یعنی صاحب وسیلہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالی وحدہ سے سوال کرنے اور اسی سے مدد چاہنے والا ہے.
فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اس طرح کا توسل شرک نہیں ہے کیونکہ اسمیں اللہ تعالی سے مدد طلب کی جارہی ہے نہ کہ صاحب وسیلہ سے، لیکن اُسکی حلت یا حرمت کے بارے میں انکا اختلاف اور انکے دو اقوال ہیں-
پہلا قول: انبیاء کرام اور صالحین کی زندگیوں میں انکے وصال کے بعد بھی ان سے توسل مشروع اور جائز ہے، یہ جمہور علماء کا قول ہے، اس پر انکے کئی دلائل ہیں.
انہی میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد مأثور دعائیں ہیں(اے اللہ) میں، تجھ سے مانگنے والوں کی خاطر، اور تیری راہ میں چلنے والوں کے توسل سے تجھ سے سوال کرتا ہوں.
انہی دعاؤں میں ایک دعا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت اسد کیلئے مانگی تھی کہ(اے اللہ) میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما دے. اور تو اپنے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے وسیلے سے اس پر جنت کے دروازے کھول دے بے شک تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے.
اور ان دلیلوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ ہے: "من زار قبري وجبت له شفاعتي". جس نے میری قبر انور کی زیادت کی اس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی اور اس حدیث مبارکہ سے بھی انہوں نے استدلال کیا جسمیں ہے کہ ایک نا بینے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنایا تو اسکی بصارت لوٹا دی گئی تھی.
دوسرا قول: اللہ تعالی کے سوا کسی سے استغاثہ(مدد طلب کرنا) نا جائز ہے انبیاء کرام اور صالحین سے انکی زندگی یا انکے وصال کے بعد مدد طلب کرنے میں توسل ممنوع ہے- یہ ابن تیمیہ اور انکے متبعین کی رائے ہے.
انہوں نے اللہ تعالی کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے (وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَومِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ) (الأحقاف 5). ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ایسے (بتوں) کی عبادت کرتا ہے جو قیامت کے دن تک اسے (سوال کا) جواب نہ دے سکیں اور وہ(بت) ان کی دعاء وعبادت سے (ہی) بے خبر ہیں.
ڈاکٹر عبد اللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز:
انکے مرکز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور وسیلے سے توسل کے مسئلے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے.
چنانچہ مذهب مالکی، شافعی اور حنبلی کے اکثر فقہاء اسکو جائز سمجھتے ہیں.([11])
واللہ أعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمد فؤاد

[11] ڈاکٹر عبد اللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز. فتوی نمبر 11669. بعنوان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل میں جواز وممانعت. تاریخ الفتوی. 11 رمضان 1422ھ

4- غیر اللہ کیلئے ذبح کرنے کا حکم
سوال: غیر اللہ کیلئے ذبح کرنے کا کیا حکم ہے؟ مثال کے طور پر اولیاء کرام کی زیارت کرنے والوں کی طرف سے اولیاء کرام کیلئے ذبح کرنا اور ولی کیلئے نذر کے طور پر ذبح کرنا اور اس نذر کے گوشت کو قبریا قرار کے پاس رہنے والوں میں تقسیم کرنا وغیرہ.

خلاصہءفتوی:- جس نے غیر اللہ یا ولی یا کسی عرس میں ولی کی تعظیم کیلئے ذبح کیا تو وہ شرک اکبر کا مرتکب مشرک ہے.

فتوی اور تحقیق کی دائمی کمیٹی. 1/ 134

تبصرہ:
یہ فتوی بھی(مسلمانوں کو) کافر قرار دینے والوں فتوؤں میں سے ایک اور مسلمانوں کی اکثریت کے بارے میں سوء ظن پر مبنی فتوی ہے کیونکہ عام لوگ اولیاء کرام کیلئے جو نذر دیتے یا ذبح کرتے ہیں ان میں اکثریت کا مقصد اللہ تعالی کیلئے ذبح کرنا ہوتا ہے. اور اسکا ثواب اولیاء کرام کیلئے پیش کرنا ہے اور گوشت فقیروں کیلئے ہوتا ہے. اور یہی شرعی مفہوم انکے ذھنوں(نیتوں) میں ہوتا ہے لیکن کبھی وہ اپنی کوتا ہیوں یا سستیوں کی وجہ سے اپنی زبانوں سے اظہار نہیں کر سکتے-چنانچہ مفتی کو نہیں چاہیے کہ وہ اعمال کو انکے احتمال سے بڑھا کر بلاُ جواز مسلمانوں کو کفر تک پہنچائے.
علمی رد:
کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ غیر اللہ کی اس قدر تعظیم کرے کہ ذبح کے وقت اسکا نام لے چاہیے تو وہ اونچی آواز میں ہو یا نہ ہو جیسے کبھی کبھی مشرکین اپنے باطل معبودوں کے قرب کیلئے جانور ذبح کرتے وقت اونچی آواز میں انکا نام پکارتے تھے(چنانچہ اسکی حرمت پر) قرآن کریم کے صریح حکم وجہ سے اسکے عدم جواز پر اتفاق ہے. ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ﴾ (سورة المائدة 3). اور وہ(جانور) جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو.

مگر مسلمانوں کے مختلف ممالک میں عام لوگ جو جانور اولیاء کرام کے لئے ذبح کرتے ہیں اور وہ نذور جو انکی قبروں پر پیش کرتے ہیں، یقیناً اس کا مقصد عموماً ان کا ثواب اولیاء کرام کو پہنچانا ہوتا ہے- رہی بات، ذبیحہ کا گوشت اسکی قبر کے خدام اور اسکے اقارب یا فقراء میں تقسیم کرنے کی. تو اگر نذر ماننے وا لا ان میں سے کسی چیز کا ارادہ کرے یا مطلق رکھے. دونوں صورتیں درست ہیں اور اگر اسکا ارادہ میت کی ذات سے قرب ہو جیسا کہ بہت سے نا واقف کرتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہوتا ہے.([12])
فقیروں میں گوشت تقسیم کرنے کی غرض سے مویشیوں کو ذبح کرنا میت کی روح کیلئے صدقہ ہے. اور اسمیں کوئی ممانعت نہیں کیونکہ حدیث شریف میں والدین کی وفات کے بعد انکے ساتھ نیکی کا ذکر آیا ہے: رسولُ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنیوالے سے فرمایا: "الصدقة عليهما والدعاء لهما" کہ صدقہ ان دونوں کی جانب سے اور دعا ان دونوں(والدین) کیلئے ہے.
اولیاء کرام کی قبور کیلئے نذر کے حکم کے بارے میں ابن حجر الهيتمی سے سوال کیا گیا: (تو انہوں نے یہ جواب دیا) کہ ولی کیلئے نذر سے تو غالبًا اس ولی کی قبر کے خدام، اسکے اقارب

[12] حاشیہ الدسوقي 3/ 102. مسلمانوں کا ولی اللہ کیلئے ذبح کرنے کا مقصد اسے ثواب پہنچانا ہے.

اور اسکے فقراء کیلئے صدقہ دینا مراد ہوتا ہے اگر نذر ماننے والے کا مقصد یہی ہو یا اس نے کسی کا تعین نہ بھی کیا ہو تب بھی صحیح ہے- اور اگر ناذر کا مقصد میت سے تقرب حاصل کرنا ہے جیسا کہ اکثر لا علمی کی بناپر کرتے ہیں تویہ صحیح نہیں ([13]).

ڈاکٹر محمد فؤاد

5- آزادی فکر کی دعوت شرک ہے

سوال: ہم آزادی فکر کی دعوت کے بارے میں سنتے رہتے ہیں، یہ عقیدے کی آزادی کی دعوت ہے چنانچہ اسکا کیا حکم ہے؟

خلاصہ فتوی: جو اسکو جائز قرار دیتا ہو کہ انسان عقیدے میں آزاد ہے اور مذاہب میں سے جس مذہب پہ چاہے عقیدہ رکھے تو وہ بہت بڑا کافر ہے.

شیخ ابن عثیمین ۔ فتاوی العقیدۃ. 217- 218

تبصرہ:

آزادی فکر کے کئی ایک شرعی معانی ہیں مثال کے طور پر کسی کو کسی مخصوص عقیدے کے ماننے پر مجبور نہ کرنا، عقیدے کے مخالفین کے ساتھ رہنا اور زندگی بسر کرنا اور یہ معاملہ انکا کھانا کھانے اور انکے ساتھ شادی کرنا تک پہنچ جاتا ہے، لوگوں کو انکے عقیدے میں آزاد چھوڑنے کا مفہوم کسی طرح بھی کفر نہیں اور نہ ہی اسے پسند کرنا ہے. اور کسی بھی معمولی وجہ اور انکے افعال کے انتہائی دور کے احتمال کی بناپر انکی تکفیر پر اصرار کتنی عجیب بات ہے-

علمی رد:

یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ لوگ اپنی بشری طبیعت وفطرت کی بناء پر رائے، عقیدے اور برتاؤ میں مختلف ہوتے ہیں، انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی صحیح ہوتا ہے-

ارشاد باری تعالی ہے﴿وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾، ﴿إِلاَّ مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ القران هود (119/118).

ترجمہ: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا(مگر اس نے جبراً ایسا نہ کیا بلکہ سب کو مذہب کے اختیار کرنے میں آزادی دی) اور اب یہ لوگ

---

[13] الفتاوی الفقهية الكبرى- از- ابن حجر الهيتمی 4/ 284.

اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نذر دینے والے یا وقف کرنے والے کی نیت، اس جگہ لے لوگ، و ہا ں کی عمارت(درگاہ شریف) یا اسی کے کسی فائدے. یا اسی طرح کی دوسری صورتوں کیلئے ہو، اور کوئی اور چیز مقصود نہ ہو تو، اولیاء کرام اور علماء کے مقامات کیلئے نذر دینا یا وقف کرنا صحیح اور جائز ہے- اسکے بر عکس اگر اس نے وہاں پر مدفون(شخص) سے تقرب کا قصد کیا یا انکی جانب اس جگہ کو منسوب کیا تو اس صورت میں نذر نہیں ہوگی- علامہ اذرعی اور دیگر علماء کرام نے نذر کے سلسے میں شمع، موم بتی وغیرہ اور اسکے وقف کا بھی ذکر کیا ہے، (ابن حجر الهيتمی کہتے ہیں) کہ اس سے بھی وہی بات سامنے آتی ہے جو میں نے بیان کی ہے، اور حاصل کلام یہ ہوا کہ جس کسی نے نذر پیش کی یا کوئی چیز وقف کی جس کے غلے سے چراغ اور اس طرح کی ضرورت کی دوسری چیزیں خریدی جائیں تو یہ صحیح ہے خواہ یہ نذور ہی میں سے کیوں نہ ہو، جس سے نمازی یا سونے والے کو فائدہ ہو وگرنہ یہ صحیح نہیں، اسی طرح اس مقام کیلئے نذر باوقف سے علاقے کے رہنے والوں یا اس جگہ آینوالوں کیلئے روشنی کرنا ہو تو یہ پسندیدہ عمل ہے. اگر اس نے قبر کے باس روشنی کرنے کا ارادہ کیا اگرچہ اسکے ساتھ روشنی بھی مقصود ہو تو یہ صحیح نہیں. اسی طرح جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ اگر اس سے(نذر یا وقف) سے مراد جگہ یا قبریا اس ولتقرب حاصل کرنا ہو تو یہ نذر اور وقف نہیں ہو گا کیونکہ ان لوگوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ ان جگہوں کی اپنی خصوصیات ہیں اور انکے خیال میں یہاں پیش کی جانے والی نذر سے مصیبتین ٹلتی ہیں

فتاوی الفقهه لابن حجرالهيتمی 4/ 289.

اسی طرح تحفة المحتاج 6/ 316. نهاية المحتاج 5/ 425.

ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے . سوائے اس شخص کے جس پر آپکا رب رحم فرمائے اور اس لئے اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے.

اللہ رب العزت نے انسان کواپنی طرف سے ھدایت عطا فرمائی، انہیں بتایا کہ اسی میں ہی بھلائی ہے اور اسکی طرف انہیں بلایا اور اسی میں انکو شر سے آگاہ کیا اور انہیں اس سے متنبہ کیا، اور جب حضرت آدم علیہ السلام اور انکے ساتھ زمین پر اتر نے والے لوگوں سے فرمایا: ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى﴾ (طه 123).

ترجمہ: پھر جب میری جانب سے تمھارے پاس کوئی ھدایت(وحی) آجائے سو جو شخص میری ھدایت کی پیروی کرے تو وہ نہ(دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ(آخرت میں) بد نصیب ہوگا.

اللہ تعالی نے لوگوں کو اس حقیقت سے اگاہ کرنے کیلئے انکی جانب یکے بعد دیگرے رسول بھیجے چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے انکار کیا یہاں تک خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیادی عقائد کی ان(سابقہ انبیاء کرام) کی دعوت کی تصدیق فرمائی. دعوت اسلام کسی زمان ومکان کیلئے خاص نہیں بلکہ عام ہے. چنانچہ یہ تمام لوگوں کیلئے ہے خواہ ان میں وہ ہو جو اپنے سابقہ مذھب پر ہے اور دوسرے وہ ہیں جنکا کوئی دین نہیں. اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (آل عمران 85).

ترجمہ: جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا، عقیدے میں کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں ہے کیونکہ عقائد اطمینان سے دل میں راسخ ہوتے ہیں اور رسول کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکھف 29).

اور فرما دیجئیے کہ(یہ) حق تمھارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے ایمان لے اور جو چاہے انکار کردے، سورہ بقرہ میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرة 256).

ترجمہ: دین میں کوئی زبردستی نہیں بے شک ھدایت، گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہوچکی ہے.

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے تعامل فرمایا اور ان سے کھانا بطور قرض لیا، انہیں اسلام کی دعوت دی لیکن انہیں قبول اسلام پر مجبور نہیں کیا. اور انہیں آزادی دی کہ خواہ ایمان لے آئیں یا نہ چناچہ ان میں سے بعض ایمان لے آئے اور بعض نے کفر کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کیلئے پسند نہیں فرمایا کہ یہودیوں پر جار حیت کرین جنہوں نے حضرت موسی علیہ السلام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دی اور انبیاء کرام پر آپکی فضیلت کا انکار کیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنے کو روکنے کیلئے ایسا کیا.

اور حضرت امام مسلم نے ایک حدیث شریف روایت کی ہے :ا لأنبیاء إخوة من علاّت ،أمهاتهم شتی ودینهم واحد ،«أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ أَبْنَاءُ عَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَلَيْسَ بَيْنَنَا نَبِيٌّ»

اسکا مفھوم یہ ہیکہ انبیاء کرام ایک باپ سے بھائی بھائی ہیں. انکی مائیں مختلف اور دین ایک ہے. میں تمام لوگوں سے عیسی ابن مریم کے زیادہ قریب ہوں کیونکہ میرے اور انکے درمیان کوئی نبی نہیں.

حضرت عمر نے ایک نابینا یہودی کو مانگتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ نے اس کیلئے بیت المال سے اتنا مال مقرر کیا جو اسکے لئے کافی ہو. اور اپنے گورنروں کو غریب ذمیوں کی مدد کرنے کی تعلیمات جاری فرمائیں. غیر مسلموں کے ساتھ یہ معاملہ اس حقیقت کے پیش نظر ہے کہ اسلام امن کا دین ہے اور وہ کسی بھی امن پسند کے خلاف جنگ کا آغاز نہیں کرتا.

ایک اورمقام پرارشاد باری ہے: ﴿وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ﴾ (ا لأنفال 61).

ترجمہ: اور اگر وہ(کفار) صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی اسکی طرف مائل ہوجائیں اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھیں.

اسلام نے یہود ونصاری، اهل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے اور انکے ذبیحہ کو کھانے کی اجازت دی ہے اور مسلمان شوھر کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنی غیر مسلمہ بیوی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرے اور اسے (مسلمان شوھر) کو زندگی بسر کرنے کی اجازت دی ہے اور وہ(اسکی بیوی) اپنے کفر ہی پر قائم ہے.

چنانچہ اس طرح لوگوں کو آزاد چھوڑنے سے مراد پر یہ نہیں کہ وہ عقیدہ اسلام کے خلاف جس حالت پر ہیں اسے قبول کرلیا جائے بلکہ اسکا مفھوم یہ ہے کہ انہیں دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے-

ڈاکٹر محمود فؤاد

6- سورج کے گرد زمین کی گردش
سوال: کیا سورج کے گرد زمین کی گردش کا نظریہ صحیح ہے ؟ اور علم جغرافیہ جسکے مطابق زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے اسکی تدریس کے فرائض جس شخص کے سپرد کئے جائیں وہ کیا کہے ؟

خلاصہ فتوی: شیخ ابن عثیمین نے کہا: کہ مضمون جغرافیہ پڑھانے والے استاد سے ہم کہیں گے کہ وہ طلباء کو یہ بتائے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں اس ظاہری صورت کو بیان کرتے ہیں رات اور دن دونوں ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں جبکہ ایسا زمین کے گرد سورج کی گردش سے ہوتا ہے نہ کہ اسکے بر عکس-
کتاب مجموع فتاوی ورسائل- ابن عثیمین1/ 39

اور شیخ ابن بازنے کہا:
جس شخص نے یہ کہا کہ سورج متحرک نہیں بلکہ ثابت ہے تو اس سے توبہ کا مطالبہ کئے جانے کے بعد. اسکا خون بھی رائیگان گیا، کیونکہ سورج کی حرکت کا انکار اللہ تعالی اسکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تکذیب ہے-
شیخ ابن باز ویب سائیٹز([14])

تبصرہ:
ایسے امور جن میں وحی کی قطعی نص نہ ہو تو ان میں علم فلکیات اور اس سے متعلقہ دیگر علوم کے ماہر علماء سے رجوع کیا جاتا ہے. (جبکہ ایسے موضوعات پر) اس قسم کے فتوے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کو بہت ہی غلط انداز میں پیش کرتے ہیں.
علمی رد:
قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں ایسی کوئی بات نہیں جو زمین کی حرکت اور اسکی گردش کی نفی کرتی ہو یا اسکے ساکن اور ایک جگہ بر قرار رہنے کو ثابت کرتی ہو.
بعض آیات مبارکہ کے بارے میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ اجمالی طور پر زمین کی حرکت اور اسکی گردش پر دلالت کرتی ہیں اور مسلم اور غیر مسلم ماہرین فلکیات نے مسلسل یکے بعد دیگرے یہی بتایا ہے کہ زمین گردش میں ہے اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے دیگر سیاروں کی مانند حرکت کرتی ہے، اگر آج أپ اس موضوع پر کسی کتاب کا مطالعہ کریں تو آپ اسمیں اسی حقیقت کو پائیں گے.
ڈاکٹرحماد عبیدی"الكون من الذرة إلى المجرّة"([15]) کے زیرعنوان اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں: زمین ھمارے ساتھ فضا میں بحری جہاز کی مانند حرکت پذیر ہے اور سورج کے گرد اپنی گردش میں تیزی سے ہلتی اور جھٹکے کھاتے ہوئے کبھی ایک طرف. کبھی دوسری طرف مائل ہوتی ہوئی حرکت کرتی ہے. اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتدریج پیچھے آرہی ہے اور یہ گھڑی کی سوئیوں کے بر عکس 23 کلومیٹر في سکیڈ کی رفتار سے(اس طرح) گھومتی ہے گویا کہ وہ بر اعظم پار کرنے والا میزائل ہے، اسکی اس حیرت انگیز رفتار کے باوجود ھم کوئی چیز محسوس نہیں کرتے کیونکہ زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ھمیں اسکی سطح پر اس طرح

14 http://www.binbaz.org.sa/mat/8570

15 کائنات ذرے سے کہکشان تک

مضبوطی سے قائم رکھتا ہے گویا کہ هم اسکی با لائی تہہ کا حصہ ہیں- اور یہ اللہ تعالی اور اسکی قدرت کی عجیب نشانیوں میں سے ہے
سورج کے گرد زمین کی اسی گردش سے چار موسم پیدا ہوتے ہیں اور اسی شمسی سال میں لوگوں کی تمام تر سرگرمیوں کا حساب لگایا جاتا ہے- علاوہ ازین زمین کی ایک دوسری گردش بھی ہے. جو سورج کے گرد زمین کی اصل گردش کے ساتھ ہی مکمل ہوتی ہے اور یہ گردش مغرب سے مشرق کی جانب گھڑی کی سوئیوں کے مطابق 1609 کلو میٹر في گھنٹے کی رفتار سے اسکے اپنے ہی گر ہوتی ہے جو کہ چوبیس گھنٹے میں پوری ہوتی ہے. اور یہی(گردش) رات اور دن کے آنے کا موجب بنتی ہے-
عہد حاضر کے مفسّرین نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر وهبہ زحیلی اپنی کتاب التّفسیر المنیر میں لکھتے ہیں کہ سورج، چاند اور زمین ہر ایک آسمان میں اپنے مدار میں ایسے گردش اور حرکت کر رہے ہیں جیسے مچھلی پانی میں حرکت کرتی ہے. چنانچہ سورج 93 ملین میل نصف قطر کے دائرے میں حرکت کرتا ہے اور اسکا چکر ایک سال میں پورا ہوتا ہے چاند زمین کے گرد، جوبیس ہزار میل نصف قطر کے دائرے میں ہرماہ چکر لگاتا ہے اور زمین سورج کے گرد ایک سال میں، اور اپنے گرد رات اور دن میں چکر پورا کرتی ہے.
ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ زمین کروی(گیند کی مانند) ہے اور سورج کے مد مقابل اپنے ہی گرد گھومتی ہے. چنانچہ زمین کی کروی سطح جو سورج کے سامنے ہوتی ہے اس پر سورج کی شعائین پڑتی ہیں اور وہاں دن ہوتا ہے اور یہ حصہ ایک جگہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ زمین گھومتی رہتی ہے تو اسکی حرکت سے وہ جگہ جہاں دن تھا وہاں رات شروع ہونے لگتی ہے.
اور زمین کی حرکت اور اسکی گردش عقلی اعتبار سے نہ لازم ہے اور نہ ہی مستحیل ہے بلکہ جائز ہے اور اگر مسلم اورغیر مسلم ماہرین(فلکیات) اس حقیقت کو ثابت کر دیں اور شریعت میں اسکی مخالفت نہ ہو تو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے اور ہمارا پختہ یقین ہیکہ جو وحی سے ثابت ہے وہ ثابت شدہ سائنسی حقیقت کے خلاف نہیں. چنانچہ ایسے امور جن میں کوئی شرعی قطعی نص نہیں ان میں ماہرین فلکیات کی رائے پر انحصار کیا جاتا ہے

سورہ الفرقان میں اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ﴿فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا﴾ (آیت 59) ترجمہ: پس اسکے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ لو.

سورہ النحل میں ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَاسْأَلُواْ أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ﴾ (آیت43)، ترجمہ: سو تم اهل ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تمھیں خود(کچھ) معلوم نہ ہو.
یہاں جو بات پیش نظر رکھنی چاہیے وہ یہ کہ اس مسئلے پر حکم شرعی مرتب نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر کوئی تکلیفی عمل مبنی ہوتا ہے چنانچہ ماہرین فلکیات کو اس میں تحقیق کرنی چاہیے.([16]) اللہ أعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمود فؤاد

[16] فتوی مرکز زیرنگرانی ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ. فتوی نمبر 56931 حرکت زمین اور اسکی گردش تاریخ فتوی. 4 ذو القعدہ 1425ھ

7- عقیدے میں لاعلمی(جہالت) کوئی عذر نہیں
سوال: عقیدے میں لاعلمی کے عذر سے متعلق حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا اور کیا آخرت میں لاعلمی یا جہالت کو عذر کے طور پر قبول کیا جائے گا.

خلاصہ فتوی: جہل ،لاعلمی عقیدے میں عذر نہیں ہوتا، جو کوئی شخص لاعلمی کی بناپر کفر کر بیٹھے تو اسکی لاعلمی کی وجہ سے اسکی معذرت قبول نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں ہوگا
شیخ ابن باز- مجموع فتاوی ومقا لات متنوع 9/ 398

تبصرہ:
یہ فتوی ان جملہ فتوؤں کے متشدّد، سخت منہج کے مطابق ہے جسکا مقصد بظاھر ہر طریقے سے مسلمانوں کا محاصرہ کرنا ہے اور جس قدر ممکن ہو سکے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اسلام سے خارج کرنا ہے اسلام اور ہر دوسرے مذھب میں جہلاء پائے جاتے ہیں انہیں وعظ ونصیحت کرنا اور تعلیم دینا اور انکے ساتھ نرمی سے پیش آنا لازم ہے، انہیں اسلام سے خارج کیا جائے اور نہ ہی کافر کہا جائے-
علمی رد:
اهل سنت والجماعت کے مطابق اگر کوئی مسلمان لاعلمی کی بناپر کوئی کافرانہ عمل کرے تو اسکی یہ لاعلمی اس پر کفر کا حکم لگانے سے مانع ہوتی ہے اور پھر یہ اس کےعذاب میں بھی مانع ہوگی جو اللہ تعالی نے روز قیامت کافروں کیلئے تیار کیا ہے کہ وہ ہمیشہ گمرا ہوں اور جن پر اللہ تعالی کا غضب ہوا ہے انکے ساتھ نار جہنم میں رہےاھل سنت کے د لائل مندرجہ ذیل ہیں:
او لاً: اللہ رب العزت نے سورہ مائدہ میں حواریوں کی خطاؤں اور انکی اپنے رب کے بارے میں یہ لاعلمی کہ وہ(ذات عالی) ہر چیز پر قادر ہے اور اسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام کی نبوت کی سچائی میں انکے شکوک کا قصہ بیان فرمایا ہے علاوہ ازیں اللہ تعالی نے انکے بارے میں فرمایا: ﴿إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ[17]﴾ (المائدة 112).
ترجمہ: اور(یہ بھی یاد کر) جب حواریوں نے کہا اے عیسی ابن مریم کیا تمھارا رب ایسا کر سکتا ہے کہ ھم پر آسمان سے (کھانے کا) خوان اتار دے-
چنانچہ باوجودیکہ اسمیں شک کرنا کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے کفر ہے لیکن اس سلسلے میں حواریوں کی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے انکی تکفیر نہیں کی اور اور انکا یہ عذر شمار کیا گیا.

ثانیًا: نبی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے حضرت موسی علیہ سے کہا تھا کہ: ﴿اجْعَلْ لَنَا إِلَهاً كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ[18]﴾ (ا لأعراف الآية 138).
اے موسی علیہ السلام ھمارے لئے بھی ایسا(ہی) معبود بنادیں جیسے انکے معبود ہیں. موسی علیہ السلام نے کہا تم یقینًا بڑے جاہل لوگ ہو-"

[17] المائدة:113 .

[18] ا لأعراف:138.

حضرت موسی سے انکا یہ کہنا اور سوال کرنا کہ انکے لئے اللہ تعالی کے ساتھ کوئی معبود بنادے. واضح کفر ہے جسمیں کوئی شک نہیں لیکن انکی لاعلمی کے عذر کی وجہ سے انکی تکفیر نہیں کی گئی.

ثالثًا: امام ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ حضرت معاذ جب شام سے تشریف لائے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا. تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما هذا يامعاذ". معاذ یہ کیا ہے، تو آپ نے عرض کی یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شام سے آیا ہوں چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے اساقف([19]) اور بطرقوں کو سجد کرتے ہیں تو میرے جی میں بھی آیا کہ ہم بھی آپکے لئے ایسا کریں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فلا تفعلوا فإني لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لغير الله لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها"([20]) ترجمہ: "بس تم ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو اللہ تعالی کےعلاوہ سجدے کا حکم دیتا تو یقینًا عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوھر کو سجدہ کرے".

یہ ایک معروف حقیقت ھیکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا کفر ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ باور کرایا کہ سجدہ کرنا عبادت ہے اور یہ اللہ تعالی کے سوا کسی اور کیلئے جائز نہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کفر وارتداد کا حکم نہیں لگایا-

رأبعًا: بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ سوار ہوئے اور وہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے تھے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا(اور فرمایا): «أَلاَ إِنّ اللّهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّهِ، وَإِلاّ فَلْيَصْمُتْ» ([21]).

کیا اللہ تعالی نے تمھیں اپنے أبا وأجداد کی قسم کھانے سے منع نہیں فرمایا پس جو کوئی قسم کھائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالی کی قسم کھائے وگرنہ چپ رہے.

اللہ رب العزت کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا شرک ہے جیسا کہ اس حدیث مبارکہ میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من حلف بغير الله فقد أشرك"([22]) جس نے اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی تو اس نے شرک کیا." لیکن حضرت عمر کو اس وقت علم نہیں تھا کہ اللہ تعالی کے علاوہ کسی اورکی قسم کھانا شرک ہے اسی حقیقت کی بناپر(انکی لاعلمی کو) عذر شمار کیا گیا.

یہ اور انکے علاوہ اور بہت سے د لائل ہیں جن سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ مسلمان سے لاعلمی کی بناپر کفر سرزد ہو تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا ہے اور نہ ہی اسے کافر کہا جاتا ہے یہاں تک کہ اسکو بتا کر اس پر حجت قائم کردی جائے. اور اگر لاعلمی کی معتبر وجوہات اور اسباب ہوں جنھیں دور نہیں کیا جا سکتا تو اس صورت میں اسکی لاعلمی بطورعذر قبول کی جاتی ہے. تو نتیجةً اس پر نہ تو کفر کا حکم لگایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کیلئے وعید اور عذاب ہے.

اور یہ شیخ ابن عثیمین کی رائے ہے:

---

[19] عیسائی پادریوں کا ایک مرتبہ ہے.
[20] ابن ماجہ. 1926.
[21] البخاری. 6108.
[22] سفن ابی داود. 3253.

ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی کافر اسلام قبول کرے اسکے بعد اس سے لاعلمی کی وجہ سے اسلام کے منافی امور میں کوئی امر سرزد ہوجائے تو اسکے ساتھ کیسے تعامل کیا جائے؟ کیا وہ اپنے اسلام کی تجدید کرے؟
(انہوں نے اسکا) جواب دیا. تمام تعریفیں اللہ تعالی کیلئے ہیں. اسکے ساتھ احسن طریقے سے تعامل کیا جائے اور اسے بتایا جائے کہ یہ اسلام کے منافی امور ہیں- اور اسکے اسلام کی تجدید کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سرزد ہوئے ان نواقض سے واقف نہیں تھا ارشاد باری تعالی ہے. ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا) (الإسراء 15)، ترجمہ: اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ ہم(اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج لیں.
ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ﴾ (القصص 49)، ترجمہ: اورہم بستیوں کو ھلاك کرنے والے نہیں ہیں مگر اس حال میں کہ وہاں کے مکین ظالم ہوں. اور جاہل ظالم نہیں ہوتا کیونکہ اس نے کسی گناہ پر انحصار نہیں کیا بالخصوص وہ شخص جو نو مسلم ہے اور اسے مشرف باسلام ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا. اللہ أعلم بالصواب.
ڈاکٹر محمد فؤاد

8- اسلام کی دعوت پہنچنے سے پہلے انتقال ہوجانا
سوال: اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جسکا انتقال ہوگیا اور اسے اسلام کی دعوت پہنچی ہی نہیں. اور اگر پہنچی ہے تو صحیح انداز سے نہیں.

خلاصہ فتوی: جس شخص کو دعوت(اسلام) نہیں پہنچی تو اسکا حکم اھل فترہ کا ہے. روز قیامت اسکا فیصلہ کیا جائے گا اور جس شخص کو غلط انداز پر اسلام کی دعوت پہنچی ہے تو اسکے لئے کوئی عذر نہیں. اسے چاہیے کہ وہ صحیح بات کو دریافت کرے.
الشیخ ابن جبرین، فتاوی واحکام،ص 79- 80

تبصرہ:
یہ فتوی بھی ان تمام فتوؤں کی طرح تشدّ د کا حامل ہے.
محقق علماء کرام نے دعوت کے لازم ہونے کیلئے یہ شرط لگائی کہ جسے دعوت پہنچے تو یہ صحیح ہو اسے بگاڑ کر پیش نہ کیا گیا ہو اور اگر اسے دعوت غلط طریقے سے پہنچی ہے تو وہ اسلام قبول نہ کرنے میں معذور ہے.
علمی رد:
ھمارے آج کے دور میں کسی کو دعوت نہ پہنچی ہو تو یہ غاروں، جنگلوں اور دور دراز واقع جزائر کی مثال ہے جو اپنے اطراف کی دنیا میں رابطوں اور وسائل سے نا واقف ہیں اور اس زمانے میں انکی تعداد بہت ہی کم ہے جبکہ آجکل سلکی و لا سلکی اور دیگر وسائل اتصا لات بہت بڑھ چکے ہیں. اسفار، دنیا کے مختلف علاقوں میں ان وسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کیلئے مقابلوں میں اضافہ ہوچکا ہے-
جس شخص نے سنا کہ ایک رسول اسلام نام مذہب لیکر آئے ہیں تو اس پر واجب ہو گیا کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہو تو اسکی تحقیق کرے- اور اگر اس نےنہیں سنا یا سنا اور تحقیق نہیں کر سکا تو وہ علماء کرام کی رائے کے مطابق معذور ہے.

دعوت کے لازم ہونے کیلئے علماء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ جنکو دعوت پہنچے تو وہ صحیح طریقے سے پہنچے غلط صورت میں نہ پہنچے، اگر غلط صورت میں پہنچے تو ایمان نہ لانے میں وہ معذور ہیں.
اور اسے امام غزالی نے اپنی کتاب"فیصل التفرقه" میں بیان کیا ہیکہ انکے زمانے میں اکثر رومی اور ترکی عیسائی صرف دعوت کے نہ پہنچے کی وجہ سے نجات پانے والوں میں سے ہیں- انہوں نے مزید کہا کہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ لوگ جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت غیر صحیح صورت میں پہنچی ہے اور انکے خاندان والوں نے بچپن ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غلط اور بے بنیاد باتیں بتائیں وہ بھی میرے نزدیک پہلی قسم کی طرح ہیں. یعنی ناجی ہیں.
اور وہ تمام اقوام جنھوں نے اپنے تواتر علم کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور صفات آپکے عقل کو خیرہ کرنے والے معجزات جن میں سر فہرست قرآن کریم ہے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاذ اللہ تکذیب کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں غور نہیں کیا تو یہ کافر ہیں.(اھ ملخص)
اس بناپر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسے اسلام کی دعوت سرے سے پہنچی ہی نہیں یا غلط طریقے سے پہنچی یا صحیح طور پر دعوت پہنچی اور اس نے تلاش حق میں کوتا ہی نہیں کی تو وہ معذور ہے. یعنی اسکے لئے امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا([23]).
ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ کی زیرنگرانی فتوی مرکز(کی تحقیق کے مطابق):
کافر وہ شخص ہے جسکا انتقال اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر ہو جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے جس نے اسلام کے بارے میں بالکل نہیں سنا. یا جنہیں اسلام کی دعوت غلط انداز اور غیر صحیح طریقے سے پہنچی ہو.(انکے بارے میں) صحیح بات تویہ ہیکہ روز قیامت انکا امتحان لیا جائے گا.
جیسا کہ فتوی نمبر 39860، 42857، 56323، 3191، 48406، میں تفصیل سے اسکا بیان آچکا ہے.
شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کہا: انبیاء کرام کے درمیانی زمانوں اور جگہوں میں لوگوں کو تھوڑے اور ضعیف ایمان پر بھی ثواب دیا جائیگا. اور اللہ تعالی اس شخص کی مغفرت فرماتا ہے جس پر حجت قائم نہ ہوئی ہو. اور اسکو معاف نہیں فرماتا جس پر حجت قائم ہوئی ہو.

جیسا کہ مشہور حدیث مبارکہ میں ہے.
لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جسمیں وہ نماز، روزے، حج، اور عمرے سے. صرف بڑی عمر کے اشخاص اور بوڑھے ہی واقف ہونگے اور وہ کہیں گے ھم نے اپنے اباء واجداد کو پایا جو یہ کہتے ہیں لا الہ الا اللہ.
چنانچہ حذیفہ بن یمان سے کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ کہنے سے انکو کیا فائدہ حاصل ہوگا تو آپ نے فرمایا کہ یہ انہیں عذاب سے نجات د لائے گا.([24]).
واللہ أعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمد فؤاد

[23] فتاوی دار الافتاء المصریہ. الموضوع(31) المفتی فضیلة شیخ عطیہ صقر مایو 1997.
[24] فتوی مرکز زیرنگرانی ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ. فتوی نمبر 59524. کافر ہمیشہ جہنمی تاریخ فتوی 21 محرم 1426ھ.

9- مشرکین کے بچوں کا حکم

سوال: مشرکین کے بچوں کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا.

خلاصہ فتوی : مشرکین کے بچوں کا روز قیامت امتحان لیا جائے گا، تو جو اطاعت کریگا وہ اہل جنت میں ہوگا اور جو نا فرمانی کر یگا وہ دوزخی ہوگا.

اللجنة الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 3/ 365

تبصرہ:

یہ فتوی کہ بچوں کا امتحان لیا جائے گا اور انہیں جہنم کا عذاب دیا جائے گا اسلامی شریعت رحیمہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی عقل سلیم ایسی بات کہتی ہے- اگر کسی عاقل کو اس وجہ سے عذاب نہیں دیا جاتا کہ اس تک دعوت اسلام نہیں پہنچی. جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے.

تو ایک غیر عاقل کا کس طرح امتحان لیا جائے گا اور کس طرح اس شریعت جو کہ تمام جہانوں کیلئے سراسر رحمت ہے کے مطابق اسے عذاب دیا جائیگا.

علمی رد:

آخرت کے حا لات امور غیب سے ہیں اور اسے اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ رسول بھیج کر بعض مقدس ہستیوں کو اس لئے علم غیب سے مطلع فرماتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اسکے بارے میں خبر دیں.

اور بچے جو بالغ ہونے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں- اور بلوغت انکے والدین کے افضل دین کی اتباع میں مکلف ہونے کی حد ہے اس وجہ سے مسلمانوں کی او لاد کا انجام جنت ہے اس بارے میں کئی صحیح احادیث ہیں انہی میں سے امام مسلم سے مروی حدیث مبارکہ ہے کہ.

بچے روز قیامت اپنے والدین کی شفاعت کریں گے چنانچہ اللہ تعالی ان سے فرمائے گا: "ادخلوا الجنة انتم وأباؤكم" ترجمہ: "تم اور تمھارے والدین جنت میں داخل ہو جاؤ".

اور وہ جنت میں آزاد ہونگے جہاں چاہیں گے گھومیں پھریں گے، بعض احادیث میں انہیں دعا میص(مددگار) کہا گیا ہے. اور بعض مفسرین اللہ رب العزت کے اس قول کو اسی پر محمول کیا ہے جس میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ﴾ (الرعد 23)، ترجمہ: (جہاں) سدا بہار باغات ہیں ان میں وہ لوگ داخل ہونگے اور انکے اباؤاجداد اور انکی بیویوں اور انکی او لاد میں سے جو بھی نیکو کار ہوگا.

ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (الطور 21)، ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور انکی او لاد نے ایمان میں انکی پیروی کی ھم انکی او لاد کو بھی درجات جنت میں انکے ساتھ ملا دیں گے.

جہاں تک مشرکین کے بچوں کا تعلق ہے تو یہ اپنے والدین کے ساتھ دوزخ میں نہیں جائیں گے کیونکہ وہ مکلّف نہیں کہ انکا معاقبہ کیا جائے وہ فطرت پر فوت ہوئے ہیں چنانچہ اگر اللہ رب العزت نے چاہا تو انکے لئے جنت ہے.

اور اسکی دلیل امام بخاری کی روایت کر یہ حدیث مبارکہ ہے.

حضرت سمرة بن جندب کو خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی. جس میں نے انہوں نے ایک باغ دیکھا جس میں ایک مرد کے اطراف میں بہت سے بچے ہیں اور یہ حضرت ابراھیم علیہ السلام ہیں. جو دین فطرت پر پیدا ہونے والے ہر بچے کی نگرانی کرتے

ہیں. تو بعض صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کی اولاد بھی؟
تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. "واولاد المشركين" مشرکین کي اولاد بھی یعنی وہ بھی جنت میں داخل ہوگی.
امام النووی نے فرمایا کہ یہی اختیار کر دہ صحیح مذہب ہے جس پر اکثر محققین عمل پیرا رہے ہیں. جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (الإسراء 15).
ترجمہ: اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم(اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج دیں.
اور جب کسی عقلمند کو اس وجہ سے عذاب نہیں دیا جاتا کہ اس تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی تو پھر غیر عاقل کو عذاب نہ دنیا اولی ہے ([25]).
حضرت امام احمد نے حضرت اسود بن سریع سے ایک حدیث شریف روایت کی ہے.
انہوں نے فرمایا کہ میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوے میں شرکت کی. میری کمر میں زخم آیا اس دن لوگ جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے چھوٹے بچوں کو بھی مار ڈالا.
چنانچہ اسکی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما بال أقوام جاوزهم القتل اليوم حتى قتلوا الذرّيّة" فقال رجل يا رسول الله انما هم اولاد المشركين. فقال صلی اللہ علیہ وسلم" ألا إن خياركم ابناء المشركين" ثم قال" ألا لا تقتلوا ذرية ألا لا تقتلوا ذرّيّةَ- قال- كل نسمة تولد على الفطرة حتى يعرب عنها لسانها فأبواها يهودانها وينصرانها" ترجمہ: اس قوم کے بارے میں کیا کہا جائے جو آج قتل میں تجاوز کر گئی یہانتک کہ انہوں نے بچوں کو بھی مار ڈالا. تو ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ مشرکین کی اولاد ہیں. چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. کیا تم میں سے بہترین، مشرکین کی اولاد نہیں. پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبر دار بچوں کو قتل نہ کرو، خبر دار بچوں کو قتل نہ کرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہانتک کہ اسکی زبان فطرت کا اظہار کرتی ہے. پس اسکے والدین اسے یہودی اور نصرانی بناتے ہیں. واللہ أعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمد فؤاد

---

[25] فتح الباری 92- باب ما قبل في اولاد المشركين، المجموع بلنووی 5/ 74، اور اس نے اور محققین نے کہا کہ وہ جنتی ہیں اور یہی مختار اور صحیح قول ہے. اور میں نے دلائل سے اسکی وضاحت کی ہے.
2 مسند ا لامام احمد. 15994.

10 - سلاسل طریقت
سوال: سلاسل طریقت (صوفیاء کرام کے سلسلوں) کي پیروي کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصۃ فتوی: متصوفین کے سلسلے بعد میں شروع کئے گئے ہیں (یعني بدعتي سلسلے ہیں) اور اهل اسلام کیلئے جائز نہیں کہ وہ بدعتي سلسلوں کي اتباع کریں-
شیخ ابن باز – مجلۃ البحوث شمارۃ 39-145-148

تبصرہ:
طریقت (صوفیاء کرام) کے سلسلے در حقیقت تربیتي مدارس ہیں اگر انکا طریقہ واسلوب دین کے مطابق ہو تو یہ مشروع (جائز) ہیں وگرنہ جائز نہیں، یہ تمام علماء کرام کي رائے ہے اور انہي میں ابن تیمیہ بھي ہین، اور کوئي بھي عالم دین تمام صوفیاء کرام پر گہر رہي یا بدعت کا حکم نہیں لگاتا، جیسا کہ اس فتوی میں دعوی کیا گیا ہے، بلکہ علماء کرام اسمیں فرق کرتے ہیں.
علمي رد:
طریقت کے سلسلے عمومي طور پر تربیتي مدارس ہیں اگر انکا اسلوب اور طریقہ مذهب، عقیدے اور شریعت کے مطابق ہو تو یہ جائز ہیں وگرنہ غیر مشروع ہیں اور اسے حکمت اور موعظت حسنہ (اچھي پند ونصیحت) سے انکي اصلاح کرنا واجب ہے.
ابن تیمیہ نے ایک بیان میں کہا کہ اهل تصوف میں سے کچھ علم دین اورمذهب کے ائمہ ہیں-([26]) اور باوجود اسکے اس میں صراط مستقیم پر قائم عارفین مشایخ ،صوفیاء کے قلبی اعمال کے بارے فرمودانت ہیں جو کتاب وسنت کے عین مطابق ہیں، اسکے علاوہ عبادات اور ادب سے متعلق بھی انکا کلام ہے جو کتاب وسنت کے مطابق ہے([27]).
اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ امت کے مشہور صوفیاء کرام جن کا امت میں ذکر خیر ہوتا ہے وہ اس قسم کي باتوں کو پسند نہیں فرماتے بلکہ ان سے روکتے ہیں([28]).
ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے کہ صوفیاء کے لئے وقف (مال یا جائیداد مخصوص کرنا) صحیح ہے، انہوں نے کہا: صوفیا کرام کیلئے وقف کرنا صحیح ہے، چنانچہ جو شخص محض مال جمع کرنے والا ہو اور پسندیدہ اخلاق کا مالک نہ ہو ، شرعی آداب سے عاری اور گھٹیا عادات اس پر غالب ہوں یا وہ فاسق ہو تو وہ (وقف میں سے) کسی چیز کا بھی مستحق نہیں ہوتا ہے-([29]).
اگر صوفیاء کے تمام سلسلے بدعتي ہوتے جیسا کہ اس فتوی میں کہا گیا ہے ، تو ائمہ کرام انکے لئے وقف صحیح قرار نہ دیتے.
اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ عقل صریح اور کشف صحیح والے مشائخ فقہ اور عبادتگزار جنکا امت ذکر خیر کرتی ہے ، یہی علم اور مذهب کے ائمہ ہیں اور وہ تمام ائمہ علم اور مذهب جنکا امت میں عام طور پر ذکر خیر ہوتا ہے یہی لوگ فقہ اور تصوف کی طرف منسوب ہیں-([30]).
ان عبارتوں میں یہ بیان ہیکہ اهل تصوف ہی علم اور دین کے ائمہ ہیں، اور امت میں انکا ذکر خیر کیا جاتا ہے یہ ابن تیمیہ کا کلام ہے جنکے بارے میں اکثر لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اهل تصوف کی مطلقا مخالفت کرتے ہیں.

[26] امام غزالی کي احیاء علوم الدین میں ہے.
[27] الفتاوی الکبری ج 5 – صہ 86.
[28] الفتاوی الکبری ابن تیمیہ 1/ 294.
[29] الفتاوی الکبری 5/ 425.
[30] الفتاوی الکبری 6/ 625.

ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز کے فتوے میں آیا ہے:
جب صحابۂ کرام اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیاوی امور انسانی زندگی میں داخل ہوگئے، کھانے پینے، لباس، اسی طرح کی دوسری اشیاء کی فراوانی ہوئی تو لوگوں کو اس دنیا میں زہد و تقوی اور ہر مشتبہ بات سے دور رہنے پر خلوص عبادت ،مجاھدہ نفس کی پر زور دعوت دی گئی، انہیں اچھے اخلاق سے مزین کیا گیا اسکے بعد ان عبادتگزار بندوں کو زاہد کا نام دیا گیا آگے چل کر انھي کو صوفیاء کا لقب دیا گیا انہی شخصیات میں سے حضرت ابو سلیمان دارانی، حضرت معروف کرخی ، حضرت فضیل بن عیاض ، حضرت سھل بن عبداللہ تستری اور حضرت جنید ہیں.
اوائل صوفیاء کرام نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی بلکہ انہوں نے اسی کی دعوت دی جسکی دعوت رسول کریم -صلی اللہ علیہ وسلم- اور آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- کے صحابہ کرام نے دی تھی- ایک طرف تو یہ بات ہے اور جہاں تک بعض علماء حدیث کی کسی سلسلۂ طریقت سے وابستگی کا تعلق ہے تو وہ تزکیہ نفس میں مشغول رہنے والے عبادتگزاروں اور زاہدوں کے طریقے پر ہیں، چنانچہ انکی تعریف کی جاتی ہے اور وہ لوگ جو کہ خرافات اور انحرافات کے راستے پر چلے وہ شرک اور بدعت میں ملوث ہوئے تو ان لوگوں کا کوئی عمل حجت نہیں ہے- ([31]). اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر محمد فؤاد

11- اللہ تعالی کے نازل کر دہ حکم علاوہ فیصلہ کرنا

سوال: اللہ رب العزت کی نازل کر وہ وحی کے بغیر فیصلہ کر نیکے حکم بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: اللہ تعالی کی نازل کر وہ وحی کے بغیر فیصلہ کرنا کفر ہے- اس سے انسان مذھب سے خارج ہو جاتا ہے.

شیخ فوزان ۔ عقیدہ التوحید 116

تبصرہ:
سود اور شراب جیسی حرام اشیاء کو حلال کرنے کے قوانین وضع کرنا بلا شبہ حرام ہے لیکن انکے وضع کرنے والے اور انکے مطابق فیصلہ کرنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا اور اسکی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدہ 44)، ترجمہ: اور جو شخص اللہ کے نازل کر وہ حکم کے مطابق فیصلہ (و حکومت) نہ کرے ، سو وہی لوگ کافر ہیں.
بجز اسکے کہ یہ اعتقاد ہو کہ اللہ رب العزت کا حکم (نعوذ باللہ) صحیح نہیں ہے اور قانون وضعی صحیح ہے.
ایسے قوانین پر عمل جائز نہیں اور اس برائي کو جائز طریقوں سے تبدیل کرنا انتھائی ضروری ہے اس طرح کہ اسلامی معاشرے میں کوئی فتنہ پیدانہ ہو ، اور یہ قول کہ حکم کو ترک کرنا مطلق کفر ہے تو اس سے ان معاشروں میں فتنے کا دروازہ مکمل طور پر کھل جاتا ہے.

[31] فتوی مرکز زیر نگرانی ڈاکٹر عبداللہ فقیہ ، ج 9 صہ 3735 ۔ فتوی نمبر 64733 تاریخ فتوی ۔ جمادی الثانی 1426ھ.

علمی رد:
اللہ رب العزت کی اتاری ہوئی وحی کے بغیر فیصلہ کرنا حکام اور قاضیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں وہ تمام لوگ آتے ہیں جو کسی بھی چیز کے بارے میں اللہ تعالی کے حکم علاوہ کوئی اور حکم لگاتے ہیں خواہ یہ فتوی ہو یا عدالتی فیصلہ وغیرہ جیسا کہ کوئی شخص شراب پیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حلال ہے ، سود کا لین دین کرتا ہے اور کہتا ہیکہ یہ حلال ہے. اسی طرح کے دیگر امور کا (حکم ہے).
اللہ تعالی کے حکم کا انکار اور اسکا مذاق اڑانا کفر ہے تطبیق یا کوتا ہی میں حد سے تجاوز کے ساتھ ساتھ مذاق یا انکار کرنا کفر تو نہیں بلکہ ظلم اور نا فرمانی ہوگی.
اور اس وجہ سے کسی ایسے فرد، یا جماعت یا ملک جو اللہ تعالی کی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو اسکے کفر میں جلد بازی صحیح نہیں ہے- کوئی بھی حکم یہ یقین کر لینے کے بعد ہی لگا جائے کہ اللہ کے حکم کو ترک کرنا انکار یا مذاق کی وجہ سے تھا- اور یہ پوشید امر ہے اور غالبا یہ بات صراحتا نہیں کہی جاتی ، اگر بات کسی بھی تاویل کے بغیر اسکا اظہار صراحتا کیا جائے تو کفر کا حکم لگانا جائز ہو جاتا ہے، اور اگر اس کا علم یقینی طور پر نہ ہو تو کفر کا حکم نہ لگانا واجب ہے.
حضور - صلی اللہ علیہ و سلم - کی حدیث مبارکہ ہے: " من قال لاخیہ یا کافر فقد باء بھا احدھما ان کان کما قال و الا رجعت علیہ". (اسے امام مسلم نے متشابہ عبارتوں سے روایت کیا ہے)، ترجمہ: جس نے اپنے بھائی سے کہا : اے کافر تو اس نے اس سے دو میں سے ایک کو پایا یا تو وہ ویسا تھا جسا کہ اس نے کہا یا پھر یہ اسی پر لوٹ آئی (یعنی وہ خود ایسا ہے).
امام فخر الدین رازی (جنکا انتقال 606 ھ میں ہوا) نے حضرت عکرمہ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ کفر کا حکم جھٹلانے اور انکار کی صورت میں لگایا جائے.
اور اللہ تعالی کے حکم پر ایمان رکھے کے باوجود اسکی مخالفت کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالی کے حق میں کمی کفر اور نفس کے حق میں کمی ظلم ہے: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدہ44)، ترجمہ: اور جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی وحی سے فیصلہ نہیں کیا تو وہ لوگ ہی کافرہیں.
﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ (45)، ترجمہ: اور جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی وحی سے فیصلہ نہیں کیا تو وہ لوگ ہی ظالم ہیں.
﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (المائدہ 47)، ترجمہ: اور جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی وحی سے فیصلہ نہیں کیا تو وہ لوگ ہیفاسق ہیں.
امام بیضاوی (جنکا انتقال 685 ھ میں ہوا) نے اس آیات کریمہ کی تفسیر میںکہا: کہ (اللہ تعالی نے جو نازل کیا ہے) اسکے انکار کی وجہ سے انکا کفر ہے اور اسکے خلاف فیصلہ کرنا انکا ظلم ہے اور اس سے تجاوز کرنا انکا فسق ہے.
اور زمخشری متوفی 528 ھ نے کہا : جس نے اللہ کے حکم کا انکار کیا اس نے کفر کیا اور جس نے اسکے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ نا فرمان ظالم ہے.
اور الوسی متوفی 1270 ھ نے کہا : کہ غالبا مختلف اعتبار سے انکے تین اوصاف بیان کئے گئے ہیں -
چنانچہ انکے انکار کی وجہ سے انھیں کافر بتایا گیا ، اور خلاف محل حکم لگانے کی وجہ سے انہیں ظالم کہا گیا ، اور حق سے انکے تجاوز کرنے پر انہیں فاسق کہا.

علامہ پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ بن بیھ ، کہتے ہیں کہ:
جہاں تک تکفیر کا تعلق ہے تو یہ حکم قطعی نہیں ، بجز اسکے کہ ان کے فیصلوں کا مقصد شریعت کی تنقیص یا اسکی اھمیت کو کم کرنا ہو ۔ کیونکہ قوانین وضع کرنے والے کہتے ہیں کہ شریعت نا قابل عمل ہے ۔
اگر قوانین وضع کرنے والے یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ شریعت ہی حق اور اسکے علاوہ دوسری باتیں غلط ہیں (تو اس حالت میں کفر نہیں) کیونکہ محض قوانین کا بنانا کہیں بھی کفر نہیں ہے ، قوانین کی غلطی کی وجہ بنانے والوں کی لا علمی ، جہالت یا پیروی ہو سکتی ہے اس وجہ سے حضرت ابن عباس اللہ تعالی کے اس ارشاد: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدہ 44)، ترجمہ: اور جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی وحی سے فیصلہ نہیں کیا تو وہ لوگ ہسکافرہیں.
انہوں نے کہا کفر کے بغیر کفر اور فسق کے بغیر فسق ہے : ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (المائدہ 47)، ترجمہ: اور جس نے اللہ کی نازل کی ہوئی وحی سے فیصلہ نہیں کیا تو وہ لوگ ہسفاسق ہیں.
اسکا معنی یہ ہیکہ وہ مذہب سے خارج نہیں ہوگا،اور بہت سے لوگوں کے اقوال کی بناپر ھم بھی یہی کہتے ہیں.اور اس سلسلے میں شیخ ا لاسلام تقی الدین بن تیمیہ کا تذکرہ کرتے ہیں، اور زیادہ غالب خیال یہی ہے کہ یہاں کفر مذھب سے خارج کرنے وا لا کفر نہیں اور یہ بات گذشتہ صدی کے بعض مفتیوں اور مشائخ کی آراء کے خلاف ہے جنہوں نے یہ فتوی دیا تھا کہ محض عمل ہی کفر ہے ۔ اور ھم نے اس امر پر ایک طویل تحقیقی مقالےمیں بحث کی ہے جسکا عنوان ہے۔ (التکفیر بالحکم ما انزل اللہ) اللہ رب العزت کی اتاری ہوئی وحی کے بغیر فیصلہ کرنے سے تکفیر. چنانچہ عصر حاضر کی فقھی تحقیقات کے رسالے میں اسے دیکھیں (مجلہ بحوث الفقھیہ المعاصرہ).
علاوہ ازیں تکفیر کے فتووں کے اجراء سے ایسی جنگیں اور فتنے برپا ہوتے ہیں جو نہ ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے جان چھڑائی جا سکتی ہے اس سے بہتر تویہ ہیکہ لوگوں میں شریعت مطہرہ کی اھمیت کا شعور پیدا کیا جائے اور انہیں اس سے متنبہ اور شریعت محمدیہ کے اعلی فوائد اور مقاصد سے اگاہ کیا جائے ۔ کیونکہ اکثر اسلامی ممالک غیر مسلموں کی نو آبادیات رہے ہیں۔ انکے قوانین انہیں ورثہ میں ملے اور دانستہ یا دانستہ طور پر عمل پیرا رہے اور انہوں نے ان قوانین کو بدلنے کی جرأت بھی نہیں کی.
چنانچہ ھم شریعت محمدیہ کی واضح طور پر لفظی تحقیر یا اعتقادی کجروی نہ ہونے کی بنا پر تکفیر نہیں کرتے([32]).

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

[32] علامہ پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ بن بیہ Website Islam Alyom

12 - اللہ کی راہ میں جہاد کے مقاصد

سوال: اللہ تعالی کے راستے میں جہاد کے مقاصد کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: تبلیغ اور دعوت کے بعد کفار کے خلاف جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ وحدہ کی عبادت کریں، اور حضرت محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - کی رسالت پر ایمان لے آئیں یا جزیہ اداکریں.

شیخ ابن باز: رسالۂ فضل الجهاد و المجاهدين 12 / 15

تبصرہ:

جہاد کا مقصد دعوت اسلام ہے ، اور اگر لوگوں کو اسلام کی طرف بغیر لڑائی کے بلانا ممکن ہو تو جہاد کو اختیار نہ کیا جائے .

علمی رد:

جہاد فی سبیل اللہ شریعت میں ایک اصطلاح ہےجسکا مترادف اللہ تعالی کے کلمے کو بلند کرنے اور اسلام کا پیغام پہنچانے کیلئے جنگ کرنا ہے. اسلام میں جہاد فرض کفایہ ہے ۔ اور اس فریضہ کو مسلم حکمرأن انجام د ے دیتا ہے نہ کہ افراد اور جماعتیں۔ مگر مسلم ملک پر جارحیت کی صورت میں ہر صاحب استطاعت پرجہاد فرض عین ہو تا ہے.اور جہاد کا مقصد لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنا نہیں. جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرة 256)، ترجمہ: دین میں کوئی زبردستی نہیں، بیشک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے.

بلکہ جہاد کا مقصد تو صرف لوگوں کو دعوت اسلام دینا ہے انہیں اس پر مجبور کرنا نہیں . اگر پرأمن طریقے سے لوگوں کو دعت اسلام دینا ممکن ہو تو لوگوں جبرا مسلمان کرنے کے لئےجنگ کی ضرورت نہیں.

مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے اور کسی بھی آدمی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم کے ناحق قتل کی مذمت کرے کینکہ انسانی جان کا احترام اسلام کا اعلی مقصد ہے.

نبی کریم ۔صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نے فرمایا: «مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ لاَ يُحَالَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ بِمِلْءِ كَفِّهِ مِنْ دَمٍ أَهْرَاقَهُ فَلْيَفْعَلْ» (صحيح بخاري 7152)، ترجمہ: جو شخص یہ قدرت رکھتا ہو کہ اس کے ہتھیلی بھر خون بہانے کی وجہ سے، اسکے اور جنت کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی تو اسے چاہئے کہ وہ ایسا کرے.

ارشاد باری ہے: ﴿وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ﴾ (البقره 190)، ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (ہاں) مگر حد سے نہ بڑھو.

اسلام عالمی دعوت (پیغام) ہے اور اسے پوری دنیا تک پہنچانا انتھائی ضروری ہے چنانچہ وسیلہ سفر ایک جگہ دوسری جگہ پہنچنا ہے اورسفر پہلے بھی خطرناک اور آج بھی خطرے سے خالی نہیں اس وجہ سے اسلحوں سے لیس ہونا ضروری ہے تاکہ دشمن دعوت اسلام کی راہ میں حائل نہ ہوں.

اور چونکہ اسلام ایک نئی قوت ہے اس وجہ سے پہلے سے موجود طاقتوں کا اس سے جنگ کرنا ایک متوقع امر ہے یہاں تک کہ وہاں کے اقتدار میں مزاحم نہ ہو اور ہر زمانے میں لوگوں کی یہی حالت رہی ہے ، چنانچہ اسلام کا دفاع انتہائی ضروری ہو جاتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو قائم کرے اور اپنا پیغام پہنچائے.
اور اگر ماضی میں تلوار تھی تو یہ راہ تبلیغ کی حفاظت کیلئے انتہائی ضروری لیکن آج کے زمانے میں اسکا سوائے اسکے کوئی اور مصرف نہیں کہ اسلام اور اسکے ماننے والوں کے خلاف شر پسندوں سے دفاع کرنا ہے جہاں تک اسلام کی نشر و اشاعت کا تعلق ہے تو اسکیلئے کئی وسائل ہیں ، اسکے لئے سفر کی ضرورت نہیں اور نہ ہی راستے کے خطرات کا کوئی خوف ہے چنانچہ آج ذرائع ابلاغ سرحدوں کو پار کر رہے ہیں چنانچہ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے معلومات حاصل کر لیتے ہیں ۔ اقتدار انہیں نہیں روک سکتا اور نہ سر حدیں اور دروازے اسکی راہ میں حائل ہوتے ہیں.
اسلامی دعوت پیش کی جاتی ہے مسلط نہیں اور عقائد کبھی زبردستی نہیں ٹھونسے گئے اللہ تعالی نوح کے سلسلے میں فرماتا ہے: ﴿أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ﴾ (ھود28)، ترجمہ: کیا ھم اسے تم پر جبرا مسلط کر سکتے ہیں درآنحالیکہ تم اسے نا پسند کرتے ہو ، اور حضرت محمد مصطفی - صلی اللہ علیہ وسلم - سے اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (یونس 99)، ترجمہ: تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں.
جب حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے حضرت علی کرم اللہ وجھہ کو خیبر کے یہودیوں سے لڑنے کے لئے بھیجا تو آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے ارشاد فرمایا : کیا تم ان سے لڑوگے یہاں تک کہ وہ ھماری مانند ہو جائیں ؟ یعنی کیا تم انہیں اسلام پر مجبور کروگے، چنانچہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے ان سے فرمایا : انفذ علی رسلک ...... ۔
اس حدیث شریف کا مفہوم ہے ۔ تم اپنی اونٹنی پر وہاں جاؤ جب انکے علاقے میں پہنچو تو انہیں اسلام کی دعوت دو اور انہیں اللہ تعالی کے حق سے اگاہ کرو خدا کی قسم اللہ رب العزت تمھارے ذریعے ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمھارے لیئے عمدہ چنے ہوئے اونٹ ہوں، امام مسلم نے اسے روایت کیا ہے:
اگر ایسی نصوص وارد ہوئیں جو بظاھر قتال کے مطلق حکم پر د لالت یرتی ہیں تو ایسی نصوص بھی ہیں جو اس حکم کو محدود کرتی ہیں جن میں وقوع پذیر جارحیت کا رد یا معاہدے کی خلاف ورزی کی جزاء یا مستقبل میں ہونے والی جارحیت کو روکنے جیسی صورتیں ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلا تَعْتَدُوا﴾ (البقرہ : 190)، ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (ہاں) مگر حد سے نہ بڑھو .

اور اللہ تعالینے ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ﴾ (التوبة 12)، ترجمہ: اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑدیں اور تمھارے دین میں طعنہ زنی کریں تو تم (ان) کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو.
چنانچہ اللہ تعالی کے اس قول سے بھی امر مطلق محدود ہوتا ہے: " وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً "(التوبة 36)، ترجمہ: اور تم (بھی) تمام مشرکین سےاس طرح (جوابی) جنگ کیا

کرو جس طرح وہ سب کے سب (اکٹھے ہو کر) تم سے جنگ کرتے ہیں، اور اسی طرح دوسری آیات کریمہ میں ہیں ([33]). واللہ اعلم بالصواب.
ڈاکٹــر انس ابو شادی

13- دوستی اور عدم تعلقی
سوال: دوستی اور عدم تعلقی کس کیلئے ہو ، اور کفار سے دوستی کا کیا حکم ہے.

خلاصہ فتوی: کافروں سے ایسی دوستی جسکی وجہ سے اس شخص (دوست کی) کی تکفیر کی جاتی ہے، وہ در حقیقت کافروں کیلئے اسکی محبت اور اسکی جانب سے مسلمانوں کے خلاف کافروں کی مدد کرنا ہے ، اور ہر مسلماں پر واجب ہے کہ وہ ان سے سخت نفرت کرے، ان سے عداوت رکھے اور ان سے بیزار رہے.
علمی تحقیقات کی دائمی کمیٹی اور افتاء ج 2 / 47

تبصرہ:
قرآن کریم نے اہل کتاب کے ساتھ معاملات کرنے، رہنے سہنے، کھانے پینے اور انکے ساتھ شادی بیاہ کی اجازت دی ہے، ان (شادی) کے لوازمات میں شوہر اور بیوی کے درمیان محبت، جذبۂ مامتا، اور اسکے مسلم بیٹے پر اس (ماں) کے یقینی حقوق ہیں.
علمی رد:
قرآن کریم کی بہت سی آیات کریمہ غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرنے کی اجازت دیتی ہیں.
جیسا کہ اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ہے: ﴿لا يَنْهَاكُمْ اللّهُ عَنْ الّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنّ اللّهَ يُحِبّ الْمُقْسِطِينَ (8) إِنّمَا يَنْهَاكُمْ اللّهُ عَنْ الّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الظّالِمُونَ﴾ (الممتحنة 8-9)، ترجمہ: اللہ تمھیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکالا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور ان سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرو، بے شک اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے.
اللہ تو محض تمھیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنہوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ اور تمھیں تمھارے گھروں (یعنی وطن) سے نکالا اور تمھارے باہر نکالے جانے پر (تمھارے دشمنوں کی) مدد کی ۔ اور جو شخص ان سے دوستی کریگا تو وہی لوگ ظالم ہیں ۔
حضور نبی کریم - صلی اللہ علیہ وسلم ـ غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرتے تھے امام بخاری نے حضرت انس ـ رضی اللہ عنہ ـ سے روایت کی ہے ـ انہوں نے کہا: ایک یہودی غلام نبی پاک ـ صلی اللہ علیہ وسلم ـ کی خدمت کیا کرتا تھا ـ جب وہ بیمار ہوا تو رسول کریم ـ صلی اللہ علیہ وسلم ـ اسکی عبادت کیلئے تشریف لے گئے.
ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ـ رضی اللہ عنها ـ سے مروی ہیکہ رسول اللہ ـ صلی اللہ علیہ و سلم – نے ایک یہودی سے قرض پرکھانا خریدا اور اسکے پاس اپنی ذرعہ بطور رھن رکھی.

33 فتاوی الازہر نمبر 10 ـ صـ 69 ـ فضيله الشيخ عطيه صقر ـ مئی 1997 ـ القرآن و السنه.

حضرت جابر بن عبداللہ -رض- سے مروی ہے کہ ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا حضور نبی کریم ـ صلی اللہ علیہ وسلم ـ اس کیلئے کھڑے ہوگئے اور ہم بھی انکے ساتھ کھڑے ہوگئے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ـ صلی اللہ علیہ وسلم ـ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ـ صلی اللہ علیہ وسلم ـ نے فرمایا: "جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہوجایا کرو" ان نصوص (قرآن و احادیث) اور حوادث کے علاوہ ایسے واقعات بھی ہیں جن میں ہے کہ صحابہ کرام غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرتے تھے۔ان کے ساتھ ساتھ ایسی آیات بھی ہیں جو غیر مسلموں کے ساتھ علاقات کو مقید کرتی ہیں جیسا کر ارشاد باری ہے: ﴿لا تَجِدُ قَوْماً يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (المجادلة 22)، ترجمہ: آپ ان لوگوں کو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں کبھی اس شخص سے دوستی نہیں کرتے ہوتے نہ پائیں گے جو اللہ اور اسکے رسول ـ صلی اللہ علیہ و سلم ـ سے دشمنی رکھتا ہے خواہ وہ انکے باپ (اور دادا) ہوں یا بیٹے (اور پوتے) ہوں یا انکے بھائی ہوں یا انکے قریبی رشتہ دار ہوں ـ

ایک اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (الممتحنة 1)، ترجمہ: اے ایماں والو ! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم (اپنی) دوستی کے باعث ان تک خبریں پہنچاتے ہو۔

ان اجازت دینے اور ممانعت کرنے والی آیات کریمہ میں مطابقت لانے کیلئے علماء کرام کا کہنا ہے کہ قطعی ممانعت در حقیقت غیر مسلموں کے عقائد اور قوانین کو پسند کرنے کی صورت میں ہے اسی طرح مسلمانوں کے خلاف ان سے دوستی اور انکی مدد بھی ہیں، ـ ان دونوں امور سے روکنے میں جنگ کرنے والے اور جنگ نہ کرنے والے کفار دونوں شامل ہیں۔

جہاں تک ایسے ظاہری معاملات جو کہ پسندیدگی اور دوستی کے بغیر ہوں تو ان سے معاملات کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ([34]).

قرآن کریم نے اھل کتاب کے کھانوں اور انکے ساتھ شادی بیاہ کی اجازت دی ہے، ان (شادی) کے لوازمات میں شوہر اور بیوی کے درمیان محبت، جذبۂ مامتا، اور اسکے مسلم بیٹے پر اس (ماں) کے یقینی حقوق ہیں ـ

خلاصہ: حالت جنگ میں (مسلمانوں کیلئے) غیر مسلوں سے دوستی حرام ہے اور یہی آیات قرآنیہ کے اسباب نزول کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اور سیرت نبوی کے تمام واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہین اور یہ بھی ثابت ہے کہ نبی کریم ـ صلی اللہ علیہ وسلم- نے یہودیوں اور مشرکین سے معاھدے کئے تھے اور یہودیوں کے ساتھ معاھدے میں ہر بیرونی دشمن کے ساتھ جنگ میں تعاون پر اتفاق ہوا تھا اور یہ دوستی کی ہی قسم ہے لیکن یہ(دوستی) مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے جبکہ (ان سے) لاتعلقی کا مفہوم یہ ہیکہ مسلمان ہر غیر مسلم عقیدے سے لا تعلقی اور دستبرداری کا اظہار کریں،لیکن یہ لاتعلقی غیرمسلموں کے ساتھ اچھے انداز میں رہنے سے منع نہیں کرتی. جیسا کہ اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ہے: ﴿لا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنْ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (8) إِنَّمَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنْ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الظَّالِمُونَ﴾ (الممتحنة 8-9)، ترجمہ: اللہ تمھیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ

[34] تفسیر قرطبی 47 / 878، غذاء الالباب از ☆☆ ج 2 / 12 اور اسکے بعد۔

تمھیں تمھارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکالا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور ان سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرو ، بے شک اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔
اللہ تو محض تمھیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنھوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ اور تمھیں تمھارے گھروں (یعنی وطن) سے نکالا اور تمھارے باہر نکالے جانے پر (تمھارے دشمنوں کی) مدد کی ۔ اور جو شخص ان سے دوستی کریگا تو وہی لوگ ظالم ہیں ۔
چنانچہ ہر غیر اسلامی عقیدے سے لاتعلقی، غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیارکرنے کے امکان اورہر اس معاملے میں جس کی اسلام نے تائید کی ہے، اس میں ان سے تعاون کی ممانعت نہیں ہے۔
پس وہ مسلمان جومذہبی اور تہذیبی طور پر مخلوط معاشرے میں رہائش پذیر ہے، اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام اسے ترغیب دیتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اسکے غیر مسلم باشندوں سے حسن سلوك اور اچھے تعلقات قائم کرے اور انکا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی مسلمان یا غیر مسلم شخص کو نقصان پہنچائے بغیر نیک کاموں میں انکی مدد اور معاونت کرے..
شیخ سلیمان العودہ نے کہا: بعض طالبعلموں نے مجھ سے سوال کیا ، کیا میرے لئے یہ جائز ہے کافر کے سامنے مسکراؤں اس سے مصافحہ کروں اور اسکے ساتھ کسی جگہ علیحدہ بیٹھوں؟
میں نے اس سے کہا : سبحان اللہ ،کیا اس میں بھی کوئی اختلاف ہے ؟ غور کیجئے کہ رسول کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – مکہ مکرمہ میں قریش اور بت پرستوں کے سرغنوں ، اور مدینہ منورہ میں یہودیوں اور مشرکوں سے کس طرح معاملات فرمایا کرتے تھے۔
اب آپ بتائے کیا اچھے اخلاق اور دوسروں کے ساتھ ربط قائم کئے بغیر دعوت اسلام دی جا سکتی ہے ؟ ([35]).

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

14- توسل(وسیلہ) کا حکم
سوال: وسیلہ کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: انسان كي موت کے بعد اس سے توسل جائز نہیں اور یہ مذہب میں نئي بدعت ہے۔

شیخ ابن عثیمین، فتاوے العقیدہ 267- 270

[35] http//www.islamweb.net/ver2archive

تبصره:

جمہور فقہا رسول اللہ ﷺ سے توسل کو جائز قرار دیتے ہیں، مثال کے طور پر کہنے والے کا قول ہے اے اللہ میں تیرے نبي ﷺ کے توسل سے یا تیرے نبي ﷺ کے اعلی مرتبے کو وسیلہ بنا کر یا تیرے نبي ﷺ کے حق کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں خواہ یہ آپ ﷺ کي حیات مبارکہ میں ہو یا اس فاني دنیا سے رفیق اعلی کي طرف منتقل ہونے کے بعد ہو، دونوں حالتوں میں جائز ہے۔

علمي رد:

اللہ رب العزت نے اپنے مؤمن بندوں کو متعدد وسائل سے اسکا تقرب حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں اعمال صالحہ ہیں، سورت المائدہ کي آیت نمبر ۳۵ میں ارشاد خداوندي ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَابْتَغُواْ إِلَيهِ الْوَسِيلَةَ﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس (کے حضور) تک (تقرب اور رسائی کا) وسیلہ تلاش کرو.

اسیطرح غار میں ۳ افراد سے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے، اس کے علاوہ اللہ رب العزت کے ناموں اور اس کي حسنات کو وسیلہ بنانے کا حکم دیا ہے، سورۃ الاعراف کي آیت نمبر ۱۸۰ میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلِلّهِ الأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا﴾، ترجمہ: اور اللہ ہي کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، سو اسے ان ناموں سے پکارو.

اور انہي میں رسول ﷺ کو توسل بنانا دنیا میں آپ ﷺ کے توسل سے دعا مانگنا اور آخرت میں شفاعت چاہنا ہے.

وسیلہ کے جائز ہونے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف نہیں ہے، رسول ﷺ کے اس ظاہري دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد توسل کے جائز ہونے کے بارے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے جیسا کہ کہنے والے کا قول ہے،، اے اللہ میں تیرے نبي ﷺ کے وسیلہ سے یا تیرے نبي ﷺ کے مقام اعلی کو وسیلہ بنا کر یا تیرے نبي ﷺ کے حق کے وسیلہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں، چنانچہ جمہور فقہاء ،،مالکي، شافعي اور بعد کے حنفي علماء اور حنبلي علماء،، اس قسم کے وسیلہ کو جائز کہتے ہیں، خواہ یہ حضور ﷺ کي اس ظاہري حیات مبارکہ میں ہو یا اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہو، دونون حالتون میں جائز ہے.

امام قسطلاني نے کہا، روایت کي گئي ہے کہ جب بني عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور عباسي نے حضرت امام مالک سے دریافت کیا: اے ابو عبداللہ کیا میں رسول ﷺ کي طرف متوجہ ہوں اور دعا کروں یا قبلہ کي طرف رخ کروں، چنانچہ امام مالک نے ان سے کہا: اپنا چہرہ ان سے یعني رسول ﷺ سے کیوں پھیرو، جبکہ آپ ﷺ روز قیامت اللہ رب العزت کي طرف تمہارے اور تمہارے والد حضرت آدم علیہ السلام کا وسیلہ ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ کي جانب متوجہ ہو اور آپ ﷺ سے شفاعت چاہو سو اللہ رب العزت آپ ﷺ کي شفاعت قبول فرماتا ہے، یہي واقعہ امام ابو الحسن علے بن الفہر نے اپني کتاب ،،فضائل مالک،، میں قابل قبول سند سے بیان کیا ہے اور قاضي عیاض نے اپني کتاب ،،الشفاء،، میں اپنے متعدد باوثوق نتائج سے اپنے طریقے کي طرف منسوب کیا ہے،(تخریج کي ہے)۔([36])

[36] امام نووي نے روضہ اطہر رسول ﷺ کي زیارت کے آداب کے بیان میں لکھا ہے، پھر زائر رسول ﷺ کے چہرہ مبارک کي طرف متوجہ ہوتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ سے توسل کرتے ہیں اور اپنے رب کے حضور آپ ﷺ سے شفاعت چاہتے ہیں اور زائر جو کچھ عرض کرتا ہے اس میں سب سے بہتر وہ جسے ص ۵۲ جیسے حضرت ماوردي قاضي ابو الطیب اور ہمارے تمام دوستوں نے عتبي سے انکے احسان بتاتے ہوئے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: میں رسول ﷺ کے روضہ اطہر کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک اعرابي آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: السلام علیک یا رسول اللہ میں نے اللہ رب العزت کا یہ فرمان سنا: ولوا انہم۔۔ توابا رحیما، سورت نساء کي اس آیت کریمہ کا مفہوم ہے؛ اے حبیب اگر وہ لوگ جب اپني جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپکي خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافي مانگتے اور رسول ﷺ بھي انکے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ اس

بعد میں آنے والے حنبلیوں کا خیال ہے کہ نبي کریم ﷺ کي ذات اقدس سے توسل جائز نہیں، علامہ ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے۔ ([37])

انہوں نے کہا ہے: اسالک بنبیک محمد، میں تیرے نبي محمد ﷺ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کے ان ألفاظ سے وسیلہ جائز ہے، اگرچہ یہاں تقدیر مضاف ہے چنانچہ کہنے والے کے اس قول: اسالک بنبیک محمد ﷺ سے یہ مراد لیا جائگا کہ اس کا ارادہ یہ ہے میں تجھ سے آپ ﷺ پر اپنے ایمان اور آپ سے اپني محبت کے واسطے سے اور آپ ﷺ پر اپنے ایمان اور اپني محبت کو تیري بارگاہ میں وسیلہ بناتا ہوں اور اسي انداز پر ہو تو یہ جائز ہے، چنانچہ جس کا ارادہ یہ مفہوم ہو تو یہ بہتر ہے اور اس صورت مین مسئلہ میں کوئي تنازعہ نہیں ہوگا، لیکن بہت سے لوگ یہ الفاظ تو کہتے ہیں لیکن انکا مقصد یہ مفہوم نہیں ہوتا پھر انہي لوگوں کے لئے انکار کیا گیا ہے۔

جہانتک نبي کے علاوہ صالحین یعني اولیاء کرام سے توسل کا تعلق ہے تو ان سے توسل کا حکم رسول ﷺ سے توسل کے بارے میں جو اختلاف بیان ہو چکا ہے اس سے باہر نہین ہے، علامہ ابن تیمیہ نے اقرار کیا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافي ہے اور حرام اور گناہ ہے، مسئلہ کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: کسي نے بھي یہ نہیں کہا کہ جس نے پہلا قول کہا اس نے کفر کیا، اور اس کي تکفیر کي کوئي وجہ نہیں ہے، بس یہ مسئلہ خفي یعني پوشیدہ ہے اور اس کے د لائل واضح اور ظاہر نہیں ہیں اور یہاں کفر کا مفہوم دین کي معلوم باتوں کا انکار یا دین کے متواتر اور متفقہ احکام وغیرہ کا انکار ھونا، یہي نہین بلکہ اس قسم کے امور مین کفر کا فتوے دینے وا لا ایسي سخت سزا اور شرعي حد سے کم سزا کا مستحق ہوتا ہے جن سزاؤں کے مستحق مذہب میں افتراء بازي کرنے والے اور انہي جیسے لوگ ہوتے ہیں۔

بالخصوص جبکہ رسول ﷺ کي یہ حدیث شریف ہے: "أيما رجل قال لأخيه: يا كافر فقد باء به أحدهما"، ترجمہ: جو شخص بھي اپنے بھائي سے کہے اے کافر تو ان دونوں میں سے کوئي ایک ہوگا۔ ([38])

ڈاکٹر یاسر عبد العظیم

اے سب مخلوق سے بہتر دفن ہویں مٹي میں جنکي ہڈیاں　　بس پاک ہو گئے انکي پاکیزگي سے ٹیلے اور میدان
میري جان فدا ہو اس قبر پر جسمیں آپ کا قیام ہے　　اسي میں ہے پاک دامني اور اسي میں سخاوت اور شرافت

[37] ابن تیمیہ نے کہا: آپ ﷺ پر ایمان آپ ﷺ سے محبت اور آپ ﷺ کي اطاعت، آپ ﷺ پر صلاۃ و سلام، آپ ﷺ کي دعا اور شفاعت اسي طرح کي دوسري باتوں سے توسل جائز ہے اور مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے--- الفتاوے الکبری: ابن تیمیہ، 322/2۔

38 الموسوعہ الفقہیہ، ۱۴، ۱۲۱۔

15- جادو کرنے اور اسے سیکھنے کا حکم

سوال: جادو کرنے اور اسے سیکھنے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جادو ، دین سے خارج کرنے وا لا کفر ہے-

شیخ ابن باز ۔ مجموع فتاوی ۔ 118/2 ۔ 122

تبصرہ:

اگر جادوگر کا یہ عقیدہ ہو کہ جادو کا اثر اللہ رب العزت کے ارادے سے بعید ہے تو وہ کفر کرتا ہے- لوگوں کو نقصان یا ضرر پہنچانے کی خاطر جادو کرنا حرام ہے- حتی کہ اسکا یہ خیال ہو کہ وہ اللہ رب العزت کے حکم سے اثر انداز ہوتا ہے تب بھی حرام ہے- اور بندوں پر سے نقصان کے ازالے کی خاطراس عقیدے کے ساتھ (جادو) کرنا کہ اللہ کے حکم سے اسکا اثر ہوتا ہے اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے-

علمی رد:

1- یہ اعتقاد کہ جادو کا اثر اللہ تعالی کے ارادے کے بغیر ہوتا ہے تو یہ کفر ہے، یہ متفقہ رائے ہے-
2- لوگوں کو ضرر پہنچانے کیلئے جادو کرنا حرام ہے حتی کہ اس عقیدے کے ساتھ تھی حرام ہے کہ اسکا اثر اللہ تعالی کے حکم سے ہوتا ہے- چنانچہ اسلام میں نہ تو ضرر قبول کرنا ہے اور نہ ضرر پہنچانا ہے-
3- کسی مفاد کے حصول کیلئے اس عقیدے کے ساتھ جادو کرنا کہ اس کا اثر اللہ تعالی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اسکے حکم میں علماء کا اختلاف ہے-

امام قرطبی نے کہا : کیا جادوگر سے سوال کیا جائے کہ وہ جادو کا اثر زائل کرنے کیلئے جادو کرتا ہے-

اس سلسلے میں امام بخاری نے حضرت سعید بن مسبب سے روایت کی ہے کہ یہ جائز ہے اور امام مازری بھی اسی کی طرف مائل ہیں اور امام حسن بصری نے اسے نا پسند کیا ہے- امام شعبی کا خیال ہے کہ تعویذ سے جادو زائل کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اسکی تاویل دم سے مسحور کا علاج کرنے سے کی گئی ہے-([39]).

فضیلت مآب شیخ عبدالمحسن العبیکان جادو کا توڑ جادو سے کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور انہوں نے کسی جادوگر کے ہاتھوں جادو کے اثر کو زائل کرنے کو کئی ایک ائمہ اور علماء کی طرف سے جائز بتانے کی جانب اشارہ کیا اور انہیں میں حضرت سعید بن مسبب ، حسن بصری ، امام احمد ، ابن جوزی اور امام بخاری ہیں ، اور کئی ایک حنبلی فقھاء نے اپنی مستند کتابوں میں اسے بیان کیا ہے-

اور انہوں نے مفتی عبدالعزیز آل شیخ اور الشیخ عبداللہ جیسے بعض اھل علم کے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ ﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَى﴾ (طہ 69)، ترجمہ: اور جادوگر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا، سے مطلق استد لال کرنے کی جانب اشارہ کیا ، جبکہ پہلے کسی بھی عالم نے اپنے علم سے استد لال نہیں کیا کیونکہ یہ انکے اقوال پر دور یا قریب کہیں سے بھی د لالت نہیں کرتی، اگر انکا مقصد اخروی کامیابی ہے جو کہ اس آیت کریمہ سے مقصود ہے توھم اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ جادوگر فلاح نہیں پاتا اور اسکا عمل باطل ہے اگر "لا یفلح" سے انکا مقصد یہ ہو کہ وہ علاج اور جادو کا اثر دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا توھم ان سے

---

[39] الزواجر لابن حجر 3/ 104.

کہیں گے کہ قرآن کریم اس مفہوم کی تکذیب کرتا ہے، اللہ رب العزت کا فرمان ہے:
﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾ (البقرہ 102)، ترجمہ: پھر لوگ ان دونوں سے وہ سیکھتے ہیں جس سے خاوند اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔
چنانچہ انکے درمیان جدائی ہو جاتی ہے ، اور اس سے یقین دھانی ہوتی ہے کہ جادوگر اس جدائی میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس طرح وہ اس کے اثر کو زائل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اس وجہ سے اس آیت کریمہ کی یہ تفسیر نہیں کی جا سکتی کہ جادوگر جادو کا اثر زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ یہ قرآن کریم اور امر واقع کے خلاف ہے-
شیخ عبیکان سے انکے فتوی پر اس حالت میں کہ انکے کسی قریبی شخص پر جادو کیا گیا ہو عملدرآمد سے متعلق کئے گئے سوال کے جواب انہوں نے کہا - جی ہاں - اگر یہ ضروری ہو کہ میرا قریبی شخص کسی جادوگر سے علاج اور جادو کو زائل کرائے میں بلا شبہ ہرگز تردد نہیں کرونگا کیونکہ میں مکمل طور پر مطمئن ہوں کہ یہ حکم صحیح ہے اور اسمیں کوئی بھی ابہام نہیں ہے-
جادو میں استعمال کئے جانے والے وسائل اور اشیاء سے جادوگر اور اسکے ماہرین بخوبی واقف ہوتے ہیں، اور وہ خود جادوگر کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں یا دوسروں سے اور یہ دوسرے ، کمزور نفوس پر تسلط قائم کرنے والے قوی نفوس والے بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی جن ، قوی ارادے، اور لوبان سے مدد لینا بھی ہو سکتا ہے اور جیسا کہ انکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتو کی صفائی ، آنکھوں کی قریبی ہے، اسی میں معین خصوصیات والی ادویہ بھی استعمال کی جاتی ہیں مثال کے طور پر وہ اپنے جسموں پر (کوئی چیز) لگاتے ہیں چنانچہ ان پر آگ کا اثر نہیں ہوتا- اللہ اعلم بالصواب -

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

16 - لباس اور دیگر امور میں کفار سے مشابہت کا حکم

سوال: لباس اور دیگر امور میں کفار سے مشابہت کے حکم کے بارے میں پوچھا گیا؟

خلاصۂ فتوی: ممنوع مشابہت در حقیقت وہ مشابہت ہے جسکا تعلق کفار کی عادات ، عقائد اور عبادات سے ہے - اور ہو سکتا ہے کہ انکی ممنوعہ مشابہت میں غفلت کفر تک پہنچا دے-

اللجنہ الدائمہ للبحوث العلمیہ و الافتاء - مجلہ البحوث 94/42

تبصرہ:
اورکوٹ ، پتلون ، سلیپنگ سوٹ اور جیکٹ جیسے لباس جو شرعی طور پر ممنوع لباسوں کی مانند نہ ہوں ، کا پہننا جائز ہے - مذموم اشیاء ، بری عادات میں اہل کتاب کی مشابہت ممنوع اور حرام ، اسی طرح اگر انکے باطل اعمال سے خوش ہوتے ہوئے انکی مشابہت کی نیت سے ایسا کیا جائے تو بھی حرام ہے -
علمی رد:
مرد اور عورت کے لباس عادی قسم کے امور ہیں جو کہ ہر ملت یا خاندان، زمانے اور جگہ کے مطابق اور یہ کہ اسکے استعمال میں کیا فوائد یا نقصانات ہیں اور یہ انکا تعلق عبادت سے

نہیں تاکہ پہنے وا لا کس نوعیت کے لباس کا تعین کر لے ، یہ اصلا جائز ہے یہی نہیں بلکہ تمام عادتیں جن سے دینی امور یا بدن کو نقصان نہیں ہوتا جائز ہے۔ ایسا لباس جسمیں آسانی ہو یا منفعت آمیز ہو تو پسندیدہ ہے .اگر لباس نص شرعی سے ممنوع نہ ہو اور نہ ہی اس لباس کی مانند ہو جو شرعا ممنوع ہے۔ اگر کسی لباس کے بارے میں ممانعت کی شرعی نص موجود ہو جیسے مردوں کیلئے ریشم اور سونا غیر ضروری طور پر پہننا یا استعمال کرنا ہے تو پھر یہ لباس ممنوع ہے گویا کہ وہ فخر یا پسندیدگی کے طور پر لباس پہنتا ہے یا عورت ایسا لباس پہنتی ہے جس سے اسکا ستر (جسم کا وہ حصہ جسے کا کھولنا معیوب ہو) ظاہر ہوتا ہو یا ایسا لباس پہنے جس سے اسکا مقصد کافروں کے لباس سے مشابہت کرنا ہو ، یہ تمام باتیں شرعا ممنوع ہیں، اس وجہ سے نہیں کہ خود لباس ممنوع ہے لیکن هم لفظ ممنوع کے مفہوم کا مقارنہ کرتے ہیں تو کبھی یہ حرام ہوتا ہے اور کبھی مکروہ ہوتا ہے تو اسکا اندازہ اس لفظ کے معنی مفہوم کے مطابق لگایا جاتا ہے۔

اس بناپر یورپین پینٹ اور اس نوعیت کی دوسری چیز کا مردوں کا یا عورتوں کا پہننا جسکا مقصد صرف اپنی قوم کی عادت کی پیروی کرنا یا اسکا مقصد بدن کی حفاظت کرنا جیسے تیز دھوپ اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے بچنا ، یا اس طرح کوئی اچھا مقصد ہو تو انکے پہننے میں کوئی حرج نہیں ، یہی نہیں بلکہ کسی فائدے کے حصول یا نقصان سے بچنے کیلئے اسکی نیت اچھی ہو تو یہ بہتر ہے۔

جبکہ اورکوٹ ، پتلون ، سلیپنگ سوٹ، جیکٹ ، ترکی ٹوپی. تو یہ قومی لباس بن چکے ہیں اور عورتوں یا مردوں کیلئے انکے پہننے میں کوئی حرج نہیں. جیسا کہ گزر چکا ہے کہ شرعی طور پر ممنوع لباس کے مانند نہ ہو۔

ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز سے :

پرانے لوگوں کے انداز کی قمیص پہننے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر اسکے پہننے والے کی نیت رسول اللہ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ کی اقتداء ہو تو اُسے سنت کا ثواب ملے گا، اسی طرح عام قمصیں اور پتلونیں پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ ستر پوشی کرتی ہوں، جسم کے اعضاء کو ظاہر نہ کرتی ہوں ، یا یہ ریشم کی بنی ہوئی نہ ہوں ([40]). اللہ اعلم بالصواب.

جشمہ لگانے، ہار، انگوٹھی، کنگن یا اسی طرح سونے کی بنی ہوئی دوسری چیزیں یہ مردوں پر حرام ہیں اور عورتوں کیلئے ان کا استعمال جائز ہے اسی طرح چاندی کے یہ اور دوسرے زیور پہننا بھی جائز ہے ۔ اور مردوں کیلئے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے .

اور جہاں تک اس مشابہت کا تعلق ہے جو کہ کفرہے اور جس پر یہ حدیث مبارکہ د لالت کرتی ہے .

حضور اکرم ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ کی حدیث شریف ہے : من تشبہ بقوم فھو منھم.([41])، ترجمہ: جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہی میں سے ہے۔

---

[40] المفتی : مرکز الفتوی زیر نگرانی ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ فتوی نمبر 10005 قمیص اور پتلون کے ساتھ اسے پہننے کا حکم ۔ تاریخ فتوی 14 جمادی الثانیہ 1422 .

41 امام ابو داود نےسنن میں ص 4033 حضرت ابن عمرو – رضی اللہ عنہ – سے روایت کی ہے انہوں کہا : رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہی میں سے ہے ۔ ابن تیمیہ نےاپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں لکھا ہے کہ اسکی سند جید ہے۔

یہ ان کے کسی مذہبی شعار میں مشابھت ہے جس سے اس کا مقصد ان کے مذھب کی توقیر اور دین اسلام کی تحقیر ہو ،([42])(ان حالتوں میں وہ حدیث پاک کی رو سے یقینا کافر ہے). اللہ تعالی اعلم بالصواب.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

17- غیر اسلامی ممالک میں رہنے کا حکم

سوال: غیر اسلامی ممالک میں رہنےکے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: کام تجارت اور تعلیم کے لئے ان ممالک میں رہنا جائز نہیں۔ صرف علم وبصیرت تبلیغ اسلام کے مقصد سے رہ سکتے ہیں۔

الشیخ ابن باز مجموعۃ فتاوے9/401-402

تبصرہ:

کسی بھی مسلمان کا ایسی جگہ سکونت اختیار کرنا جائز ہے جہاں وہ اپنے دینی شعائر کی ادائیگی ، معاشرے میں مثبت اقدامات میں شرکت، اپنے دین کی خوبیوں، اخلاق حسنہ اور اعلی اقدار کو قائم رکھ سکتا ہو.

مسلمان پر بحیثیت مسلمان لازم ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے خواہ وہ اسلامی یا غیر اسلامی یا دینی اعتبار سے مخلوط معاشرے میں رہتا ہو. اور یہ کہ جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اسکے مفادات کیلئے مثبت سرگرمیوں میں شریک ہو.

علمی رد:

جب زمین کے کسی بھی خطے میں اگر مسلمان کی جان اور دین محفوظ ہو، اور اسے ایسے حقوق حاصل ہوں کہ وہ اپنے دینی شعائر بلا ضرر ادا کرسکے تو ایسے خطے میں سکونت اختیار کرنے کے بارے میں تین احکام ہیں:

پہلا حکم : جائز ہے کیونکہ اس جگہ یا کسی دوسری جگہ سکونت اختیار کرنے میں کوئی فرق نہیں.

دوسرا حکم: مستحب ہے یہ اس حالت میں ہےکہ وہ اس خطے اور کسی دوسرے خطے کےمقابلے میں ، معاشرے میں مثبت سرگرمیوں میں شرکت، اپنے دین کی خوبیوں، اخلاق حسنہ اور اعلی اقدار کو قائم رکھ سکتا ہو.

تیسرا حکم: واجب ہے یہ اس صورت میں ہےکہ جب اسکے ہجرت کرنے سے ضرر اور فساد یقینی ہو.

اسی پر ان آیات کریمہ اور حدیث مبارکہ کا اطلاق کیا جاتا ہے، ارشاد باری ہے :

﴿إِنّ الّذِينَ تَوَفّاهُمُ الْمَلاَئِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي ا لأَرْضِ قَالْوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُوْلَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنّمُ وَسَاءَتْ مَصِيراً﴾ (النساء 97)،

ترجمہ: بے شک جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ دشمن ماحول میں رہ کے اپنے جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں تو وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے (تم نے اقامت دین کی جدوجہد کی نہ سر زمین کفر کو چھوڑا)؟ وہ(معذرۃ) کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور وبےبس تھے،فرشتے (جوابا) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ

[42] فتاوی دار ا لافتاء المصریہ ۔ موضوع 683 ۔ مفتی : شیخ عبد المجید سلیم 14 جمادی الآخر 1347 ھ/ 26 نومبر 1928ء۔

تھی کہ تم اس میں کہیں ہجرت کر جاتے۔ سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے ۔اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔
اور حدیث مبارکہ ہے: (انا بری من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین) میں مشرکوں کے درمیان رہنے والوں سے بری ہوں" (اسکی تخریج امام ابوداؤد نے 2645 اور ترمذی نے 1609 کی ہے).

محقیقین کا کہنا ہے اگر دار کفر میں مسلمان کا رہنا دار اسلام میں مفید ہو،دار کفر میں تعلیم اور اپنی مصلحتوں کو پورا کرنے کی غرض سے دار کفر میں موجود مسلمانوں کیلئے مفید ہو یا اسلام اور اسکے اصولوں کی نشر واشاعت نیز اسکے بارے میں پیدا کردہ شبہات کے ازالے کیلئے مفید ہو تو اس حالت میں اسکی اس معاشرے میں موجودگی وہاں سے ہجرت کرنے سے افضل ہے ،اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوی ا لایمان،قوی الشخصیت اور صاحب اثر نفود ہو تاکہ وہ ا س کام کی ادائیگی کر سکے۔
ابتدائی زمانوں میں مبلغین اور تاجروں کا کافروں کے ممالک میں اسلام کی نشرواشاعت میں بڑااثر رہا ہے ([43]).
مسلمان پر بحیثیت مسلمان لازم ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے خواہ وہ اسلامی یا غیر اسلامی یا دینی اعتبار سے مخلوط معاشرے میں رہتا ہو. اور یہ کہ جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اسکے مفادات کیلئے اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مثبت سرگرمیوں میں شریک ہو.

پروفیسر ڈاکٹر سعود بن عبداللہ الفنیسان:
حصول علم یا علاج یا تجارت کی غرض سے کافروں کے ملک کی طرف سفر کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ تعلیم کی غرض سے آپکے سفر پر اجر بھی ملے گا انشاء اللہ،اور آپ اللہ ربالعزت کی اطاعت ،نیک کام اور ان ممالک کے لوگوں، وہاں رہنے والوں کو حسب استطاعت اسلام کی دعوت دینے کی پابندی کرتے رہیں ۔ان ممالک میں۔
موجود مساجد اور اسلامی مراکز میں دعوت اسلامی اور عمومی منفعت کے امکانات کافی میسر ہیں ۔جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف: "انا بری من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین" (اسکی تخریج امام ابوداؤد نے 2645 اور ترمذی نے 1609 کی ہے) "میں مشرکوں کے درمیان رہنے والوں سے بری ہوں " میں وارد ممانعت کے بارے میں آپکے خوف کا تعلق ہے تو علماء کرام نے اسکی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ اگر کافروں کے درمیان رہنے کی خواہش حصول علم یا علاج یا تجارت یا طلب رزق یا اللہ رب العزت کی طرف دعوت دینے وغیرہ جیسے شرعی اسباب کے علاوہ ہو اور مسافر صرف کافروں کے ممالک یا اسکے باشندوں سے محبت کا قصد کرتا ہے تو حدیث میں اسکی ممانعت ہے۔
اللہ آ پ کو توفیق دے اور آپکی مدد فرمائے اور اس سے آپکو نفع پہنچائے۔

ڈاکٹریاسر عبدالعظیم

---

[1] [43] فتاوى دارا لافتاء المصريہ الموضوع27 مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر1997.

18- غیر اسلامی ملک (دار الحرب) کی شہریت حاصل کرنے کا حکم
سوال: غیر اسلامی ملک (دار الحرب) کی شہریت کے حاصول کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصۂ فتوی: غیر اسلامی ملک کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں ۔ اسمیں انکی پیروی اور انکے باطل مواقف کو منظور کرنا ہے۔
اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ و الافتاء جـ2 صـ69

تبصرہ:
درحقیقت (کسی بھی ملک) کی شہریت حاصل کرنا برا عمل ہے نہ اچھا بلکہ اسکاحکم شہریت حاصل کرنے پر متوقع نفع ونقصان کے مطابق مترتب ہوتا ہے ۔
علمی رد:
پہلے بیان ہوچکا ہے کہ کسی بھی مسلمان کا ایسی جگہ سکونت اختیار کرنا جائز ہے جہاں وہ اپنے دینی شعائر کی ادائیگی ، معاشرے کی مثبت سرگرمیوں میں شرکت، اپنے دین کی خوبیوں، اخلاق حسنہ اور اعلی اقدار کو قائم رکھ سکتا ہو۔ اگر اسپر یہ خیال غالب ہو یا اسے گمان ہو کہ وہ اپنے اسلامی واجبات کو ادانہیں کر سکےگا، اور اسے اپنی اولاد کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو تو اسے اپنے ملک واپس آجانا چاہیے ۔
غیر اسلامی ملک کی شہریت کے حصول کے بارے میں عصر حاضر کے علماء کی دو آراء ہیں۔
ان میں سے بعض کا خیال ہے کر یہ قطعی ممنوع امور میں سے ہے ۔ یہی نہیں بلکہ یہ گناہ کبیرہ میں سے ایک ہے اور یہ واضح کفر کے ارتکاب اور اسلام سے مرتد ہونے کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔
تو نس کے علماء نے ، فرانسیسی قبضے کے وقت فتوی دیا تھا کہ فرانسیسی شہریت کا حاصل کرنا اسلام سے خارج ہونا اور مرتد شمار ہونا ہے۔ کیونکہ اسکی شہریت حاصل کرنے سے وہ شخص اپنے وطن سے وفاداری کو بیچ کر سامراج کی وفاداری خریدتا ہے۔ چنانچہ بڑے علماء نے ایسا کرنے والے کے لیئے کفر کا فتوی دیا تھا ، کیونکہ یہ فتوی مزاحمت اور غیر ملکی قبضے کے خلاف وسیلہ اور جہاد کے اسلحوں میں سے ایک اسلحہ ہے۔
اور بعض دوسروں کے نزدیک، درحقیقت (کسی بھی ملک) کی شہریت حاصل کرنا برا عمل ہے نہ اچھا بلکہ اسکاحکم شہریت حاصل کرنے پر متوقع نفع ونقصان کے مطابق مترتب ہوتا ہے۔ یہی صحیح ہے ۔
مغربی ممالک میں مسلمانوں کی موجودگی امر واقع (حقیقت) ہے اور وہ ان ممالک کا حصہ بن چکے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ (غیر مسلم ممالک کی)شہریت سےمسلمان کو (شہری بننے کے بعد) بہت سے حقوق حاصل ہوتے ہیں، جنکی وجہ سے وہ معاشرے مثبت سرگرمیوں میں شرکت کر سکتا ہے جس سے اس معاشرے کے ہر باشندے کو فوائد حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمیں یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان کی زندگی کا اعلی مقصد اپنے دین کی حفاظت ہے۔
جس سے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے ، چنانچہ نامزد (امیدوار) ووٹ حاصل کرنے کے لیئے مقابلہ کرتے ہیں ، اسلیئے شہریت کا حصول بذات خود نہ شر ہے اور نہ خیر ، اس وجہ اسکا حکم شہریت کے حصول سے مسلمانوں کو پہنچے والے نفع یا نقصان کے مطابق ہوتا ہے ۔
اور اگر اسے غالب خیال ہوکہ شہریت کے حصول سے اسے فرزندوں اور اولاد کے گمراہ ہونے کا یا عقیدے اور عملی طور پر راہ راست سے ہٹنے کا یا شہوات میں ڈوب جانے اور ہلاکت کا

خدشہ یا شک بھی ہو تو اسے مسلم معاشرے میں رہنا چاہئے ۔ اور وہ دوسری شہریت حاصل نہ کرے ۔ معیار ہمیشہ یہ ہے کہ وہ ، اسکا خاندان اور اولاد اپنے اسلام پر قائم رہنے کی کہاں تک قدرت رکھتے ہیں ۔([44]) و اللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

19- غیر مسلموں کو انکے تہواروں پر مبارکباد دینے کا حکم

سوال: غیر مسلموں کو انکے تہواروں پر مبارک باد دینے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا۔

خلاصۂ فتوی: کافروں کو انکے تہواروں پر مبارکباد دینا جائز نہیں کیونکہ یہ گناہ میں تعاون اور وہ حب باطل پر میں اس سے رضا مندی ہے ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔

اللجنہ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء313/3
شیخ سعید عبد العظیم www.alsalafway.com

تبصرہ:
رشتہ داری ، ہمسائیگی اور اس طرح کے دیگر تعلقات رکھنے والے غیر مسلموں کو انکے تہواروں پر مبارکباد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن انکے مذہبی رسم و رواج نصاری کی خصوصیات اور انکے مذہبی قربان (قربت حاصل کرنے کی رسوم) میں شرکت نہ کرے، قطعی ممانعت در حقیقت غیر مسلموں کے عقائد اور قوانین کو پسند کرنے کی صورت میں ہے اسی طرح مسلمانوں کے خلاف ان سے دوستی اور انکی مدد بھی ہیں ۔

علمی رد:
اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی دو آیات میں مسلمانوں کے درمیان اور غیر مسلموں کے ساتھ انکے تعلقات کا دستور و قانون وضع کیا ہے ۔ سورۃ الممتحنہ کی یہ دونوں آیات کریمہ بت پرست مشرکوں کے بارے میں نازل ہوی ہیں ۔ ارشاد باری ہے : ﴿لا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (8) إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (الممتحنۃ : 8-9)، ترجمہ: اللہ تمھیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکا لا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور ان سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرو ، بے شک اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

---

[44] نئی نسل بالخصوص عرب باشندوں پر مغربی ممالک میں قیام کے خطرات سے متنبہ کرنا ضروری ہے ۔ ان ممالک میں اپنے مذہب پر قائم رہنے والے مسلماں دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں ۔ بلکہ ان ممالک میں موجود مساجد میں گنجائش بھی تقریبا اتنی ہی ہوتی ہے ۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ مغربی ممالک میں قیام پذیر نوے فیصد مسلماں مساجد کے قریب نہیں جاتے ۔ غالب خیال یہی ہے کہ انکی آئندہ نسلیں اسلام کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتیں بلکہ غالبا وہ اسے نا پسندیدگی اور نفرت (اکتاہٹ) کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ ان ممالک میں مستقل رہنے والے اور وہ جنکا اسلامی ممالک سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے وہ سنگین خطرے میں ہیں ۔ اسلامی ملک میں پرورش پانے کی وجہ سے اگر وہ خود محفوظ ہے تو اسکی اولاد اور پوتے اکثر محفوظ نہیں ہیں اور بالخصوص پردیس میں ملک سے رشتہ کمزور ہونے ، انکے منتشر ہونے اور ان غیر مسلم معاشروں میں گھل مل جانے کی سہولیات میسر ہونے کی وجہ سے عربوں کی یہی حالت ہے۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں ، مغربی ممالک کی جانب ہجرت کا عربوں کا تجربہ نا کام رہا ۔ انکی نسلوں پر کوئی (اسلام کا) اثر باقی نہیں رہا بلکہ وہ سب ان معاشروں میں ضم ہوگئے اور انکی (عربوں) باقیات میں ارجنٹائن کے صدر کارلوس منعم اور امریکی صدر باراک حسین اوباما کے والد و غیرہ ہیں ۔

اللہ تو محض تمھیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنہوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ اور تمھیں تمھارے گھروں (یعنی وطن) سے نکا لا اور تمھارے باہر نکالے جانے پر (تمھارے دشمنوں کی) مدد کی ۔ اور جو شخص ان سے دوستی کریگا تو وہی لوگ ظالم ہیں ۔

ان دونوں آیات کریمہ نے امن سے رہنے والوں اور جنگ کرنے والوں کے درمیان فرق کر دیا ہے ۔ امن سے رہنے والوں کے ساتھ نیکی کرنے اور انکے ساتھ انصاف کرنے کے لیئے کہا ہے : یعنی انکے ساتھ عدل و انصاف و احسان اور فضل کرنا ہے جبکہ دوسری آیت کریمہ میں انکے ساتھ دوستی اور انکی پیروی کرنے سے منع کیا گیا ہے ۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے دشمنی کی ان سے جنگ کی اور انہیں انکے وطنوں سے نا حق نکا لا ۔

شیخان (امام بخاری اور امام مسلم) نے حضرت اسماء بنت ابی بکر ۔ رضی اللہ عنہما ۔ سے روایت کی ہے کہ وہ ایک دن رسول اللہ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم، میری ماں میرے یہاں آئیں اور وہ مشرکہ ہیں ، وہ راغب تھیں (یعنی تعلق قائم رکھنے اور انہیں تحفہ دینے کی طرف) کیا میں ان سے تعلق رکھوں ؟ آپ ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نے فرمایا: اپنی ماں سے تعلق رکھو (متفق حدیث شریف) یہ حکم تو اس حالت میں ہے جبکہ وہ مشرکہ ہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ اہل کتاب کے لیئے اسلام کا موقف بت پرست مشرکوں سے خفیف ہے . قرآن کریم نے انکے کھانوں اور ان سے شادی اور اس سے متعلق امور کی اجازت دی ہے ۔ شوہر و بیوی درمیان لگاؤ اولاد کے لیئے ماں کی محبت اور اولاد پر ماں کے حقوق اسلام میں ثابت ہیں ۔ چنانچہ نیکی اور اچھے سلوک میں سے یہ ہر کہ انہیں انکی عید پر مبارک باد دی جائے اور ہمیشہ اچھے اخلاق کا اظہار کیا جائے جبکی رسول اللّٰہ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ نے وصیت فرمائی ہے حدیث شریف ہے :" و خالق الناس بخلق حسن"[45].

اسکا مفہوم ہے لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ ، غور کریں حضور اکرم – صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نے خالق الناس فرمایا یہ نہیں فرمایا خالق المسلمین بخلق حسن مسلمانوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ ۔ اگر غیر مسلم ، مسلمانوں کی عیدوں پر انہیں مبارکباد دینے میں پہل کریں تو اس موقع پر (یعنی انکے تہوار پر) مبارک اپنے کی مشروعیت ثابت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کے ہم سلام کا جواب اس سے اچھا یا کم از کم ویسا ہی دیں جیسا اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ (سورہ النساء 86)، ترجمہ: اس آیت کریمہ کا مفہوم ہے ـ: "اور جب (کسی لفظ) سلام کے ذریعے تمہاری تکریم کی جائے تو تم (جواب میں) اس سے بہتر (لفظ کے ساتھ) سلام پیش کیا کرو" اور اسکی تاکید اس حالت میں بھی ہوتی جب ہم انہیں اسلام کی دعوت دینا اور انکے قریب ہونا چاہتے ہوں اور یہ ہم پر واجب ہے اور ایسا ہمارے اور انکے درمیان دوری یا غیر شائستگی سے نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ ایسا اچھے تعلق اور اچھے اخلاق ہی سے ہو سکتا ہے ۔ نبی کریم ۔ صلی أللہ علیہ وسلم ۔ اپنی پوری مکی زندگی میں مشرکین قریش کی ایذاؤں اور آپ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ اور آپکے صحابہ کرام کے خلاف کمعلم کھلا دشمنی کے باوجود آپ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ ان سے اعلی اخلاق سے پیش آئے اور انکے ساتھ ائنے شریفانہ اور بہتر انداز سے زندگی گزاری کہ اہل مکہ آپ ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ پر ہی اعتماد کرتے تھے اور اپنی امانتیں آپ ۔ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ کے پاس رکھا کرتے تھے۔ اس وجہ سے کوئی مانع نہیں کہ

[45] رواہ الترمذی اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسلمان انہیں براہ راست مبارکباد دیں یا انہیں ایسے عید کارڈ بھیجیں جن پر اسلامی اصول کے مخالف مذہبی عبارتیں اور شعار نہ ہوں ۔ ایسے موقعوں پر مبارکباد کے عام الفاظ میں انکے مذہب کو قبول کرنے یا خوشی جیسی کوئی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ خوش خلقی کے الفاظ ہوتے ہیں جنہیں لوگ جانتے ہیں ، ان سے (غیر مسلموں سے) تحفہ قبول کرنے اور پھر اپنی جانب سے تحفہ دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہے رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے غیر مسلموں مثال کے طور پر مصر کے عظیم قبطی مقوقس و غیرہ کے تحفہ قبول فرمائے ، بشرطیکہ یہ تحفے شراب اور خنزیر کے گوشت جیسے مسلمانوں کیلئے حرام اشیاء نہ ہوں ۔[46]

جہاں تک یوم آزادی یا اتحاد یا طفولت اور مامتا اسی طرح کی دیگر معاشرتی اور قومی عیدوں (ایام) کا تعلق ہے تو انکی مبارک باد دینے میں مسلمانوں پر کوئی حرج نہیں بلکہ وہ ان میں ممالک کے باشدے ہونے یا مقیم ہونے کے طور پر شرکت کریں لیکن انہیں ان موقعوں پر واقع ہونے والی ممنوعہ یا حرام باتوں سے بچنا چاہئے ۔

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

46 یورپی کونسل ۔ برائے افتاء اور تحقیقات ۔ شیخ سلمان عود www.islamweb.net.com

باب دوئم عــلم

20- ایک مسئلہ کو ایک سے زیادہ فقیہ سے دریافت کرنا
سوال: اُس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ایک ہی مسئلہ کو کسی فقیہ سے دریافت کرے پھر اسی مسئلہ کو دوسرے فقیہ سے دریافت کرے۔

خلاصہ فتویٰ: جس شخص نے ایک مفتی سے دریافت کیا پھر اسی مسئلہ کو دوسرے مفتی سے دریافت کرنا جائز نہیں۔
الشیخ الفوزان: التفقہ فی دیـن اللہ ۲۱/۱۔۲۲

تبصرہ:
جس نے کسی مفتی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا پھر اسی مسئلہ کو دوسرے مفتی سے دریافت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔
علمی رد:
علماء نے کہا کہ دو مفتیوں کے فتوے میں اگر اختلاف ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کی رائے کو اختیار کرے کیونکہ وہ خود اہل اجتہاد میں سے نہیں ہے ۔ بلکہ اُس پر کسی عالم کی تقلید واجب ہے جو اس کا اہل ہو اور ایسا کیا گیا ہے ۔ دو آراء میں سے جو رائے بہتر معلوم ہوئی لی گئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تیسرے مفتی سے وہ مسئلہ دریافت کرے اور وہی مسئلہ دریافت کرے اور وہ فتویٰ اختیار کیا جائے جو اُس کے مطابق ہو۔ ([47]).
اِس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ایک مسئلہ کو ایک یا ایک سے زائد علماء سے دریافت کرنے میں کوئی حرج نہیں اور ان اسس میںسے جس کی رائے چاہے لے لے۔ واللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

21- طالب علم کا کسی دلیل کے بغیر فتویٰ دینا

سوال: کسی دلیل کے بغیر طالبعلم کے فتویٰ دینے کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔

خلاصہ فتویٰ: طالبعلم دلیل کے بغیر فتویٰ نہ دے۔

الشیخ ابن باز مجلۃ البحوث ۱۶۳/۴۷۔۱۶۴

تبصرہ:

---
[47] النووی فی المجموع ۹۴/۱.

طالب علم فتویٰ نہیں دیتا۔ بلکہ وہ مجتہد علماء کے مسالک کو نقل کرتا ہے۔

علمی رد:

شرعی احکام کا فتویٰ دینے والے مفتیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کتاب و سنت اور دیگر شرعی ادلہ میں اپنی مستقل نگاہ اور رائے رکھنے والوں کی ہے۔ جیسے ائمہ اربعہ (چار امام) ۔ دوسری قسم غیر مستقل فقہا ء کی ہے ۔ یہ پہلی قسم سے منسوب ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے مسلک کی پابندی اور ان کے اصولوں کی اتباع کرتے ہوئے فتویٰ دیتے ہیں۔ مستقل مفتی کی شرائط یہ ہےں ۔

مکلف مسلمان ہو۔ باثقہ ہو۔ محفوظ و مأمون ہو۔ فسق و فجور کے اسباب اور مروت کی کمزوریوں سے پاک ہو۔ د لائل پر غور و فکر کرکے احکام کے استنباط کا ملکہ و صلاحیت رکھتا ہو۔ صحیح ذہن اور مضبوط و مستحکم فکر کا مالک ہو۔ صحیح تصرف اور استنباط کی قدرت رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں قرآن و سنت ، اجماع، قیاس ، ادلہ احکام شرعیہ کی معرفت اور ان سے متعلق افضلیت اور ترجیحات کا علم رکھتا ہو۔ د لائل کی شرطوں ، اُن کی د لالت کی طریقوں ، اُن سے احکام کے استنباط کے طریقوں کا عالم ہو۔ اصول الفقہ سے استفادہ کرتا ہو۔ علوم قرآنی ،حدیث شریف ،ناسخ و منسوخ، علم النحو ، علم اللغت اور علم الصرف کا عالم ہو ، قدیم علماء کے اتفاق و اختلاف سے واقف ہو، تاکہ وہ د لائل اور ان سے اقتباس اور استنباط کی شرطوں کو پورا کرسکتا ہو۔ ان علوم کو استعمال کرنے اور اس سے مشکلات کو حل کرنےکی قدرت رکھتا ہو۔ بنیادی مسائل اور فروعی مسائل جو پہلے طے کئے جاچکے ہیں ان کا اُسے علم ہو۔ جس شخص میں یہ تمام صفات پائی جائےںوہ مفتی مطلق مستقل ہوتا ہے ۔وہ فرض کفایہ کی ادائیگی کرتا ہے اور یہی مطلق مستقل مجتہد ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے مجتہد کا پابند ہوئے اور تقلید کئے بغیر ادلہ اربعہ سے شرعی احکام کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری قسم کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ مستقل مفتی نہیں ہوتے۔ علماء نے ان کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں۔ اور ہر ایک کے لیے لازمی شرط ہے کہ وہ اپنے مسلک کا پابند ہو ۔ د لائل پر غور و فکر کرکے احکام کے استنباط کی صلاحیت رکھتا ہو۔ فتویٰ دینے والے میں اگر یہ صفات نہ ہو تو وہ عظیم گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ علماء نے کہا کہ مقلد کیلئے اپنے ہی مسلک میں فتویٰ دینا جائز ہے۔ مثال کے طور پر وہ یوں کہے کہ شافعی مسلک میں یہ مسئلہ

اس طـــــرح ـ اور ـ اس طـــــرح ہــــے۔ تــــو اس مــــیں کــــوئی حــــرج نہــــیں۔ [48]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ طالبعلم کو چاہئیے کہ اگر وہ فتویٰ دے تـو چـاروں معتمـد ائمـہ کـے مسلک کی پابندی اور اُن سے نقل کرتے ہوئے فتویٰ دے نہ کہ ان کے د لائـل اور اصـول و قواعـد میں غور و خوص کرے۔ صحابہ کرام سے جب کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جاتا تـو وہ اسے دوسرے کی طرف منتقل کردیتے۔ (حضرت) ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا: کون سا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے دی اگر میں کتـاب اللہ میں ایسی بات کہوں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کا مقصود اور ارادہ نہ ہـو۔ قـدیم علمـاء کـے یہـاں عبارت "لاادری"(میں نہیں جانتا) کا ایک مقام و مرتبہ تھا ۔

اس عبارت پر بکثرت عمل کیا جاتا تھا۔ ایک روایت میں خبر ہے کہ علم تین ہیں ،کتاب نـاطق (کتاب گویا)، سنت قائمہ (قائم سنت) اور لاادری (میں نہیں جانتا) [49] (حضرت) ابـن مـسعود نے فرمایا: کہ عالم کی ڈھال ہے "لا ادری" (مـیں نہـیں جانتـا) ۔ اگـر وہ اس کـے اسـتعمال مـیں غلطی کرتا ہے تو یہ غلطی اُسے اُس کے حریف تک پہنچا دیتی ہے۔ (حضرت) ابـن عمـر (رضـی اللہ تعالیٰ عنہ) سے دس مسائل دریافت کئے جاتے تو آپ صرف ایک کا جواب دیتے اور نو مـیں خاموشی اختیار فرماتے ۔ (حضرت) امام مالک سے اڑتالیس مسئلے دریافت کئے گئے تـو انہـوں نے ان میں سے بتیس کے بارے میں کہا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) ۔ یـہ سـب سـلفی صـالحین کی قابل شرف حالتیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علم کے بغیر فتویٰ دینے میں کس قدر خـوف زدہ رہتے تھے۔ باوجود یہ کہ دعوت پہنچانے کا حکم عام تھـا۔ اور علـم کـو چھپـانے کـے بـارے میں تنبیہ موجود تھی اور جس کسی کو علم پھیلانے کی رغبت ہو اسے چاہئے کـہ وہ جـو کچـھ کہے اسے اس کا پورا علم کو اور وہ اس پر ثابت قدم ہو۔ اور جو شخص کسی اجتہادی رائے سے واقف ہو اسے چاہئے کہ وہ اسی رائے سے چمٹا نـہ رہـے۔ اور نـہ ہی تعـصب اختیـار کـرے۔ واللہ اعلم.

شیخ محمد صالح المنجد نے کہـا: "العـامی" (وہ شـخص جـو د لائـل تـک رسـائی حاصـل نہـیں کرسکتا اور اہل علم کے طریقوں کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تو اس)پر تقلید اور اہل علم سے

---

48 المجموع للنووی ۰۷۸/۱.

49 خطیب نے اسے ابن عمر پر موقوف روایت کیا۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نیز دیگر نے اسے مرفوم روایت بتایا ، العراقی علی الاحیاء ج ۱ صفحہ نمبر ٦١.

دریافت کرنا فرض ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۃ الانبیاء ۷)، ترجمہ: اگر تم کو معلوم نہ ہو تو علم والوں سے دریافت کرو۔ ([50]).

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

22 ۔ فقہی مذاہب کے درمیان منتقل ہونے کا حکم

سوال: ایک فقہی مذہب سے دوسرے فقہی مذہب کی طرف منتقل ہونے کے حکم کے بارے میں سوال کیا.

خلاصہ فتویٰ: مسلمان کےلئے جائز نہیں کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش سے ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مذہب کی طرف منتقل ہو۔ بلکہ اسے دلیل کے مطابق عمل کرنا چاہئے ۔
اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ و والافتاء **۹۶/۱۲**

تبصرہ:

مجتہد علماء پر واجب ہے کہ وہ اُس پر عمل کریں جو دلیل سے ثابت ہو اور دوسروں پر اُن کی تقلید کرنا واجب ہے ۔ مقلد پر واجب نہیں کہ وہ کسی معین مذہب کی پابندی کرے۔ مذاہب کی اتباع کرنے کی اجازت دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

علمی رد:

شرعی احکام میں کچھ ایسے احکام ہیں جن پر غور و خوص اور ان میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہر مسلمان انہیں مذہبی احکام کے طور پر جانتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کے ارکان خمسہ (پانچ ارکان) اور بڑے ممنوعہ امور۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے امور ہیں جن پر غور و خوص اور اجتہاد ضروری ہوتا ہے۔ فقہ کے اکثر مسائل یہی ہیں اور اجتہاد کی اہلیت رکھنے اور شرطے پوری کرنے والے مجتہد ان مسائل کے بارے میں حکم تلاش کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ عام مسلمان پر واجب ہے کہ وہ مجتہد علماء کے مذہب کی پیرروری کریں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۃ الانبیاء ۷)،

[50] الشيخ محمد صالح المنجد سوال نمبر ۱۰۲۹۶.

ترجمہ: اگر تم کو معلوم نہ ہو تو علم والوں سے دریافت کرو۔ کیونکہ عام مسلمان استنباط احکام کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ا لعامی (وہ شخص جو مسئلہ تلاش نہ کرسکے) پر واجب نہیں کہ وہ کسی معین مجتہد کے مسلک کی پابندی کرے بلکہ وہ کسی مسئلہ میں اماابو حنیفہ کے قول پر عمل کرے اور دوسرے مسئلہ میں قطعی طور پر کسی دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کرے۔ کیونکہ فتویٰ دریافت کرنے والے ، صحابہ کرام کے عہد سے اور ان کے بعد کے زمانے سے کبھی کسی ایک مجتہد سے فتویٰ لیتے اور کبھی کسی دوسرے سے۔ اور وہ کسی ایک فقیہ کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ اور جب کوئی عام شخص کسی مجتہد سے فتویٰ دریافت کرنے اور مسئلہ کے حکم سے واقف ہوجانے کے بعد دوسرے مجتہد سے اس کا حکم دریافت کرتا ہے اور اس کا حکم معلوم ہوجانے کے بعد اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے کسی بھی ایک کے قول پر عمل کرے۔ ([51]) اور اسی پر اس کی اتباع جائز ہے۔ مذاہب نے مختلف مسائل میں اس کی اجازت دی ہے۔ جیسا کہ اکثر علماء کی رائے ہے ([52]) چنانچہ جس شخص نے امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق وضوء کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ امام شافعی کے مسلک کے مطابق نماز پڑھے۔ اور اس کے برعکس یعنی وضو ء تو امام شافعی کے مذہب کے مطابق کرے اور حنفی مذہب کے مطابق نماز ادا کرے۔یہ جائز ہے کیونکہ مقلد اس کا پابند نہیں کہ وہ کسی معین مفتی سے ان امور کے بارے میں دریافت کرے۔ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ([53]).

ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے:

آرا ء میں اختلاف سے اللہ رب العزت کی منشا یہ ہوئی کہ وہ اپنے بندوں پر وسعت فرمائے۔ اگر کسی زمانے میں ایک عالم کے قول پر عمل مشکل ہوجائے تو وہ دوسرے کے قول پر عمل

---

51 ا لامدی اور ابن الجمام نے التحریر میں اور صاحب الجوامع اور مسلم الثبوت نیز دیگر علما ء اصول نے یہی بات لکھی ہے۔

52 التحریر کی شرع میں لکھا ہے کہ (اور اس سے تخریج کی جاتی ہے) یعنی وہ کسی معین مسلک کی پابندی نہیں کرتے اور اس کی اتباع کا جواز مسالک کی اجازت ہے۔ یعنی مسائل پیش آنے پر انہوں نے ہر مسلک سے وہ بات لی جو زیادہ آسان ہو۔ اور اسی طرح مسلم الثبوت اور شرح الجلال المحلی پر حاشیہ العطارمیں ہے .شرح التجرید میں شرنبلالی حنفی نے سید بادشاہ سے نقل کیا ہے فقہی مذاہب میں بیان کردہ رخصتوں کی اتباع(کسی مسئلے میں مکلف کیلئے آسان رائے پر عمل کرنا) جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں.ابن امیر الحاج نے کہا ہر مسئلے میں عام شخص کا اپنی آسانی کیلئے کسی بھی مجتھد کے قول پر عمل کرنے میں ، مجھے معلوم نہیں کہ شرعی اور عقلی طور پر کیا ممانعت ہے . 1 ھ. جہاں تک اُس کا تعلق ہے جو انہوں نے ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ العامی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اجازت کی اجماعی طور پر اتباع کرے۔ اس سلسلے میں کہیں گے کہ یہ علی ا لاطلاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے امام احمد سے دو روایتیں بیان کی ہیں۔ اور قاضی ابو یعلی نے اُس روایت پر محمول کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مسالک کی اجازت غیر متأول کیلئے منسوخ ہے۔ لیکن مقلد کیلئے نہیں۔

53 فتاویٰ دار ا لافتاء المصریۃ : الموضوع (۱۱۰۲) المفتی : فضیلۃ الشیخ حسنین محمد مخلوف ۴ جمادی ا لاخر ۱۳۷۳ھ ۹ فروری ۵۴.

کرلیں۔ اور اگر اللہ رب العزت چاہتا کہ کتاب و سنت کی نصوص کا صرف ایک ہی مفہوم ہو اور اس میں کوئی اختلاف نہ ہو تو وہ ایسا کرسکتا تھا لیکن اختلاف۹ رائے میں اس کی حکمتیں ہیں جنہیں اللہ رب العزت ہی جانتا ہے۔ امام ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم و فضلہ میں لکھا ہے کہ (حضرت)عمر بن عبد العزیز اور قاسم بن محمد نے نشست منعقد کی اور دونوں ایک حدیث شریف کا ذکر کررہے تھے۔ (حضرت) عمر بن عبدالعزیز ایسی بات کہہ رہے تھے جو قاسم کی رائے کے خلاف تھی ۔ اور یہ بات قاسم پر سخت گراں تھی یہاں تک کہ حدیث شریف کے بارے میں بات واضح ہوگئی۔ چنانچہ (حضرت) عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کہا: وہ کام نہ کرنا جس سے مجھے خوشی ہو۔ میری رائے میں ان کا اختلاف بہترین نعمت ہے اور یہی بات بعض اہل علم نے کہی ہے کہ مفتی کو چاہئے کہ وہ سوال کرنے والے کو اپنی رائے اور دوسرے کی رائے میں اختیار دے۔

جن علماء نے اس کے بارے میں لکھا ہے ان میں امام البھوتی الحنبلی کا نام آتا ہے ۔ انہوں نے منتہی ا لارادات کی شرع میں یہ بات لکھی ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور شیخ السلام ابن تیمیۃ نے کہا کہ حاکم کو اختیار نہیں کہ وہ ان جیسے مسائل میں دوسروں کی رائے کی مخالفت کرے اور نہ ہی کوئی عالم یا مفتی لوگوں کو اپنی رائے کا پابند بنائے۔ جب رشید نے امام مالک سے مشورہ کیا کہ اپنی رعیت کو کس قسم کے مسائل کا پابند کیا جائے تو امام مالک نے انہیں اس سے منع کردیا اور کہا کہ رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- کے صحابہ کرام دور دراز علاقوں میں پھیل گئے ہیں اور ہر قوم نے اتنا ہی علم لیا جتنا کہ اسے پہنچا ہے۔ ایک شخص نے فقہاء کے اختلافات کے بارے میں کتاب لکھی تو امام احمد نے ان سے کہا : اس کا نام کتاب ا لاختلاف نہ رکھیں بلکہ اس کا نام کتاب السعۃ رکھیں۔اس وجہ سے بعض علماء کہا کرتے تھے کہ ان مجتہدین کا قطعی حجت پر اجماع (اتفاق) اور ان کا اختلاف دونوں وسیع رحمت ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ایک ہی قول یا رائے پر متفق ہوجائےں تو ایک گمراہ آدمی ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر مجتہدین ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں ، ایک مجتہد ایک بات کہتا ہے اور دوسرا دوسری بات کہتا ہے تو مسئلہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ امام مالک کے علاوہ دوسرے ائمہ نے کہا کہ فقیہ اپنا مذھب لوگوں پر مسلط نہیں کرتا۔ (حضرت)امام شافعی کے علاوہ امر باالمعروف والنھی عن المنکر کے موضوع پر امام شافعی کے ساتھیوں اور دوسرے مصفین نے کہا کہ اس قسم کے اجتہادی مسائل میں

ہاتھ سے انکار نہیں کیا جاتا اور نہ ہی لوگوں کو اپنی اتباع کا پابند بنایاجاتا ہے بلکہ فقہاء علمی حجتوں اور د لائل سے گفتگو کرتے ہیں اور جس کو دو اقوال میں سے جو قول صحیح معلوم ہوتا ہے اسی کو قبول کرتا ہے۔ اور جس نے دوسرے مذہب کے قول کی تقلید کی تو اس کیلئے ممانعت نہیں ہے۔ ([54]) ختم شد.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

23 ۔ شرعی علوم کے علاوہ جدید علوم میں مشغول ہونا

سوال: اُس شخص کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے جسے خدشہ ہو کہ وہ شرعی علوم کے علاوہ (چھوڑ کر)ریاضیات اور فیزکس جیسے علوم میں مشغول ہوجائے۔

خلاصہ فتویٰ : جس شخص کو اس بات کا خدشہ ہوکہ وہ شرعی علوم کے علاوہ (چھوڑ کر) ریاضیات اور فیزکس اور اسی طرح کے دیگر علوم میں مشغول ہوجائے تو اسے چاہئے کہ وہ ان علوم کو ترک کردے اور شرعی علوم کے حصول میں مشغول ہوجائے۔ کیونکہ یہ زیادہ اہم اور مفید ہیں۔

اللجنہ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۱۰۳-۱۰۲/۱۲

تبصرہ:
طب (میڈیسن) انجینئرنگ ، فلکیات ، فزیکل کیمسٹری اسی طرح کے دیگرجدید علوم کا حاصل کرنا ملت اسلامیہ پر فرض لازم ہیں اور اس میں کوتاہی اُس پسماندگی (پیچھے رہ جانے) اور کمزوری کی وجہ ہے جس سے ملت اسلامیہ آج دو چار ہے۔

علمی رد:
اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿أَلَمْ تَرَى أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفاً أَلْوَانُهَا وَمِنْ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (27) وَمِنْ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَا لأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (الفاطر 27 ,28)، (اے مخاطب)کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا ، پھر ہم نے اس سے مختلف رنگ کے پھل نکالے اور(اسی طرح) پہا ڑوں میں مختلف رنگ کے راستے ہیں، بعض سفید، بعض سرخ رنگ کے اور بعض کالے اور نہایت کالے اور آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں۔ (جیسے پھلوں اور پہاڑوں میں ۔ پس)اللہ سے اس کے بندے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں ۔ فاطر :۲۷ ۔اس آیت کریمہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی

[54] مرکز فتویٰ زیر نگرانی : ڈاکٹر عبدالفقیۃ فتویٰ نمبر ۱٦۳۸۷ بتاریخ : ۱ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ.

بناء پر جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ فلکیات، فزکس ، علم کیمیا، علم نباتات ، طبقات ارض، انسانی تاریخ، نفسیات ، طب اور انسانوں سے متعلقہ دیگر علوم کے علماء اور جانوروں کے ماہر علماء ہی ہیں۔ جب وہ گہرائی ، انصاف، دیانتداری،نیک نیتی اور ارادے سے ان علوم کا مطالعہ کرتے ہیں ، انہیں حاصل کرتے ہیں تو وہ ان کی تخلیق کے اصرار و رموز سے واقف ہوتے ہیں اور اللہ رب العزت کی خلاقیت پر ایمان لاتے ہیںیا ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان علماء کی کوششوں سے وہ خود اور دوسرے تمام لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جدید علوم حاصل کرنا ملت اسلامیہ پر فرض لازم ہے۔اور اس میں کوتاہی یا کمی اس پسماندگی اور کمزوری کی وجہ ہیں جس سے ملت دوچار ہے۔ ([55])

ڈاکٹر /عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے :

انجینئرنگ، طب (میڈیسن) ،ریاضیات ،ٹیکنولوجی، فزیکس ، کیمسٹری، میکینکس وغیرہ جیسے دنیاوی علوم جو انسانی زندگی کیلئے مفید ہیں۔ ان کا حاصل کرنا فرض کفایہ ۔ بعض لوگوں کو ان میں تخصص (خصوصی مہارت) کرنا چاہئے کیونکہ اگر ان علوم کو مکمل طور پر ترک کردیا جائے تو معاشرے تباہ ہوجائےںگے اور بعض عبادتوں کی ادائیگی میں بھی تعطل پیدا ہوجائے گا۔ ([56]) واللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

24 ۔ اجنبی (دوسری اقوام) کی زبانیں سیکھنے کا حکم

سوال: اجنبی (دوسری اقوام کی) زبانیں سیکھنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا.

خلاصہ فتویٰ : اگر اجنبی (دوسری اقوام کی) زبانیں سیکھنے کی ضرورت نہ ہو تو ان کا سیکھنا مکروہ (ناپسندیدہ).

اللجنہ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء133/12

تبصرہ:

زبانیں اچھی طرح سیکھنا ان میں مہارت حاصل کرنا ، ان کے اسرار سے واقف ہونا جائز امر ہے۔ ا س میں مشغول ہونے وا لا ایک ایسے علم کے حصول میں مشغول ہوتا ہے جس کی نہ صرف قدر و قیمت اور اہمیت ہے بلکہ ثواب بھی ہے۔ بشرطیکہ نیت اچھی ہو اور اسے جائز طریقہ پر استعمال کیا جائے۔

علمی رد:

اسلام کی دعو ت دینے کیلئے مسلمانوں میں دوسری اقوام کی زبانیں جاننا نہایت ضروری ہے۔ بالخصوص آج کی دنیا میں زندگی گزارنے کیلئے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اور دوسری اقوام کی زبان کو سیکھنے سے منع کرنے والی کوئی نص نہیں ملتی۔بلکہ اس کی طرف بلانے اور اس پر زور دینے والی نصوص موجود ہیں۔

امام بخاری (حضرت) زید بن ثابت (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے یہود کی کتاب کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم فرمایا۔ یہاں تک کہ

---

[55] فتاوی دار ا لافتاء المصریۃ: الموضوع: (٦٢) حدیث: المفتی شیخ عطیۃ صقر: مئی ١٩٩٧ء ۔ جو شخص علم اور اس کی مختلف شاخوں کے بارے میں اسلام کا مؤقف جاننا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کا مطالعہ کرے۔

56 مرکز فتویٰ زیر نگرانی ڈاکٹر /عبداللہ الفقیہ: فتویٰ نمبر ۴۹۷۳۹ بتاریخ : ٢١ ربیع الثانی ١۴٢۵ھ

میں نے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے فرامین لکھے۔ اور ان کی (یہود)جانب سے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے نام آئی تحریروں کو پڑھ کر سنایا۔ اور ابو جمرہ نے کہا میں ابن عباس اور لوگوں کے درمیان ترجمہ کیا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے حاکموں کیلئے ترجمہ کرنے والوں کا ہونا انتہائی ضروری اور ناگزیر ہے۔

جب (حضرت) زید مدینہ شریف تشریف لائے تو رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کو ان کا مدینہ شریف آنا پسند آیا کیونکہ وہ اکثر قرآن کریم کے حافظ تھے۔ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اُن سے فرمایا: " تعلم کتاب یھود، فإنی ما آمن من یھود علی کتابی"، یہود کی کتاب (تحریر) سیکھو، مجھے اپنی تحریر کے بارے میں یہودیوں پر بھروسہ نہیں۔ چنانچہ آ پ نے آدھے مہینے یعنی ۱۵ دن میں یہ زبان سیکھ لی اور یہودیوں کے نام آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے فرامین لکھے۔ اور جب انہوں نے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کو تحریر بھیجی تو اُسے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی خدمت میں پڑھ کر سنایا۔

چنانچہ (حضرت) زید نے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے حکم پر عبری اور سریانی زبانیں سیکھیں ۔ کیونکہ ان زبانوں کی ضرورت تھی۔ علماء کرام نے زبان کو اچھی طرح سیکھنے اور صحیح ترجمہ کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ تاکہ احکام اور قضیوں کے بارے میں یہ ترجمہ دستاویز کی مانند اور موسوخ ہو۔

اس کی روشنی میں یقین دھانی ہوتی ہے کہ زبانوں کو اچھی طرح سیکھنا اور ان کے اصرار ورموز سے واقف ہونا جائز امر ہے اور اس کے حصول میں مشغول رہنے وا لا شخص درحقیقت ایسے علم کے حصول میں مشغول رہتا ہے جس کی قدر و قیمت ، اہمیت اور جس کے حاصل کرنے پر ثواب ہے۔ بشرطیکہ سیکھنے والے کا قصد و ارادہ اور اس کا استعمال جائزہو۔([57])

ڈاکٹرعبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے: ضرورت ہو تو انگریزیں اور اسی طرح کی دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی حرج نہیں اوراگرمعاشرےکےبعض مفادات انہیں زبانوں پرموقوف ہو ں تو ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہوجاتا ہے۔ ([58]) واللہ اعلم۔

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

25۔ وضعی (انسانوں کے وضع کردہ) قوانین کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم

سوال: وضعی (انسان کے وضع کردہ)قوانین کی تعلیم حاصل کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ : تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں میں وضعی قوانین کی تعلیم کو عام کرنا جائز نہیں بلکہ اسے خاص لوگوں تک محدود رکھنا چاہئے تاکہ وہ حق سے انحراف (ہٹ جانے) کی نشاندہی کریں۔

---

[57] فتاوی دار الافتاء المصریۃ : الموضوع (۳۲۸) المفتی: فضیلۃ الشیخ عطیۃ صقر : مئی ۱۹۹۷ء۔

[58] ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ نمبر : ۵۱۳۱۱ بتاریخ : ۲ جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ۔

اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۳۵۔۳۴/۱۲

تبصرہ:

وضعی قوانین بھلائی اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون ، ظلم دور کرنے ، حق کو باطل سے نمایا کرنے کی خاطر تقابلی مطالعہ جیسے صحیح مقاصد اور غرض کیلئے پڑھے اور پڑھائے جائے تو اس میں کوئی حرج یا ممانعت نہیں۔

علمی رد:

اگرکلیات قانون (Law Faculties of) کے مضامین کو بھلائی اور نیک کاموں میں باہمی تعاون، حق تک رسائی اور ظلم دور کرنے ، انسانی حقوق و فرائض کی معرفت یا انکے اور شریعت کے درمیان موازنہ کیلئے استعمال کیا جائے تا کہ باطل کے مقابلے حق واضح ہو جائے اور شریعت اسلامی کی برتری ظاہر ہو تو یہ جائز ہے. پڑھنے اور پڑھانے والے کی نیت کے مطابق انہیں ثواب دیا جاتا ہے۔ اور حق وہ ہے جو شریعت نے اپنے معروف مصادر میں بیان کیا ہے ۔ قوانین کی تعلیم حاصل کرنے والوں کوعمومی طور پر اس آیت کریمہ سے متنبہ رہنا چاہیے: ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (ا لمائدہ ۴۴)، اور جواللہ کے اتارے پر حکم نہ کرےں وہی لوگ کافر ہیں۔ ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ ایک اور آیت میں ہے: ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ تووہی لوگ فاسق ہیں (المائدہ ۴۵۔۴۷) ([59]).

﴿وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا﴾ (النساء ۱۰۷)، اور ان کے طرف سے نہ جھگڑوں جو اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کسی بڑے دغا باز ،گنہگار کو : ۔اس کے بعد کی آیت کریمہ میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُعَلَيْهِمْ وَكِيْلًا﴾ (ا لنساء ۱۰۹)، اے لوگوں ! تم آگاہ ہو تم نے خیانت کرنے والوں کی طرف سے دنیا کی زندگانی پر جھگڑا کیا پس کون جھگڑے گا اللہ سے ان کے بدلے قیامت کے دن یا کون ہے کہ ان کا کارساز ہوگا۔ اور رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی حدیث شریف جو ابو

59 فتاویٰ دار ا لافتاء المصریۃ : الموضوع (٣٦): المفتی فضیلت الشیخ عطیۃ صقر مائی ۱۹۹۷ئ.

داؤد اور طبرانی نے اسناد جید سے روایت کی ہے: "من خاصم في باطل وهو يعلم -وفي رواية أو أعان عليه -لم يزل في سخط الله حتى ينزع"، اس کا مفہوم ہے ، جس نے جانتے ہوئے باطل کیلئے جھگڑا کیا ، ایک دوسری روایت میں ہے ، جس نے جانتے ہوئے باطل کی مدد کی اس وقت تک اللہ رب العزت کے غضب میں رہتا ہے جب کہ وہ اس سے مکمل طور پر باز نہیں آتا۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے.

ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے:

وضعی قوانین کی درس و تدریس اگر صحیح مقصد کیلئے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ اس کی تعلیم کا مقصد اس سے واقف ہونا ہو۔ تاکہ اس کا پڑھنے والا شرعی احکام کی ان قوانین پر برتری اور فضیلت سے واقف ہو یا ان معلومات سے خود استفادہ کرے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے جو شریعت مطہرہ کے خلاف نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اس کی تعلیم حاصل کرنے والا اس میں اتنا مشغول نہ ہوجائے کہ یہ فرائض عین کی تعلیم اور خود اس پر واجب امور کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے۔ علاوہ ازیں شریعت کے مخالف قوانین کو برا سمجھے اور اس سے بغض رکھے۔ ([60]) واللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

60 ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ: فتویٰ نمبر ۱۰۹۴۲بتاریخ: ۲۹ رجب ۱۴۲۲ھ.

باب سوئم بدعت اور اسکا اطلاق

26- حقیقت بدعت
سوال: بدعت کی حقیقت اور بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: تمام بدعتیں گمراہیاں ہیں اور بدعت حسنہ نہیں ہے۔
اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 321/2

تبصرہ:
بدعت وہ عمل ہے جو عصر نبوت اور صحابہ کرام کے عہد کے بعد شروع کیا گیا ہو جمہور علماء کا کہنا کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں بدعت ھدایت اور بدعت گمراہ ۔ اور جو چیز بھی شریعت کے خلاف ہو وہ مذموم ہے ۔ اور جو شریعت کے مطابق وہ بھلائی ہے اور بدعت صرف مذہبی امور میں ہے جہاں تک دنیاوی امور کا تعلق ہے تو انہیں عصر حاضر کی ترقی کی ہمرکابی کیلئے چھوڑ دیا جائے۔

علمی رد:
بدعت عصر نبوت کے بعد میں شروع کردہ نئے مذہبی امور ہیں بدعت کی دو قسمیں بدعت ھدایت اور بدعت گمراہ .
اگر یہ عمومی طور پر اللہ اور اسکے رسول کے حکم کے خلاف ہو تو مذموم ہے ، اور جسکی جانب اللہ اور اسکے رسول – صلی اللہ علیہ و سلم – نے بلایا ہے وہ خیر ہے۔
نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : "من سن سنة حسنة كان له أجرها وأجرمن عمل بها" وہ جس کسی نے اچھے طریقے کی ابتدا کی تو اسکیلئے اسکا اور اس پر عمل کرنے والے کا ثواب ہے۔ اور اسکے بر عکس فرمایا : "من سن سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها" جس کسی نے برے طریقے کا آغاز کیا تو اس پر اسکا اور اس (برائی) پر عمل کرنے والے کا گناہ ہے ۔
بدعت حسنہ کی مشروعیت پر حضرت عمر – رضی اللہ عنہ – کا یہ قول د لالت کرتا ہے ۔ "نعمت البدعۃ ھذہ " یہ کتنی اچھی بدعت ہے اور یہ آپ – رضی اللہ عنہ – کا لوگوں کو نماز تراویح میںجمع کرنے کیلئے ہے ۔ یہ نیک اعمال میں سے ہے اور تعریف کے زمرے میں آتی ہے آپ – رضی اللہ عنہ – نے اسے بدعت کام دیا ہے اور اسکی تعریف فرمائی ہے۔ کیونکہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – انکے لئے سنت نہیں بنایا اور نہ ہی لوگوں کو تراویح کے لئے جمع فرمایا ،اور نہ ہی یہ حضرت ابو بکر صدیق کے زمانے تھیں جبکہ حضرت عمر – رضی اللہ عنہ – اس بر لوگوں کو جمع کیا اور انہیں اسکی طرف بلایا . اس وجہ سے انہوں نے اسے بدعت کہا : در حقیقت یہ سنت ہے ۔ کیونکہ یہ شریعت کے مطابق اچھا عمل ہے ایک دوسری حدیث شریف " كل محدثة بدعة" (ہر نئی چیز بدعت ہے) سے مراد وہ نئی بات ہے جو شریعت کے اصول کے مخالف اور سنت کے مطابق نہ ہو ، اور اکثر عرف میں نئی بات مذمت کے مفہوم ہی میں استعمال کی جائی ہے جبکہ مذموم بدعت دین میں ہے ہی نہیں ۔ جہاں تک دنیاوی امور کا تعلق ہے تو اسکے بارے میں لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں ۔

اس طرح بدعت کی تعریف میں ممدوح اور مذموم شامل ہیں. حضرت امام شافعی ، امام غزالی ، العز بن عبدالسلام اور جمہور نے کےنزدیک بدعت کی کئی قسمیں ہیں :

واجب : جیسے عربی علوم کا وضع کرنا اور انکی تعلیم دینا۔

مندوب : جیسے سکولوں اور مدارس کا قیام۔

ممنوعہ : جیسے قرآن کریم غلط پڑھنا جس سے اسکے الفاظ عربی حالت سے بدل جائیں۔

مکروہ : جیسے مساجد بر نقش و نگار بنانا۔

مباح : جیسے دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے رکھنا ۔

ایک قوم کا خیال ہے کہ بدعت ہر حال میں مذموم ہے اور اسکی تقسیم میں واجب ، مندوب اور مباح نہیں آتے اور یہی اس حدیث (كل بدعة ضلالة) کا مفہوم ہے ۔ صحیح تو پہلی بات ہی ہے جس پر جمہور ہیں. اسکے ساتھ یہ تاکید کہ بدعت ان امور تک محدود ہو جنکا تعلق دین سے ہے .اور دنیاوی امور عصر حاضر کی ترقی کی ہمرکابی کیلئے چھوڑ دئیے جائیں اور حکم حقیقت پر لگایا جاتا ہے نہ کہ ناموں پر جیسے سالگرہ منانا جائز ہے کہ نہیں ، اور یہ کہ کسی بات پر اتفاق ہو جائے کہ یہ برائی ہے تو اسے حکمت اور عمدہ نصیحت سے بدلنا چاہیے ۔ اور کسی اختلاقی امر کی خاطر لڑائی جھگڑا یا تنازع نہیں ہونا چاہئے اور جو شخص اپنی رائے یا گمان سے دھوکے میں مبتلا ہو اور اسکا یہ اعتقاد ہو کہ وہی اکیلا نجات پانے وا لا ہے اور دوسرے ھلاک ہونے والے ہیں تو وہ سب سے پہلے ھلاک ہو نیوا لا ہے ([61]).

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

61 امام مسلم نے روایت کی ہے 6850 ۔ حضرت ابو ھریرہ – رضی اللہ عنہ – نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : اگر کوئی شخص کہے کہ لوگ ھلاک ہو گئے تو وہ ان میں سب سے پہلے ھلاک ہونے وا لا ہے۔

27- پرچم کو سلام کرنے کا حکم
سوال: پرچم کو سلام کرنے کے حکم کےبارے میں د ریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوي: پرچم کو سلام کرنا جائز نہیں بلکے یہ نئي دریافت ہے۔
اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۱۵۰/۱

تبصرہ:
پرچم کو ترانے کے ساتھ سلام کرنا یا وطن سے وفاداري کے اظھار کي معین حالت میں اسکي طرف ہاتھ سے اشارہ ، احترام کے طور پر اسکے اطراف جمع ہونا اور اسکے حفاظت کي خواہش یہ سارے امور اسکی عبادت کرنے کے مفہوم میں نہں آتے۔ یہاں تک کھ یہ بھي کہا جاتا ھے کے یھ بدعت یا غیر اللہ سے تقرب ہے۔
علمي رد:
عصر جدید میں پرچم وطن کي علامت ہےاور عربون کے یہان یھ قبیلے یا جماعت کے علامت ہوتی تھی اور وہ (جماعت یا قبیلھ) اسے اپنے آگے رکھتا تھا اور قبیلے یا جماعت کا ھر فرد اسکي حفاظت کرتا تھا، پرچم کي بلندي قوم یا جماعت کي سر بلندي اور اسکا سر نگون هونا قوم کي ذلت پر د لالت کرتا تھا۔ عربون کے ہان پرچم(الرایھ یا اللواء) کے نام سے معروف تھا۔
کہا گیا ہے کھ غزوۂ تبوک مین حامل اللوا یعني علم بردار حضرت زید بن حارثھ تھے اور جب آپ شھید ہو گئے تو حضرت جعفر بن ابي طالب نے فورا اسے تھام لیا آپ لڑتے رہے یہان تک کہ وہ بھي شھید ہو گے اسکے بعد عبد اللّٰہ بن رواحھ نے علم سنبھا لا اور وہ لڑتے رہے یہان تک کھ وہ بھي شھید هو گئے تو پرچم حضرت ثابت بن ارقم العجلاني نے سنبھا لا اسے حضرت خالد بن ولید کے پاس لے گئے اور انکي اہلیت کے باعث انکے حوالے کر دیا گیا اسي طرح یھ بھي بیان کیا گیا ھے کے جب حضرت جعفر کا دایان بازو کٹ گیا تو آپ نے اسے اپنے دانتون سے تھام لیا پھر شھید ہو گئے رسول کریم نےآپ کے لئے دعا فرمائي کھ اللہ انکو جنت مین دونون ہاتھون کي جگھ دو پر عطا فرمائے اسي وجہ سے آپکو جعفر الطیار کا نام دیا گیا۔
اگر پرچم یا لواء کا احترام صحابھ کرام اور سلف صالح سے منقول ہے تو پرچم کو سلام کرنا مذکورہ احترام سے بڑھ کر نہین ھے اور اس عمل کو بدعت مذموم نہین کہا جا سکتا مذموم صرف قرآن اور سنت کي نصوص کي مخالفت کي صورت مین ہي ہوگا۔
داکٹر یاسر عبد العظیم

28- یوم ولادت منانے کا حکم
س: یوم ولادت کا جشن منانے کے حکم کے بارے مین دریافت کیا گیا؟

خلاصھ فتویٰ: یوم ولادت کا جشن منانا جائز نہین یھ مذھب مین بعد مین آئي بدعت ھے
الشیخ ابن باز مجموعھ فتاوے اور مقالات 4 /۸۱
الشیخ یاسر برھامي www.alsalafway.com

تبصرہ:
اس زمانے مین جشن یوم ولادت منانا جائز ھے کیونکہ نوجوان ان دیگر جشنون کي بھتات جو مذھبي مناسبات پر چھا رھے میں اپنے مذھب اور اباو اجداد کوتقریبا بھلا رہے ہین اس وجہ سے مرد عورت کے اختلاط کھانے پینے مقابلے کھیل اور اللہ کے گھر کے عدم احترام جیسے

تمام ممنوعہ اعمال ، مذهب اور ادب كي منافي ہر بات سے دور رہتے ہوے و لادت منانا جائز ہے .

علمي رد:

بہت سے علما نے کئي بدعات کے باعث يوم و لادت کے جشن کا انکار کيا ہے يہانتک کہ انہون نے يوم و لادت منانے ہي کا بنيادي طور پر انکار کار ديا ہے اور نوين صدي لوگون کے درميان جائز اور نا جائز کے مختلف احکام لے کر آئي، امام سيوطي ابن حجر اور هيثمي نے جشن يوم و لادت کو پسنديده بتايا ہے۔ اور اس موقع پر کيجا نيوالی بدعت کا انکار کيا ہے۔

انکے راے کی بنياد سورة ابراهيم کی يہ آيت کريمہ ہے: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ﴾، ترجمہ: اور انہيں الله کے دنوں کی ياد دلاؤ (جو ان پر اور پہلی امتوں پر آچکے تھے۔

اور ايام الله الله رب العزت كي نعمتين اور اسكي قوتين هين۔ اور رسول الله الله كي سب سے بڑي نعمت ہے صحيح مسلم مين حضرت ابو قتاده سے روايت هے انهون نے کها نبي اكرم سے پير کے دن کے روزه کے بارے دريافت کيا گيا تو آپ نے فرمايا: "ذَاكَ يَوْمٌ وُلِدْتُ فِيهِ وَيَوْمٌ بُعِثْتُ أَوْ أُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ"، وه اس لئے کہ اس دن مين پيدا ہوا ا ور اس دن مين مبعوث کيا گيا اس دن مجھ پروحی نازل كي گئي" يہ رسول الله كي طرف سے تعليم ہے کہ بھلائيون اور اسكي اطاعت کر کے اپنے اور الله رب العزت كي نعمتون کا شکريہ ادا کرين۔

نبي كريم كي و لادت با سعادت اور ہدايت ہم پرالله رب العزت كي نعمت ہے اس وجہ سے شريعت کے اصول کے مطابق اس کا جشن منانا الله رب العزت کے حضور شکر ادا کرنا ہے۔ ليکن محض مخصوص رسوم كي ادائيگي نہ ہو بلکہ اطراف کے لوگون مين اس جشن کو پھيلايا جائے ، جائز طريقون سے الله رب العزت سے قربت حاصل كي جائے اور لوگون کو اس كي فضيلت سے واقف کرايا جائے اور شرعا ممنوعہ باتون سے اجتناب کيا جائے۔ جہان تک کھانون كي عادات کا تعلق ہے تو يہ الله رب العزت کے اس فرمان کے ضمن مين آتي ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ﴾ (البقرة 172)، ترجمہ: اے ايمان والو! ان پاکيزه چيزوں ميں سے کھاؤ جو ہم نے تمہيں عطا کی ہيں اور الله کا شکر ادا کرو.

چنانچہ اس زمانہ مين جشن و لادت منانا جائز ہے جس مين نوجوان ان ديگر جشنون كي بھتات مين جو مذهبي مناسبات پر چھا رہے ہين اپنے آباو اجداد کو تقريبا بھلا رہے ہين اس وجہ سے مرد و عورتون کا مشکوک حالتون مين ايک جگہ جمع ہونا کھانے پينے مقابلے ناجائز اعمال کے مواقع اور الله رب العزت کے گھر كي بے حرمتي جيسے تمام ممنوعہ، اعمال اور مذهب و ادب کے منافي ہر بات سے دور رہتے ہوے يوم و لادت منانا جائز ہے۔ اور اگر ان غير شرعي امور کا غلبہ ہو جائے تو فساد کو روکنے کے لئے جشن منانا بہتر ہے۔ جيسا کے اصول تشريع سے ثابت ہوتا ہے اگر مثبت امور اور جائز منفعتين زياده ہون تو استطاعت کے مطابق آگهي اور منفي باتون کو روکتے يا انکي حد بندي کرتے ہوئے ان جشنون کے منانے مين کوئي ممانعت نہين هے۔ بہت سے اچھے اعمال مخالف باتون سے خراب ہو جاتے ہين خواه يہ کسي حد تک ہون مجموعي طور پر مطلوب اور جائز طريقون سے اچھي باتون کا حکم دينا اور برائي سے روکنا ہے۔

امام زرقاني، قسطلاني كي كتاب المواهب اللدنيہ كي شرح مين لکھتے ہين کہ قرآن کريم كي قرات کے امام ابن حزري متوفى سن ٨٣٣ھ نے امام بخاري اور دوسرون كي روايت کرده ابو لهب كي اس خبر پر کہ اس نے رسول الله - صلى الله عليہ وسلم- كي و لادت كي خوشخبري لانے والي اپني کنيز ثوبيہ کو آزاد کر ديا تھا تو الله نے جهنم مين اس پر عذاب کم کر ديا ۔ اس پر تبصره

کرتے ہوئے لکھا یھ کافر جس کي قرآن کریم نے مذمت کي ہے اگر رسول اللہ - صلی اللہ علیھ وسلم- کي شب و لادت اس کے خوش ہونے پر جہنم میں اس پر عذاب کم ہو تا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتي اللہ رب العزت کي واحدانیت پر ایمان لانے والے مسلمان کي کیا شان ہوگي جب وہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کي و لادت با سعادت پر خوش ہو اور آپ کي محبت مین اپني قدرت و استطاعت کے مطابق خرچ کرنا ہو۔
حافظ شمس الدین محمد بن ناصر اپنے اشعار مین کھتے ہین جنکا ترجمہ ہے:
اگر یھ کافر جس کي مذمت آئي ہے اور وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دونون ھاتھون سے ہمیشھ جہنم مین ہو ، جب بھي پیر کا دن آتا ہے تو رسول اللہ - صلی اللہ علیھ وسلم- کي و لادت پر خوش ہونے کي وجہ سے .
ہمیشھ اس پر عذاب کم ہو جاتا ہے ، تو اس بندے کے بارے مین کیا خیال ہےجو اپني پوري زندگي احمد سے خوش رہا اور موحد مرا۔
ابن اسحاق نے ترجیح دي ہے کہ رسول اللہ- صلی اللہ علیھ وسلم- کي و لادت با سعادت عام الفیل کے ماہ ربیع ا لاول کي بارہ تاریخ کي شب ہوئي تھي اور انھون نے ابن ابي شیبہ سے انہون نے حضرت ابن عباس اور ان دونون کے علاوہ دوسرون سے بھي روایت کي ہے۔ اور کھا لوگون کے نزدیک یہي مشہور ہے۔ اور مؤلف کتاب تقویم العرب قبل ا لاسلام نے فلکي حساب سے بہت ہي دقیق تحقیق کر کے بتایا ہے کہ رسول- صلی اللہ علیھ وسلم- کي و لادت باسعادت بروز پیر ماہ ربیع ا لاول کي ۹تاریخ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ کے دن ہوئي تھي۔ دیکھئے الحاوي للفتاوے للسیوطي مجلہ الھدایہ شائع تونس ماہ ربیع ا لاول ۱۳۹۴م۔([62])
ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

۲۹- مذھبي اور قومي عید دن اور مناسبات کو منانے کا حکم
سوال: مذہبي اور قومي عید دن اور مناسبات کو منانے کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: مذہبي مناسبات کے علاوہ دوسري مناسبات کا منانا جائز نہیں۔ صرف ان عید کا منانا جائز ہے جنکے منانے کا شرعي طور پر ذکر موجود ہے۔ مثال کے طور عید الفطر اور عید ا لاضحے۔
عید مادر: قومي دن اور سالگرہ یہانتک کہ اسرا اور معراج جیسے ایام مساجد کے افتتاح اسیطرح کے دیگر ایام منانا جائز نہیں۔ یہ بدعت اورمذہب میں بعد کي پیدہ کردہ چیزیں ہیں۔
اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ج 3/59-61
تبصرہ:
کسي مناسبت کا جشن منانا اچھا ہے اسمین کوئي حرج نھیں جبکہ مقصد جائز اور منانے کا طریقہ مذہب کے دائرے میں ہو۔ جشن کو عید کا نام دینے میں کوئي نقصان نہیں۔ نصیحت اعلے کامون میں ہے نامون مین نہین۔ اور ہر نئي بات بدعت مذموم نہیں۔ حضرت عمر نے مسلمانون کے ایک بڑے مجمع میں ایک امام کے پیچھے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا یھ کتني اچھي بدعت ھے۔

62 فتاوے دارا لافتا المصریہ۔ موضوع ۹۲۔ مفتي فضیلہ الشیخ عطیہ صقر۔ مئي ۱۹۹۷م۔

علمي رد:
عيدون کا لفظ ہر آدمي کے بارے میں بولا جاتا ہے جو واپس اور بار بار آتي هے اور غالبا یہ جماعت کي سطح پر ہوتي ہے خواہ یہ خاندان ہو یا اہل گاوں یا اہل قلم۔ ان عیدون پر جشن منانے کا مفہوم انہیں اہمیت دینا ہے۔ اور جن مناسبات کا جشن منایا جاتا ہے یه محض دنیوي بھي ہوتی ہیں اور دیني بھي۔ مذہب اسلام دنیوي جشن کو منع نہیں کرتا بشرطیکہ انکا مقصد اچھا ہو اور اسکے مظاہر شریعت کي حدود میں ہوں۔ جہانتک مذہبي جشن کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض مقرر ہیں جیسے عید الفطر اور عید الاضحے۔ اور بعض غیر مقرر ہیں جیسے ہجرت اسرا اور معراج اور عید میلاد النبي۔ جو عیدیں غیر مقرر ہیں انہیں اسي طریقہ سے منایا جائے جو شریعت نے بتایا ہے اور انہیں شریعت کي حدود سے باہر نہیں ہونا چا ہئے۔
جہانتک غیر مقرر عیدون کا تعلق ہے تو انکو منانے کے بارے میں لوگوں کے دو مواقف ہیں ایک موقف منع کا ہے کیونکہ یه بدعت ہے اور ایک موقف جائز ہونے کا ہے۔ کیونکے ممانعت کے بارے میں کوئي نص یعني عبارت نہیں ہے۔
ممانعت کے حامي امام نسائي اور ابن حبان کي صحیح سند سے روایت کردہ اس حدیث شریف کو حجت بناتے ہیں کہ حضرت انس نے کہا: نبي کریم - صلی الله علیه وسلم- مدینہ شریف تشریف لائے اور انکے لئے دو دن تھے جنمیں وہ کھیلتے تھے۔ سو آپ - صلی الله علیه وسلم- نے فرمایا: "قَدْ أَبْدَلَكُمْ اللَّهُ بِهِمَا خَيْرًا مِنْهُمَا يَوْمَ الْفِطْرِ وَيَوْمَ الْأَضْحَى"، ترجمہ: الله رب العزت نے تمهارے لئے ان دو دنوں کو ان سے بہتر دوسرے دو دنون سے بدل دیا، یوم الفطر اور عید الاضحے۔
اس بنیاد پر ان دو عیدوں کے علاوہ دوسري جتنی عیدیں ہیں وہ بدعت ہیں اسکا جواب یہ دیا جاتا کہ حدیث شریف نے عیدون کو ان دو عیدون میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اہل مدینہ کي عیدوں جو انہوں نے فرس سے لي تھي ان دو عیدوں کي افضلیت بیان کي گئي اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ یوم جمعہ کو عید کا نام دیا گیاہے۔
اور ان دو عیدون کے علاوہ کسي اور دن خوشي اور مسرت کو منع کرنے والي کوئي عبارت وارد نہیں ہوئي، قرآن کریم میں سورۃ روم کے آغاز میں روم کي فتح و نصرت کي خاطر دوسري اقوام پر الله رب العزت کي مدد پر مسلمانون کي خوشي کو بیان کیا هے، جبکے روم مغلوب تھے، اور جیسا کہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہر نئي بات بدعت مذموم نہیں ہے، حضرت عمر نے ایک امام کي اقتدا میں نماز تراویح کے بارے میں مسلمانوں کے اجتماع سے فرمایا: یہ کتني اچھي بدعت ہے۔
خلاصہ کلام یہ ہے: کسي بھي اچھي مناسبت کا جشن منانے میں کوئي حرج نہیں بشرطیکہ اسکا مقصد جائز اور اسلوب مذہب کي حدود میں ہو اور جشن کو عید کا نام دینے میں بھي کوئي نقصان نہیں هے، کیونکہ نصیحت اعلے کاموں میں هے ناموں میں نہیں۔
شیخ سلمان عودہ کے نزدیک ولادت پر ایک سال گزرنے کا جشن یعني سالگرہ منانا جائز ہے، انہوں نے یہ بھي کہا، ولادت پر ایک سال گزرنے یا انسان کے کسي بھي خوشي کے موقع مثال کے طور پر شادي پر ۲۰ سال گزرنے کا جشن منانا جائز ہے اور وہ ولیمہ کي تقریب منعقد کرے جسمیں وہ رشتہ داروں اور دوستوں کو مدعو کرے، شیخ عودہ نے ام بي سي چینل پر ،، الحیاۃ کلمہ ،، کے زیر عنوان اپنے پروگرام میں مزید کہا، اس جشن کو عید کا نام دینے کا حکم پہلے سے معروف ہے، اور وہ ممانعت کا ہے، اور سا لانہ مناسبات کا جشن عید کي اصطلاح کا ذکر کئے بغیر منانا جائز هے، جیسے ولادت کي مناسبات ایک سال گزرنے کي مناسب کا جشن یا شادي پر ۲۰ سال هونے کي مناسبت اسیطرح کي دیگر مناسبات کا جشن منانا جائز ہے۔

شیخ عوده نے لفظ عید سے بچنے کي ضرورت کي دعوت دي ہے جو شریعت اسلام کے منافي ہے، جیسے شریعت اسلام مسلمانوں کے لئے سال میں دو عیدیں مقرر ہیں۔

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

30۔ صالحین اولیاء کرام کے مزارات کي زیارت کے لئے سفر کا حکم

سوال: اولیاء کرام کے مزارات کي زیارت کے لئے سفر کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: مزارات کي زیارت کے لیے سفر کرنا منکر ہے ایسا کرنا جائز نہین۔
الشیخ ابن باز مجلہ البحوث شمارہ **۳۹** صفحہ **۱۴۳۔۱۴۵**۔

تبصرہ:
صالحین اولیاء کرام خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں کي زیارت کے لئے رخت سفر باندھنے اور سفر کرنے میں کوئي حرج نہیں۔

علمي رد:
امام بخاري اور امام مسلم نے روایت کي ہے کہ آپ- صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: " لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِي هَذَا وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى"، ترجمہ: تین مسجدوں کے سوا اور کسي طرف سفر نہ کیا جائے، مسجد بیت اللہ، مسجد مقدس اور میري یہ مسجد، رخت سفر باندھنے کو ان **۳** میں محصور کرنا، کسي بھي جائز کام مثال کے طور پر جہاد، حصول علم، اللہ رب العزت کے فضل رزق کي تلاش، بھائیوں سے ملاقات، صلہ رحمي کے علاوہ قرب حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا منع نہیں ہے اور قرآن کریم اور حدیث شریف میں ان سب کے بارے ٹھوس د لائل موجود ہیں۔
حدیث شریف میں **۳** مساجد کا تعین، درحقیقت دوسري مساجد کے مقابلے میں اضافي تعین ہے، یعني ادائیگي نماز کے لئے تمام مساجد افضلیت میں برابر ہیں سوائے ان **۳** مساجد کے، چنانچہ یہ افضل ہیں اور ان میں نماز کا ثواب زیادہ ملتا ہے۔
امام احمد اور امام ابن ماجہ نے **۲** صحیح اسناد سے روایت کي ہے کہ: "أن الصلاة في المسجد الحرام بمكة تعدل مائة ألف صلاة فيما سواه" مکہ مکرمہ میں مسجد حرام میں **۱** نماز کا ثواب دوسري مسجد کے مقابلے میں **۱** لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے، امام بخاري اور امام مسلم نے روایت کي ہے کہ: "أن الصلاة في مسجد المدينة بألف صلاة فيما سواه إلا المسجد الحرام"، مدینہ منورہ کي مسجد میں **۱** نماز کا ثواب سوائے مسجد حرام کے دوسري مساجد کے مقابلے **۱** ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔
امام بزار نے سند حسن سے روایت کي ہے کہ مسجد اقصے میں **۱** نماز کا ثواب **۵۰۰** نماز کے ثواب کے برابر ملتا ہے، امام احمد اور ابن ابي شیبہ کي سند حسن سے روایت کردہ حدیث میں یہ ہے ان تینوں مساجد کي افضلیت کي وجہ سے ان میں ادائیگي نماز کے لئے سفر کیا جائے۔

حضرت ابو سعيد خدري سے مرفوع حديث روايت كي جاتي ہے: " لا ينبغي أن تشد رحالها إلى مسجد يبتغى فيه الصلاة غير المسجد الحرام ومسجدي هذا والمسجد الأقصى "
كہ كسي مسجد ميں ادائيگي نماز كے لئے رخت سفر باندھا جائے سوائے مسجد حرام اور ميري اس مسجد اور مسجد اقصے كے۔
اس بنياد پر ہے كہ ان ميں نماز كا ثواب زيادہ حاصل كرنے كي خاطر انكي طرف سفر كرنا جسماني اور مالي مشقت برداشت كرنا جائز يا كم از كم منع نہيں ہے، جہاں تک دوسري مساجد كا تعلق ہے تو صرف نماز ادا كرنے كي خاطر سفر كرنے اور مشقت برداشت كرنے كي ضرورت نہيں، بلكہ بعض علماء نے كہا: اس سے منع كيا جاتا ہے۔ ديكھئے خلاصہ الوفاء از سمہودي، ص ٧٠۔
جہاں تک صالحين خواہ وہ زندہ ہوں يا اس دنيا سے پردہ فرما چكے ہوں كي زيارت كے لئے جانے كا تعلق ہے تو اس كے لئے رخت سفر باندھنے اور سفر كرنے ميں كوئي حرج نہيں ہے۔ ([63])

ڈاكٹر ياسر عبدالعظيم

31- نبي كريم صلى الله عليه وسلم كے روضہ اطہر پر حاضري دينے كے لئے سفر كرنے كا حكم

سوال: نبي كريم - صلى الله عليه وسلم- كے روضہ اطہر پر حاضري دينے كے لئے سفر كرنے كے حكم كے بارے ميں دريافت كيا گيا؟

خلاصہ فتوى: رسول - صلى الله عليه وسلم- كے روضہ اطہر كي زيارت كے لئے سفر كرنا نعوذ بالله جائز نہيں ہے۔ اسي طرح ان پر بني ہوئي عمارتوں كو مسجد بنانا يا وہاں نماز ادا كرنا يا مردوں كو دفن كرنا جائز نہيں ہے۔

الشيخ ابن جبرين فتاوے في التوحيد ص **٢٣ - ٢٥**

تبصره:

سرور كونين - صلى الله عليه وسلم- كے روضہ اطہر كي زيارت قبروں كي زيارتوں ميں سب سے زيادہ مستحب ہے، قبروں كو مساجد بنانا يعني الله رب العزت كي عبادت كي غرض سے وہاں اور ان ميں جو ہيں كي طرف جانا مستحب ہے۔

علمي رد:

نبي كريم - صلى الله عليه وسلم- كے روضہ اطہر كي زيارت يا زيادہ صحيح طور پر يہ كہ آپ - صلى الله عليه وسلم- روضہ اطہر ميں آپ - صلى الله عليه وسلم- كي زيارت، تمام مزاروں كي زيارت ميں سر فہرست مستحب ہے، اور زيارت كے مقصد سے سفر كي غايت آپ - صلى الله عليه وسلم- كے روضہ اطہر كے ساتھ مدينہ شريف كي مسجد ہے اور زائر كا قصد اس ذات اقدس كي تعظيم ہے جو وہاں موجود ہے، جس طرح كہ آپ - صلى الله عليه وسلم- ظاہري زندگي ميں تھے اور قصد بعينہ بقعہ قبر نہيں بلكہ انكي تعظيم مقصود ہے جو وہاں ہيں، اور آپ - صلى الله عليه وسلم- كي مسجد كي زيارت درحقيقت آپ ﷺ كي زيارت ہے، جسكي افضليت كے بارے آپ - صلى الله عليه وسلم- كا يہ فرمان مبارک ہے: "صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ أَوْ كَأَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنْ الْمَسَاجِدِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ"، ترجمہ:

63 فتاوے دارا لافتاء المصريہ، موضوع **٥٥** مفتي فضيلہ الشيخ عطيہ صقر مئي ١٩٩٧م۔

ميري اس مسجد ميں نماز دوسري مسجد كي ہزار نماز سے بہتر ہے، سوائے مسجد حرام كے.
اور انبياء و صالحين كے مزارات كي زيارت مستحب ہے، قاضي عياض نے اپني كتاب :الشفا في التعريف بحقوق المصطفے ميں امام مالک بن انس كے بارے وہ واقعہ بيان كيا ہے جب ابو جعفر المنصور نے مسجد نبوي ميں ان سے مناظرہ كيا تھا، امام مالک نے ان سے كہا: اے امير المؤمنين اس مسجد ميں اپني آواز بلند نہ كرين، پس اللہ تعالے نے ايک قوم كو يوں ادب سكھايا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمايا: ﴿لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (الحجرات 2)، ترجمہ: تم اپنی آوازوں کو نبیِ مکرّم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور اُن کے ساتھ اِس طرح بلند آواز سے بات (بھی) نہ کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے بلند آواز کے ساتھ کرتے ہو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے سارے اعمال ہی (ایمان سمیت) غارت ہو جائیں اور تمہیں (ایمان اور اعمال کے برباد ہوجانے کا) شعور تک بھی نہ ہو.
اور ايک قوم جو آداب بجا لائي انكي يوں تعريف كي:
﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (الحجرات 3)، ترجمہ: بيشک جو لوگ رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كي بارگاہ ميں ادب اور نياز كے باعث اپني آوازوں كو پست ركھتے ہيں يہي وہ لوگ ہيں جن كے دلوں كو اللہ نے تقوے كے لئے چن كر خالص كر ليا ہے، ان ہي كے لئے بخشش اور اجر عظيم ہے.
ايک قوم كي يوں مذمت فرمائي: اللہ رب العزت نے فرمايا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (الحجرات 4)، ترجمہ: بيشک جو لوگ آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كو حجروں كے باہر سے پكارتے ہيں ان ميں سے اكثر آپ كے بلند مقام و مرتبہ اور آداب تعظيم كي سمجھ نہيں ركھتے۔
آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كے اپنے رفيق اعلے كے پاس جانے كے بعد آپكا احترام ويسے ہي ضروري ہے جيسے آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كي حيات مباركہ ميں تھا، ابو جعفر نے تابعداري كي اور كہا، اے ابو عبداللہ ميں قبلے كي طرف رخ كر كے دعاء كروں يا رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كي طرف منہ كروں؟ چنانچہ امام مالک نے كہا تم اپنا چہرہ آپ ﷺ كي طرف سے كيں پھيرتے ہو؟ حالانكہ آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- روز قيامت اللہ رب العزت كي بارگاہ ميں تمہارا وسيلہ ہيں، اور تمہارے باپ حضرت آدم عليہ السلام كا وسيلہ ہيں، بلكہ تم آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كي طرف ہي رخ كرو اور آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- سے شفاعت كے طالب ہو، پس اللہ تعالے آپ- صلى اللہ عليہ وسلم- كي شفاعت قبول فرماتا ہے، اللہ رب العزت كا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّاباً رَّحِيماً﴾ (النساء4).
اور (اے حبیب!) اگر وہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اوراللہ سے معافی مانگتے اور رسول(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے.
انبياء اور صالحين كے مزارات كي زيارت كے مستحب ہونے كے ساتھ ساتھ انہيں مساجد بنانے سے منع كرنے كي وعيد آئي ہے اس سے تنبيہ ضروري ہے، اس سلسلہ ميں كئي نصوص وارد

ہوئي ہيں، انہي ميں رسول اللہ - صلى الله عليه وسلم- كي يہ حديث شريف ہے : "لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد"، اللہ تعالے نے يہود ونصارے پر لعنت كي انہوں نے اپنے انبياء كي قبور كو مساجد بنايا، اور ايک يہ حديث شريف ہے : "اللهم لا تجعل قبري وثنا يعبد، اشتد غضب الله على قوم اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد "، اے اللہ ميري قبر كو بت نا بنانا جسكي عبادت كي جاتي ہے، اس قوم پر اللہ كا غضب شديد ہو گيا جس نے اپنے انبياء كي قبروں كو مساجد بنايا، اور آپ - صلى الله عليه وسلم- كا يہ فرمان ہے : "لا تجعلوا بيوتكم قبورا،ولا تتخذوا قبري عيدا، وصلوا علي، فإن صلاتكم تبلغني حيث كنتم"، اپنے گھروں كو قبريں نہ بناؤ اور نہ ميرے روضہ كو عيد بنانا اور مجھ پر درود شريف پڑہو، سو تمہارا درود مجھ تک پہونچايا جاتا ہے تم جہاں کہيں ہو.

قبروں كو مساجد بنانے كا مفہوم عبادت كے لئے انكي اور انميں جو ہيں (صاحب قبر) كي طرف جانا ہے اور يہ جائز نہيں سو عبادت صرف اللہ وحدہ كے ليے ہے اور يہي مفہوم قبر كو بت بنانا - جسكي كہ عبادت كي جاتي ہے- كا ہے-

يہاں مسجد سے مراد نماز وغيرہ كي عبادت كي جگہ ہے، اور اسے عيد بنانے سے مراد معين زمانے اور وقت ميں وہاں اللہ رب العزت سے تقرب حاصل كرنا ہے جيسا كہ عيدوں ميں ہوتا ہے- بعض صحابہ كرام مثل حضرت عبداللہ ابن ام مكتوم آرزو مند رہتے كہ نبي كريم - صلى الله عليه وسلم- ان كے گھر ميں نماز ادا فرمائيں تاكہ اسے مسجد بنائيں اور حضرت ابن عمر رضي اللہ عنہما آپ - صلى الله عليه وسلم- كي جگہوں اور آثار كي تلاش و جستجو ميں رہتے، حضرت موسى بن عبداللہ كو راستے ميں جگہوں كو تلاش كرتے اور وهاں نماز پڑھتے ديكھا اور بيان كرتے تھے، اور ان كے والد عبداللہ بن عمر ان جگہوں پر نماز پڑھا كرتے تھے، اور انہوں نے نبي كريم - صلى الله عليه وسلم- كو ان مقامات پر نماز پڑھتے ديكھا، موسى نے كہا نافع نے مجھ سے بيان كيا كہ ابن عمر ان جگہوں پر نماز پڑھتے تھے-

صحابہ كرام رضوان اللہ تعالے اجمعين نبي كريم كے آثار سے بركت حاصل كيا كرتے تھے، بخاري شريف ميں آيا ہے : رسول اللہ كے دست مبارک ميں چاندي كي انگوٹھي تہي، آپ - صلى الله عليه وسلم- كے بعد يہ حضرت ابوبكر صديق رضي اللہ تعالے عنہ كے ہاتہ ميں تھي، اسكے بعد حضرت عمر رضي اللہ عنہ كے ہاتھ ميں پھر حضرت عثمان رضي اللہ عنہ كے ہاتھ ميں تھي يہاں تک كہ ‹‹ اريس›› كنويں ميں گر گئي، اس پر ‹‹ محمد رسول اللہ ›› نقش تھا، اور بعض روايت ميں ہے كہ يہ حضرت عثمان كے ہاتھ ميں ۶ سال تک رہي، اسے كنويں ميں تلاش كيا گيا ليكن كوئي فائدہ نہيں، اريس كنواں مسجد قباء كے برابر ميں ہے اور بئر الخاتم يعني انگوٹھي كے كنويں كے نام سے معروف ہے-

بخاري شريف ميں يہ بھي آيا ہے كہ حضرت زبير بن العوام كے پاس ايک نيزہ تھا، جس سے انہوں نے يوم بدر عبيدہ بن سعيد بن العاص كو مارا تھا، چنانچہ نبي كريم - صلى الله عليه وسلم- نے اس كا سوال كيا تو انہوں نے يہ آپ - صلى الله عليه وسلم- كي خدمت مين پيش كر ديا، جب آپ - صلى الله عليه وسلم- اپنے رفيق اعلے سے جا ملے تو اسے لے ليا، پھر حضرت ابوبكر نے مانگا انكے بعد حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علي كے پاس رہا، عنزہ نيزہ كي مانند ہوتا ہے، اسيطرح بخاري شريف ميں آيا ہے كہ حضرت عمر رضي اللہ عنہ نے وہ درخت نہيں كاٹا جسكے پاس بيعت رضوان ہوئي تھي، مگر بعد ميں اسكے اور اسكي جگہ كے بارے ميں لوگوں كے اختلاف كي وجہ ہے-

ڈاكٹر ياسر عبد العظيم

32- مدينہ منورہ كي قديم تاريخي مساجد كي زيارت كا حكم

سوال: مدينہ منورہ كي قديم تاريخي مساجد كي زيارت كے بارے ميں حكم دريافت كيا گيا؟

خلاصہ فتوى: احترام اور تعظيم كے طور پر قديم تاريخي مقامات كا اہتمام كرنا شرک كا موجب ہوتا ہے۔

اللجنہ الدائمہ للبحوث العلميہ وا لافتاء، كتاب فتاوے و بيانات مہمہ ۸۲۔

تبصرہ:

صالحين كے آثار (قديم اشياء) سے تبرک حاصل كرنا محبت كي دليل ہے اور يہ ممنوع نہيں ہے اگر يہ معقول حد ميں ہو۔

علمي رد:

يہ ايک معروف بات ہے جب كوئي انسان دوسرے انسان سے محبت كرتا ہے تو اس سے تعلق ركھنے والي ہر چيز سے بھي محبت كرتا ہے، ليكن اس محبت ميں غلو نہيں كرنا چاہئے، كہ محبوب اپنے درجہ اور مقام ومرتبے سے بھي بلند ہو جائے، چنانچہ اقوام نے اپنے انبياء كرام سے محبت كي اور انہيں اللہ كا يا اس سے قريب درجہ دے ديا، نبي كريم - صلى اللہ عليہ وسلم- نے آپ سے محبت كرنے ميں حد سے بڑھ جانے سے تنبيہ فرمائي ہے: "لا تطروني كما أطرت النصارى المسيح ابن مريم ولكن قولوا عبد اللہ ورسولہ"، ميرے بارے ميں مبالغہ آرائي نہ كرو جس طرح نصارے نے مسيح بن مريم عليہ السلام كي كي، ليكن كہو عبداللہ (اللہ كا بندہ) اور اس كا رسول" يہ حديث شريف امام بخاري نے روايت كي ہے۔

رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- نے اپنے صحابہ كرام كو اپنے آثار (اپني اشياء) سے تبرک حاصل كرنے كي اجازت فرمائي، اس سلسلہ ميں يہ اخبار ہيں:

1۔ سيرت نگار لكھتے ہيں: صلح حديبيہ كے موقع پر صحابہ كرام رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كے اطراف جمع ہو جاتے: اللہ قسم رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- نے جب كبھي كھنكار پھينكا ہے تو وہ اصحاب ميں سے كسي نہ كسي كے ہاتھ ميں گرا ہے، جسے انہوں نے اپنے منہ اور جسم پر مل ليا ہے، جب وہ اپنے اصحاب كو حكم ديتے ہيں تو وہ اس كي تعميل كے لئے دوڑتے ہيں اور جب وضو كرتے ہيں تو ان كے وضو كے پاني كے لئے باہم جھگڑنے كي نوبت پہونچنے لگتي۔ ([64])

۲۔ امام بخاري روايت كرتے ہيں كہ رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- مكہ كي كشادہ وادي ميں تشريف فرما تھے كہ لوگ رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كے دست مبارک سے اپنے چہروں پر مسح كرتے، اور راوي ابو جحيفہ كہتے ہيں كہ ميں نے آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كا دست مبارک اپنے چہرہ پر ركھا، يہ برف سے زيادہ ٹھنڈے اوركستورى سے زيادہ خوشبودار ہيں.

حضرت امام احمد كي روايت ميں ہے كہ حجہ الوداع كے دن فجر كي نماز كے بعد لوگ رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كي خدمت اقدس ميں كثير تعداد ميں جمع ہوئے اور وہ ايک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے، ابو زيد بن ا لاسود اپني جواني اور طاقت سے رسول اللہ - صلى اللہ عليہ وسلم- كے پاس پہونچ گئے اور آپ - صلى اللہ عليہ وسلم- كا دست مبارک اپنے چہرہ اور سينہ پر ركھا تو ميں نے اسے سب سے اچھا اور سب سے ٹھنڈا پايا، امام شوكاني كہتے ہيں

---

64 الزرقاني علے المواہب، ج ۳ ص ۱۹۲۔

کہ ان واقعات میں اہل فضل کو چھو کر تبرک حاصل کرنے کي مشروعیت (جائز ہونا) ہے، کیونکہ رسول اللہ - صلى اللہ علیہ وسلم- نے اسے باقي رکھا ہے اور منع نہیں فرمایا۔ ([65])
۳۔ امام احمد سے منقول ہے وہ اپني قمیص کي آستین میں نبي کریم - صلى اللہ علیہ وسلم- کے موئے مبارک (بال) رکھتے تھے اور انھي موئے مبارک کي برکت سے المعتصم نے ،، خلق قرآن،، کے فتنہ میں اس قمیص کو نہیں جلایا، اور اللہ رب العزت نے امام احمد کو حق پر ثابت قدم رکھا تو امام شافعي نے انکي قمیص کو دھوئے ہوئے پاني سے تبرک حاصل کیا، (یعني قمیص کو دھونے کے بعد کے پاني سے تبرک حاصل کیا)۔([66])
اور بہت سي روایات ہیں کہ صحابہ کرام نماز میں رسول اللہ - صلى اللہ علیہ وسلم- کي جائے نماز اور اس رسول اللہ - صلى اللہ علیہ وسلم- المنبر الشریف پر جس جگہ اپنے دست مبارک رکھتے تھے وہاں صحابہ کرام اپنے ہاتھ رکھ کر تبرک حاصل کرتے تھے، انکے علاوہ دیگر اخبار (روایات) ہیں، امام نووي نے اس حدیث شریف کے سلسلے میں کہا ہے کہ نبي کریم - صلى اللہ علیہ وسلم- نے کھجور کو چبا کر نومولود بچہ کے تالو سے لگائي۔([67])
امام نووي نے لکھا ہے کہ علماء کھجور کو چبا کر اسے نومولود بچے کے تالو سے لگانے کے مستحب ہونے پر متفق ہیں، کھجور کے مفہوم میں ہر میٹھي چیز شامل ہے، اور یہ کہ چبا کر بچہ کے تالو میں لگانے وا لا صالحین میں سے ہو یعني ولي ہو، اور تبرک مرد و عورت دونوں سے حاصل کیا جا تا ہے۔
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے اجمعین نبي کریم کے آثار سے برکت حاصل کیا کرتے تھے، بخاري شریف میں آیا ہے: رسول اللہ کے دست مبارک میں چاندي کي انگوٹھي تھي، آپ - صلى اللہ علیہ وسلم- کے بعد یہ حضرت ابوبکر صدیق رضي اللہ تعالے عنہ کے ہاتہ میں تھي، اسکے بعد حضرت عمر رضي اللہ عنہ کے ہاتھ میں پھر حضرت عثمان رضي اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھي یہاں تک کہ ،، اریس،، کنویں میں گر گئي، اس پر ،، محمد رسول اللہ ،، نقش تھا، اور بعض روایت میں ہے کہ یہ حضرت عثمان کے ہاتھ میں ۶ سال تک رہي، اسے کنویں میں تلاش کیا گیا لیکن کوئي فائدہ نہیں، اریس کنواں مسجد قباء کے برابر میں ہے اور بئر الخاتم یعني انگوٹھي کے کنویں کے نام سے معروف ہے۔
بخاري شریف میں یہ بھي آیا ہے کہ حضرت زبیر بن العوام کے پاس ایک نیزہ تھا، جس سے انہوں نے یوم بدر عبیدہ بن سعید بن العاص کو مارا تھا، چنانچہ نبي کریم - صلى اللہ علیہ وسلم- نے اس کا سوال کیا تو انہوں نے یہ آپ - صلى اللہ علیہ وسلم- کي خدمت مین پیش کر دیا، جب آپ - صلى اللہ علیہ وسلم- اپنے رفیق اعلے سے جا ملے تو اسے لے لیا، پھر حضرت ابوبکر نے مانگا انکے بعد حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علي کے پاس رہا، عنزہ نیزہ کي مانند ہوتا ہے، اسیطرح بخاري شریف میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضي اللہ عنہ نے وہ درخت نہیں کاٹا جسکے پاس بیعت رضوان ہوئي تھي، مگر بعد میں اسکے اور اسکي جگہ کے بارے میں لوگوں کے اختلاف کي وجہ ہے۔ ([68])

[65] نیل الاوطار ج ۲ ص ۳۲۳۔۳۲۴.

66 حیاہ الحیوان الکبرے از دمیري ج ۱ ص ۱۰۰۔۱۰۱.

67 شرح صحیح مسلم ج ۱۴ ص۱۲۲.

[68] فتاوے دارا لافتاء المصریہ، الموضوع ۱۲، فضیلہ الشیخ عطیہ صقر، مئي ۱۹۹۷م

بیشک اولیاء کرام کے آثار (اشیاء) سے برکت حاصل کرنا محبت کي دلیل ہے، اگر معقول حد میں ہو تو اس میں کوئي ممانعت نہیں ہے، واللہ اعلم.
ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

33۔ نماز کے بعد عام طور پر مصافحہ کرنے کا حکم

سوال: نماز کے بعد عام طور پر مصافحہ کرنے کا حکم دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: نماز کے بعد مصافحہ کرنے کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ بدعتِ مذموم ہے۔
الشیخ ابن باز فتاویٰ اسلامیہ ۱۷۹

تبصرہ:

مصافحہ کی اصل سنت ہے بعض حا لات میں اس کی حفاظت کرنا سنت کےخلاف نہیں ہے۔

علمی رد:

مصافحہ بذات خود مباح ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ محبت ،احترام ،الفت اور تعلقات کی مضبوطی کے مظہر کے طور پر سنت ہے ۔ اس کے فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث شریف روایت کی گئی ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں (حضرت) قتادہ سے مروی حدیث شریف ہے، انہوں نے کہا: میں نے (حضرت) انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)سے کہا کیا رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے صحابیوں میں مصافحہ کا رواج تھا انہوں نے کہا :ہاں۔[69]
سنن الترمذی میں(حضرت)ابوامامہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا" مریض کی پوری عیادت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی اپنا ہاتھ اسکی پیشانی پر یا آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: اسکے ہاتھ پر رکھ کر پوچھے کہ مزاج کیسا ہے اور تمہارے درمیان پوری تحیت (سلام کرنا) یہ ہے کہ مصافحہ کیا جائے"۔ ([70])
سنن ابی داؤد میں (حضرت) البراء سے روایت ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ إِلاَّ غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَفْتَرِقَا"، ترجمہ: جب دو

---

69 صحیح البخاری ۱۲۶۳۔
70 سنن الترمذی ۲۹۵۰ ۔

مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو اُن دونوں کے جدا ہونے سے پہلے ہی ان دونوں کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں"۔([71])

مسند امام احمد میں (حضرت) انس بن مالک (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے :انہوں نے کہا : رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "يَقْدَمُ عَلَيْكُمْ غَداً أَقْوَامٌ هُمْ أَرَقُّ قُلُوباً لِلإِسْلاَمِ مِنْكُمْ "، اس کا مفہوم ہے "کل تمہارے پاس اقوام آئیں گی اسلام کیلئے ان کے دل تم سے زیادہ نرم ہیں"۔ انہوں نے کہا ا لاشعری آئے ان میں (حضرت) ابو موسیٰ عشری تھے، جب وہ مدینہ شریف کے قریب پہنچے تو رجز پڑھنے لگے کہتے کل ہم محمد - صلی اللہ علیہ وسلم- کے احباء سے اور ان کی جماعت سے ملیں گے۔ جب وہ آئے تو انہوں نے مصافحہ کیا اور وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے آکر مصافحہ کیا اور اس میں یہ ہے کہ انہوں نے مصافحہ کر کرنا شروع کیا اسے برقرار رکھا اور نماز کے بعد مخصوص کیا۔ ابن تیمیہ نے نماز کے بعد مصافحہ کرنے کو اس وجہ سے مکروہ بتایا کہ سرورِ کونین - صلی اللہ علیہ وسلم- کے زمانے میں ایسا نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی خلفاء راشدین کے زمانے میں ایسا تھا۔ اکثر علماء کرا م نے ان کی (ابن تیمیہ) کی مخالفت کی کیونکہ کسی عمل کے وارد نہ ہونے کا مفہوم ممانعت نہیں ہوتااور نہ یہ بدعت.

مذموم ہے۔ بشرطِ کہ کسی معلوم نص (عبارت) کہ خلاف نہ ہو۔ (حضرت) امام نووی نے کہا صافحہ کی اصل سنت ہے اور بعض طریقوں سے اس کی حفاظت کرنا سنت کے خلاف نہیں۔ مصافحہ کرنے کے حکم کے بارے میں اختلاف کی وجہ درحقیقت بدعت کی تعریف میں اختلاف ہے اور جب مسئلہ اختلافی ہو تو کسی بھی رائے کی طرف داری یا اُس کے بارے میں تعصب نہیں کیا جانا چاہیئے۔ واللہ اعلم .

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

34- قرآن کریم کو چومنے کا حکم

سوال: قرآن کریم کو چومنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

71 سنن ابی داؤد ۵۲۱۴.

خلاصہ فتوی: قرآن کریم تلاوت اور غور و فکر کیلئے نازل کیا گیا ہے اسے چومنے اور بوسہ دینے کے جائز ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ا للجنۃ الدائمہ ۔ مجلۃ البحوث **٩٦/٣٥**

تبصرہ:

قرآن کریم کو چومنا ،تکریم اور احترام ہے یہ اللہ رب العزت کی نشانیوں کی تعظیم ہے۔ قرآن کریم کو چومنے سے منع کرنے کا کوئی حکم نہیں آیا چنانچہ یہ مباح ہے ۔ اگر چومنے سے مقصود تعظیم و تکریم ہو تو یہ سنت ہے۔

علمی رد:

شریعت میں جنہیں چومنے یا جن کو بوسہ دینے کا ذکر آیا ہے ان میں حجر اسود کو بوسہ دینا ہے۔ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اسے چوما اور یہ سنت ہے۔ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اسے کیوں چوما ؟ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسا شخصیتوں اور سرداروں کے ہاتھ چومنے سے مشابہت کے طور پر کیا گیا اور حجر اسود جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ زمین پر اللہ رب العزت کا عہد ہے جس کے ذریعہ اُس کے بندے اُس سے مصافحہ کرتے ہیں چنانچہ اُسے چومنا اللہ رب العزت کی عظمت اور اس کے جلال کو تسلیم کرنا ہے یا اُس کی اطاعت کا اور اُس کے (احکام) کی پابندی کرنے کا اُس کے ساتھ عہد ہے جیسا کہ لوگوں کے درمیان خرید و فروخت ، تعلق و دوستی اور باہمی معاہدہ کیلئے ہوتا ہے۔ یا اسے چومنا کعبہ شریف کے احجار کے بقیہ حصوں کی تعظیم و تکریم ہے۔جس کی تعمیرابوا لا نبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم- اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین کے ایسے بہت سے آثار وارد ہوئے ہیں جن میں انہوں نے عزت و تکریم اور احترام کے طور پر ایک دوسرے کو چوما اور بوسہ دیا ہے۔ انہیں واقعات میں سے یہ ہیں.

١۔ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے (حضرت)جعفر بن ابی طالب کی حبشہ سے واپسی پر اُن کا خیر مقدم کیا انہیں گلے لگایا اور اُن کی دونوں آنکھوں کے درمیانی حصہ کو چوما ۔

٢۔ (حضرت) زید بن حارثہ جب (أم المومنین) (حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)کے حجرے میں رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- اُٹھ کر کپڑا کھینچتے ہوئے اُن کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ -

صلی اللہ علیہ وسلم- نے انہیں گلے لگایا اور انہیں بوسا دیا۔
۳۔ جب غازی (مجاہدین) مؤتہ سے واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے دست اقدس کو بوسہ دیا۔
۴۔ جب اللہ رب العزت نے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کی توبہ قبول فرمائی تو انہوں نے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے دست اقدس کو بوسہ دیا۔
۵۔ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے عبدالقیس کے وفد کو اپنے دست مبارک بلکہ قدم مبارک کا بوسہ لینے کی اجازت دی۔
٦۔ (حضرت) اسید بن حضیر کو بوسہ لینے کی اجازت دی جب کہ انہوں نے لکڑی کی ضرب کا قصاص لینے کیلئے جسم مبارک کو کھولنے کا مطالبہ کیا۔ اور یہ بوسہ لینا برکت کے طور پر تھا۔
۷۔ دو یہودی سرکار مدینہ - صلی اللہ علیہ وسلم-) کی خدمت اقد س میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- سے نو کھلی ہوئی نشانیوں کے بارے یں دریافت کیا۔ جب آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے ان دونوں کویہ ۹ نشانیاں بتادیں تو اُن دونوں نے پیارے آقا تاجدار مدینہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے مبارک ہاتھوں اور قدمین شریفین کو بوسہ دیا اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔
۸۔ جب (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ملک شام تشریف لائے تو (حضرت) ابو عبیدہ نے اُن کے ہاتھوں کا بوسہ لیا ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ (حضرت) ابا عبیدہ نے آپ کے ہاتھوں کو چومنے کا یا بوسہ دینے کا ارادہ کیا تو (حضرت) عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے ہاتھ کھینچ لیئے ۔ سو (حضرت) ابو عبیدہ نے آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے قدموں کا بوسہ لیا۔
۹۔ (حضرت) زید بن ثابت (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے علماء کرام کے احترم کے طور پر (حضرت) عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ہاتھوں کا اُس وقت بوسہ لیا جب کہ وہ سواری پر سوار ہورہے تھے۔
چنانچہ (حضرت) زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم- کے احترام کے طور پر اُن کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔

۱۰۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ (حضرت)سلمہ بن ا لاکواع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پر بیعت کی ہے تو انہوں نے (حضرت) سلمہ بن ا لاکوع کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ [72])

قرآن شریف کو چومنا یا اُس کا بوسہ لینا انہیں سابقہ مفہوم کے ضمن میں آتا ہے۔ اور وہ ہے عزت و تکریم ، تعظیم و توقیر، اجلال و احترام، اطاعت و تقویٰ کا عہد اور یہ شعائر اللہ کی عظیم میں سے ہے۔ سورہ حج کی آیت نمبر ۳۲ میں اللہ کا ارشاد ہے کہ: ﴿ذٰلِکَ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ﴾، تر جمہ: اورجو کوئی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو بے شک یہ دلوں کی پرہیز گاری سے ۔اور یہ اللہ رب العزت کی نعمت کے شکر میں سے ہے۔ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۷ میں ہے: ﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَ لَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ﴾، تر جمہ: اوراُس وقت تمہارے پروردگار نے تم کو خبردار کیا کہ اگر تم میری شکر گزاری کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دو ں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔

اللہ رب العزت کی نعمتیں بے شمار ہیں جنہیںگننا ممکن نہیں ۔ ان نعمتوں پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ شکر گزاری سے اِن میں اضافہ ہوتا ہے۔ یا کم سے کم اللہ انہیں محفوظ رکھتا ہے اور ان میں برکت دیتا ہے۔ کفرانِ نعمت سے یہ ضائع ہونے اور ان سے لطف و اندوز ہونے سے انسان محروم ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم کو چومنے اور اُس کا بوسہ لینے سے منع کرنے کا کوئی حکم وارد نہیں ہوا چنانچہ یہ مباح ہے اور اگر اس سے قرآن کریم کی تعظیم و توقیر مقصود ہو تو یہ مباح ہے۔ وللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

35- صلاہ التسبیح کا حکم

سوال: صلاہ التسبیح کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: صلاہ التصبیح بدعت ہے ، اور اسکی حدیث ثابت نہیں بلکہ منکر ہے۔

اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 164/8

تبصرہ:

نماز تسبیح ادا کرنے مین کوئی ممانعت نہیں بلکہ یہ فضیلت ہے اور اعمال کی فضیلت میں ضعیف احادیث بھی قبول کی جاتی ہین ۔

علمی رد:

72 فتاویٰ دارالفتاء المصریہ الموضوع (٦٣) ، المفتی : فضیلۃ الشیخ مطیہ صقر مئی ۱۹۹۷.

صلاه التصبیح کی حدیث امام ابو داوود ،ابن ماجہ ،الطبرانی اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح مین روایت کی ہے صحابہ کرام کی جماعت سے بہت سے طرق سے مروی ہے جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے اسکی مثال عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جس مین نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا: "إِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تُصَلِّيَهَا فِي كُلِّ يَوْمٍ مَرَّةً فَافْعَلْ فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَفِي كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَفِي كُلِّ شَهْرٍ مَرَّةً فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَفِي عُمُرِكَ مَرَّةً"۔

اگر قدرت رکھتے ہو تو ہر روز ایک مرتبہ اگر اسکی طاقت نہیں تو ہر جمعہ کو ایک مرتبہ ،اگر یہ بھی نہ کر سکوتو سال مین ایک مرتبہ اگر یہ بھی نہ کر سکوتو توزندگی مین ایک مرتبہ [اسے ضرور]ادا کرو" اس حدیث کو حفاظ کی ایک جماعت نے صحیح قرار دیا۔ ابو الفرج بن جو زی نے نماز تسبیح کی احادیث اور انکی اسناد کو بیان کرنے کے بعد انہیں ضعیف قرار دیتے ہوئے انکا ضعف بیان کی ہے ،اور امام نووی نےکہا: ہمارے بہت سے(شافعی) ائمہ کی رائے میں نماز تسبیح مستحب ھے ،انہیں میں سے امام بغوی نے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃاللہ علیہ کے بارے مین نقل کیا ہے کہ وہ اس نماز تسبیح کو بہت پسند کرتے تھے .اور ہر وقت اسکا معمول بنانا مستحب ہے،اور اس سے غفلت نہ کی جائے۔

اور علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ نماز مشروع نہیں ھے کیونکہ اسمین بغیر کسی معتمد دلیل کے نماز کے نظام تبدیلی میں واقع ہوتی ہے۔

الغرض اس میں علماء کرام کے اختلاف کے باوجود جو اسکو ادا کرے اسکا انکار نہیں کیونکہ جسمیں ہے انکا انکار نہیں کیا جاتا ہے پھر یہ تو فضائل مین سے ہے اور جیسا کہ کثیر علماء نے فرمایا ہے کہ اعمال کی فضیلت مین ضعیف احادیث بھی قبول کی جاتی ہیں۔

اور یہ نماز کی قسم ہے اسمیں اللہ تعالی کا ذکر ہے اور ایسی چیزوں پر مشتمل نہیں جو ،مقررکردہ اصولوں کے خلاف ہو ،چنانچہ یہ بھی نفل نماز کی مانند ہے ،جس مین تسبیحات زیادہ ہین اور صبح و شام اللہ تعالی کی تسبیح کرنے کا حکم ہے اور نماز ایک عمدہ موضوع ہے ۔۔واللہ اعلم ۔

ڈاکٹر احمد عید

باب چہارم طہارت اور فطری سنتیں

36۔ نیت کی الفاظ سے ادائیگی کا حکم

سوال: نیت کو الفاظ سے ادا کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: نیت کی الفاظ سے ادائیگی بدعت ہے کیونکہ یہ رسول اللہ- صلی اللہ علیہ وسلم- اورآپ کے اصحاب سے منقول نہیں ہے -

الشیخ ابن باز۔ فتاویٰ المرآۃص۲۹

تبصرہ:

شافعیوں کا کہنا ہے کہ نیت کو زبان سے ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اسے سنت بتایا جاتا ہے اس میں زبان دل کی معاون ہوتی ہے ۔اگر زبان سے نیت کے الفاظ نہ کہیں جائیں تو بھی نماز صحیح ہوگی ۔

علمی رد:

نیت کا مفہوم قصد ، ارادہ ہے اور قصد ایک قلبی عمل ہے ۔نماز یا دوسری عبادات میں اسے زبان سے ادا کرنا واجب نہیں ہے ۔اورنماز کے قبول ہونے کا انحصار نیت کو زبان سے آہستہ یا آواز سے ادا کرنے پر نہیں ہےشوافع کا کہنا ہے کہ نیت کو الفاظ سے ادا کرنے میں کوئی حرج نہیںبلکہ اسے سنت بتایا جاتا ہے تاکہ زبان دل کی معاون ہو۔نیت کوزبان سے ادا نہ کرنے کے حالت میں بھی نماز صحیح اور مقبول ہوتی ہے اللہ رب العزت نے چاہا بشرطیکہ ظاہری طور پر اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ خشوع اور خضوع اور اخلاص سے قبولیت کے تمام عوامل بھی ہوں۔

مالکیوں کا کہنا ہے کہ نیت کے الفاظ کی ادائیگی خلاف اولیٰ ہے ۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں وسوسے آتے ہوں وسوسے دور کرنے کے لئے یہ سنت ہے ۔

احناف کا کہنا ہے کے نیت کی الفاظ میں ادائیگی بدعت ہے یہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم-اور آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے صحابہ سے ثابت نہیںلیکن وسوسوں کودور کرنے کے لئے الفاظ سے ادائیگی بہتر ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے

(اس میں اختلاف ہے)ہر رائے کے لئے دلیل ہے اورحکم جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ بدعت ہے جو مسلم نہیں ہے ۔ علمائے افاضل نے اسے وسوسوں جیسے بعض حالات میں سنت اور مستحب بتایا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیت کی زبان سے ادائیگی سے نقصان تو نہیں البتہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ لفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے:

بعض اہل علم نیت کی الفاظ میں ادائیگی کو بدعت بتاتے ہیں کچھ اہل علم اسے مستحب قرار دیتے ہیں انہیں میں وہ بھی ہیں جوان لوگوں کے لئے مستحب کہتے ہیں جنہیں وسوسے آتے ہیں۔([73]) واللہ اعلم۔

ڈاکٹر احمد عید

37۔ داڑھی منڈوانا اور لباس کو چھوٹا کرنا

سوال: اس شخص کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے جو یہ کہتا ہوں کہ داڑھی منڈوانا اور لباس کو چھوٹا کرنا سطحی امور میں سے ہےں۔

خلاصہ فتویٰ: داڑھی چھوڑنا(رکھنا) متفقہ طور پر واجب ہے اورلباس کو طول دینا(ٹخنوں سے نیچے تک ہونا)خواہ یہ خودپسندی اورتکبرکے طورپرہو یا کسی اور مقصد سے ،حرام ہے ۔

الشیخ ابن باز مجلۃ الدعوۃ العدد۱۶۰۷

تبصرہ:

داڑھی کو موزوں شکل دینا اسے درست کرنا اور اس کے کچھ بالوں کو ترشوانہ تمام ائمہ کے نزدیک جائز ہے یہ سنت یا واجب ہوسکتا ہے۔ داڑھی مکمل طور پر منڈوانے کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہےں۔ اسلاف میں سے بعض نے اسے حرام بتایا ہے اور بعض نے اسے حرام قرار نہیں دیا ہے.

[73] ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ: فتویٰ نمبر ۵۸۲۱۰تاریخ فتوی'۱۳ ذوالحج۱۴۲۵ھ۔

لباس کا طویل ہونا (ٹخنوں سے نیچے ہونا) اگر خودپسندی اور تکبرکے طور پر ہوتو حرام اورخودپسندی اور تکبر کے طور پر نہ ہوتو حرام نہیں ہے۔

علمی رد:

سنن الترمذی میں حدیث شریف جو حضرت عمر وبن شعیب سے انہوںنے اپنے والد اورانہوں نے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- اپنی داڑھی مبارکہ کے طول عرض میں سے کچھ ترشواتے تھے ([74])۔

صحابہ اکرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ثابت ہے کہ وہ اپنی داڑھی کو درست کرتے (یعنی اسے موزوں شکل دیتے تھے) اور اس میں سے کچھ ترشواتے تھے ([75]) اور کسی کو بھی صحابہ اکرام کے بارے میں یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ وہ تساہل پسند یا سنت کے مخالف تھے ۔داڑھی چھوڑنے کے بارے میں علماء میں اس بات پر اختلاف ہے کہ یہ واجب ہے یاسنت ہے ([76])۔

شیخ البانی نے داڑھی ترشوانے کے بارے میں کئی صحابہ کرام کے آثار کا ذکر کرنے کے بعداپنی تحقیق میں کہا میرا خیال ہے کہ بعض اسلاف اور ائمہ کی انہیں نصوص کی اہمیت کے پیش نظر،میںکچھ وسعت کے ساتھ اسے پیش کروں کیوں کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عام انداز"واعفو اللحی"(داڑھی چھوڑ دو)کے خلاف ہے اور انہوں نے اس قاعدے کی طرف توجہ نہیں کی کہ اگر کوئی عام شخص اس پر عمل نہیں کرتا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس سے مقصود ہی نہیں ہے ([77]) جہاں تک لباس کو لمبا کرنے کے حکم کا تعلق ہے توامام

---

[74] سنن الترمذی:۲۹۸۸اورکہا : یہ حدیث غریب ہے میں نے امام بخاری سے سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ عمر بن ہارون جنہوں نے حدیث بیان کی ہے ان کی بیان کردہ کسی اور حدیث سے میں واقف نہیںاور بنیادی طور پر ان کی کوئی سند نہیں ،یا کہا انہوں نے صرف یہی حدیث شریف بیان کی ہے جس کا مفہوم ہے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- اپنی لحیہ مبارکہ کے طول عرض میں سے ترشواتے تھے ۔یہ بات ہم صرف عمر بن ہارون کی حدیث شریف سے جانتے ہیں اوروہ حسن الرأی ہے یعنی ان کے بارے میں اچھی رائے ہے۔ابوعیسی کہتے ہیں میں نے قتیبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عمر بن ہارون صاحب حدیث تھے ۔اورگویا کہ وہ کہتے تھے کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے ابن حبان نے اس حدیث کوصحیح بتایا ہے دیکھئے : تحفۃ المحتاج فی شرح المنہاج۳۷٦/۹.

[75] بخاری شریف میں(حضرت)عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اپنی لحیہ میں سے ترشوانے سے متعلق حدیث شریف ابوداؤد نے (حضرت) جابر سے روایت کی ہے انہوں نے کہا ہم حج اورعمرہ میں داڑھی کو ترشواتے تھے ان کے علاوہ دوسرے ایام میں چھوڑدیا کرتے تھے (یعنی ترشواتے نہیں تھے)منصف میں عبدالرزاق نے (١٠٨/٦)سماک بن یزید سے روایت کی ہے انہوں نے کہا (حضرت) علی اپنی لحیہ مبارکہ کے سامنے کے حصے سے ترشواتے تھے ابی زرعہ سے روایت ہے انہوں نے کہا (حضرت) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے اور ایک مٹھی سے زیادہ حصے کو ترشوادیتے تھے عطا بن أبی رباح سے روایت ہے انہوں نے کہا وہ داڑھی کوچھوڑنا پسند کرتے تھے سوائے حج اور عمرہ کے اور ابراہیم داڑھی میں تعارض کرنے والے بالوں (اطراف کے بالوں کو)ترشواتے تھے ابن طاؤوس نے اپنے والد سے روایت کی ہے وہ اپنی داڑھی کے غیر ضروری حصے کو ترشواتے تھے ۔حضرت امام حسن سے روایت ہے :انہوں نے کہا :وہ داڑھی کے ایک مٹھی سے زائد حصے کو ترشوانے کی اجازت دیتے اور قاسم جب اپنا سر منڈواتے تو اپنی داڑھی اورمونچھوں کو بھی ترشواتے تھے ۔حضرت جابر سے روایت ہے کہ ہم داڑھی لمبائی میں صرف حج اور عمرہ میں ترشواتے تھے ابی ہلال سے روایت ہے انہوں نے کہا :میں نے (حضرت)امام حسن اور ابن سیرین سے دریافت کیا توان دونوں نے کہا :اپنی داڑھی کی لمبائی کے کچھ حصہ کو کاٹنے میں کوئی حرج نہیں(حضرت) ابراہیم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی داڑھیوں میں خوشبو لگاتے اور اطراف میں سے ترشواتے تھے۔

[76] شوافع کی یہاں معتمد بات یہ ہے کہ داڑھی کو چھوڑنا سنت اور اسے منڈوانا مکروہ ہے ۔شوافع کی حنابلہ کے یہاں بھی دوروایات ہےں سنت اور واجب مالکیہ نے داڑھی کی حد مقرر نہیں کی ہے ان کے یہاں اسے چھوڑنے یا چھوٹی کرانے پر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے بلکہ ان کے یہاں داڑھی اتنی چھوڑنا لازم ہے کے یہ نہ تو بے ہنگم ہو اور نہ ہی بہت چھوٹی ہو اس کے لئے کوئی حد نہیں احناف کا کہنا ہے کہ ایک مٹھی سے کم داڑھی کاٹنا جائز نہیں اور ایک مٹھی سے زیادہ حصہ کو کاٹنا واجب یا سنت ہے ۔

[77] الشیخ ناصر الدین ا لابانی :سالسسلۃ الضعیفۃج ۵ص ۳۷۵اسکے بعد۔

بخاری نے تعلیق کرتے ہوئے روایت کی ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا جس کا مفہوم ہے کھاؤ اور پیو اور پہنوں اورصدقہ دو اسراف اور تکبر نہ کرو۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو بات ممنوع ہے وہ درحقیقت اسراف اور تکبر ہے اور اگر یہ دونوں نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں (حضرت)ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- اگر میں گرہ نہ لگاؤ ںتو میرا تہبند ڈھیلا ہو جاتا ہے چنانچہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تم ان میں سے نہیں جو تکبر اور خود پسندی کرتے ہیںیہ بات یعنی تکبر کرنا مذموم (ناپسندیدہ) ہے خواہ یہ لباس ہی سے ہو۔او جو کوئی اللہ رب العزت کی نعمت کے اظہار کے مقصد سے اچھا لباس پہنتا ہے اسکی تیاری کرتا ہے اس پر اللہ رب العزت کا شکر اداُ کرتا ہے اور جس کے پاس ایسا لباس نہ ہواسے حقیر نہ سمجھتا ہو تو اچھا لباس پہننا اس کے لئے مباح ہے حتیٰ کہ لباس انتہائی نفیس ہو تو بھی اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ۔صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ"، تر جمہ: جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بڑائی (تکبر) ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔چنانچہ ایک شخص نے عرض کیا کہ کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کے اسکا لبا س اچھا ہو اسکی پاپوش (جوتی) اچھی ہو تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: إِنّ اللّهَ يُحِبُّ الْجَمَالَ وَلَكِنّ الْكِبْرَ مَنْ بَطَرَ الْحَقّ وَغَمَصَ النّاسَ"، تر جمہ: اللہ رب العزت جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے "کبر" ا ترانا غرور اورتکبر کرناہے اور "غمط" لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ (78)

ڈاکٹر احمد عید

38۔ بالوں کو سیاہ رنگنے کا حکم

سوال: بالوں کو سیاہ رنگنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: بالوں کوسیاہ رنگنے کی ممانعت ہے اس وجہ سے یہ جائز نہیں۔

---

78 مختلف مسالک کے علماء کی رائے یہ ہے کہ کپڑوں کا غیر ضروری لمبا ہونا اگر یہ تکبر اور خودپسندی کے طور پر ہو تو حرام ہے اوریہ تکبر اوربڑائی کے طورپرنہ ہو توحرام نہیں،فقہ حنفی کی کتاب فتاوی ہند میں ہے کہ مرد کا اپنی چادر یعنی تہبند کو ٹخنوں سے نیچے تک لمبا کرنااگر غرور اور تکبر کی وجہ سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے المنتقی شرح الموطأ(مالکی) میں ہے کہ جس نے طویل لمباس گھسیٹا یااس کے پاس دوسرا لباس نہ ہو یا کوئی عذر ہو تو اس کے لئے وعید نہیں ہے ۔ الحسن بن ابی الحسن البصری نے ابی بکر سے روایت کی ہے کہ سورج گہن ہو اس وقت ہم رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے پاس تھے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کھڑے ہوئے اور تیزی سے اپنا لباس کھینچتے ہوئے مسجد تشریف لائے ۔المجموع از اللنووی (شافعی)میں ہے لباس۔تہبند اور شلوار کو تکبر اور خود پسندی کے طور پر ٹخنوں تک لمبا کرنا حرام ہے اور تکبر نہ کرنے والوں کے لئے مکروہ ہے کشاف القناع (حنبلی):امام احمد نے کہا تہبند کا گھسیٹنااورنماز میں چادرکو دراز کرنا اگر خود پسندی اورتکبر کے طور پر نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

الشیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی ۱۱/123

تبصرہ:

بالوں کو سیاہ رنگنے کا مسئلہ اختلافی ہے بعض کے نزدیک یہ ممنوعہ بعض کے نزدیک مکروہ اور بعض کے نزدیک مباح (جائز)ہے ۔

علمی رد:

سرور کونین - صلی اللہ علیہ وسلم- کی حدیث شریف ہے : "مَنْ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ"، ترجمہ: جس کے بال ہوں اسے چاہئے کہ وہ ان کی عزت کرے (انہیں سنوارے)۔

یہ حدیث شریف امام ابوداؤد نے روایت کی ہے ان کے علاوہ دیگر احادیث شریف ہیں جن میں سے بعض صحیح ہے مرد اور عورت کے لئے عزت وتکریم کی کئی صورتیں ہیںہر وہ بات جو انکے مناسب اور ان کے لائق ہو عزت وتکریم ہے مثال کے طور پر ۔ ترجیل،بالوں میں کنگھی کرنا ، تیل لگانا ہے اسی طرح بڑھاپے کو چھپانے کے لئے انہیں رنگنا بھی ہے۔ علماء اکرام نے بالوں کو سیاہ رنگنے کے بارے میں گفتگو کی ہے چنانچہ اکثر نے اس سے منع کیا ہے لیکن ان کے د لائل مردوں اور اُن سن رسیدہ خواتین پر مرکوز ہےں۔ جو اپنی شادی کی خواہش میں جوان دیکھائی دینے کی خواہاں ہوتی ہیں۔جہاں تک شادی شدہ عورت کا تعلق ہے جس کا شوہر بیوی کے بالوں سے اچھی طرح واقف ہے اس کا بالوں کو رنگنے میں کوئی حرج نہیں جو اسکے اور اسکے شوہر کے لائق ہو۔یہی نہیں بلکہ ابن الجوزی نے تو مردوں کو بھی اس کی اجازت دی ہے اور اسکی ممانعت کے بارے میں جو کچھ واردہوا ہے اسے فریب اور اطاعت کی طرف عدم توجہی پر محمول کیا ہے ۔جب کے سن رسیدہ انسان کو اپنے رب سے ملاقات کی تیاری کے طور پر اس کی اطاعت کرنی چاہئے ۔حنابلہ کا خیال ہے کہ بالوں کی سفیدی کو تبدیل کرنے کے لئے یہ سنت ہے اور سیاہ رنگنا مکروہ ہے اسحاق بن راھویہ نے عورت کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے بناؤ سنگھار کرسکتی ہے اور یہ جنگ کے لئے مکروہ نہیں ہے شوافع کے نزدیک مردوعورت دونوں کے لئے سفید بالوں پر زرد یا سرخ رنگ کا خضاب لگانا مستحب ہے لیکن سیاہ خضاب لگانا حرام ہے ختم ۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بالوں کو سیاہ رنگنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے بعض نے اس سے روکا ہے بعض کے نزدیک یہ مباح ہے اور بعض کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ واللہ اعلم۔

ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے :

مرد اور عورت دونوں کے لئے بالوں کو سوائے سیاہ رنگ کے کسی بھی رنگ میں رنگنے کی ممانعت نہیں ہے اہل علم میں سے بعض نے اسے مکروہ اور بعض نے حرام بتایا ہے غالبا یہ آخری رائے راجح ہے ([79])۔

---

79 ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ: ۲۱۲۹۶تاریخ الفتویٰ ۱۱جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ ھ

39۔ داڑھی مونڈے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال: داڑھی مونڈے کے پیچھے نماز پڑھنے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: داڑھی منڈوانا حرام ہے اور داڑھی منڈوانے پر اصرار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور داڑھی منڈے کو ہٹانا اور اس کے پیچھے نماز ادا نہیں کرنی چاہئے۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیۃ وا لافتاء **۱۳۹/۵**

تبصرہ:
داڑھی منڈوانا گناہ کبیرہ نہیں ہے اورداڑھنی رکھنے کے واجب ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اختلافی مسئلے میں مذٗمت نہیں کی جاتی بلکہ متفقہ امورمیں مذمت یا اس سے منع کیا جاتا ہے اس وجہ سے داڑھی منڈے امام کو علیحدہ کرنا(ہٹانا)واجب نہیں اور اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔

علمی رد:
امام بخاری نے روایت کی ہے کہ عبداللہ ابن عمر الحجاج ابن یوسف الثقفی کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور (حضرت) عبداللہ بن مسعود نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے پیچھے نماز پڑھی اور یہ شراب نوش تھے ۔انہوں نے ایک مرتبہ نمازیوں کو صبح کی چار رکعتیں پڑھا دیں۔اس پر (حضرت)عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے کوڑے لگائے ۔صحابہ کرام اور تابعین ابن عبید کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جبکہ ان پر الحاد اور گمراہی کی طرف دعوت دینے کا الزام تھا چنانچہ ہر وہ شخص جس کی نماز اپنے لئے صحیح ہے اس کے پیچھے دوسروں کی نماز بھی صحیح ہے ([80]).

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا شخص موجود ہو جو راہ راست پر ہو تو اس کے پیچھے نماز کی ادائیگی اولیٰ وافضل ہے لیکن کسی منحرف ،راہ راست سے ہٹے ہوئے شخص کا کام ہی امامت کرنا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائزہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نصیحت بھی کی جائے۔

ابن ماجہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حدیث شریف روایت کی ہے: "ثَلَاثَةٌ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُمْ صَلَاةً مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ، وَامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ وَأَخَوَانِ مُتَصَارِمَانِ".

اس کا مفہوم ہے تین کی نماز قبول نہیں ہوتی امام جس کی قوم اسے ناپسند کرتی ہو ۔عورت نے جس نے رات اس طرح گزاری کے اس کا شوہر اس سے ناراض ہو او ر آپس میں لڑنے والے دوبھائی۔ اس طرح فاسق کے پیچھے نماز تو مکروہ ہے لیکن صحیح ہے باطل نہیں اور اس کی تائید حدیث البیھقی سے ہوتی:ہے: " صلوا خلف کل بر وفاجر، صلوا خلف کل بر وفاجر، وجاھدوا

---

[80] امام بیہقی نے **۵۵۰۹**جعفر بن محمد نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ (حضرت) امام حسن اور (حضرت) امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما مروان کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے ان سے دریافت کیا گیا آیا یہ دونوں گھر واپس آکر نماز دھرا یا کرتے تھے ؟تو انہوں نے کہا نہیں یہ دونوں ائمہ کی نماز پر اضافہ نہیں فرماتے یعنی ائمہ کی نماز کے علاوہ نماز نہیں پڑھتے تھے ۔

مع کل بر وفاجر"، اس کا مفہوم ہے "ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھو،ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھو اور ہر نیک وبد کے ساتھ جہاد کرو۔"
داڑھی منڈوانا گناہ کبیرہ میں سے نہیں ہے ۔داڑھی رکھنا یا اسے منڈوانا اُس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے ۔آیا یہ واجب ہے یا سنت ہے یا منذوب ہے ۔ اور یہ طے شدہ اصول ہے کے اختلافی مسائل میں انکار یا مذمت نہیں کی جاتی بلکہ متفقہ مسئلہ میں انکار یا مذمت کی جاتی ہے اس وجہ سے داڑھی منڈے امام کو چھوڑنا یا اسے ہٹانا نہیں چاہئے اس کے پیچھے نماز جائز ہے ۔
الشیخ عبداللہ بن حمیدکا فتویٰ:
اکثر اہل علم کا کہنا ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے اور جس نے اس (فاسق) کے پیچھے نماز پڑھی اسے نماز دھرانے کا حکم نہیں دیا جاتا رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کا فرمان ہے : "صلو اخلف من قال لاالہ ا لا اللہ"، نماز پڑھو اسکے پیچھے جس نے کہا نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کےیہ حدیث شریف ابونعیم نے **(۳۲۰/۱)**اور دارقطنی نے **۵٦/۲**میں روایت کی ہے۔ واللہ اعلم([81]).

ڈاکٹر احمد عید

40۔ داڑھی موڑھنے والے کو فاسق کہنا

سوال: داڑھی مونڈنے والے کو فاسق کا نام دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: داڑھی مونڈنے (شیو کرنے) وا لا اگر نصیحت کا انکار کرے تو اسے فاسق کہنے میں کوئی ممانعت نہیں۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء **۱۴٦/۵**۔ ۱۴۷

تبصرہ:

داڑھی رکھنے کے واجب اور سنت ہونے کے حکم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ اختلافی مسئلہ میں مذمت یا انکار نہیں کیا جاتا اس وجہ سے داڑھی مونڈنے والے کو فاسق کہنا جائز نہیں کیونکہ اس کے حکم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

علمی رد:

[81] فتاوی سماحۃ الشیخ عبداللہ بن حمید ص۱۲۷۔ فتویٰ نمبر۱۱۴۱۲۔

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ داڑھی رکھنے کے واجب یا سنت ہونے کے حکم کے بارے میں میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ اختلافی مسائل میں انکار یا مذمت نہیں کی جاتی ۔ بلکہ ایسا متفقہ امور میں کیا جاتا ہے اس وجہ سے داڑھی منڈوانے والے شخص کو فاسق کہنا جائز نہیں کیونکہ معتمدمجتہد ائمہ کے مسلک کی پیروی کرنے وا لا ہے ان ائمہ کی رائے یہ ہے کہ داڑھی منڈوانا حرام نہیں ہے بلکہ اسکے رکھنا مستحب ہے یہ شافعیوں اور بہت سے حنابلہ کی رائے ہے ابن مفلح نے فروع میں اور ابن حزم نے کہا کہ مونچھے کٹوانا اور داڑھی چھوڑنا متفقہ طور پر فرض ہے ہمارے بہت سے احباب اور دوسروں نے اسے مستحب بتایا ہے ([82])امام نووی نے کہا یہ صحیح ہے کہ داڑھی مکمل طور پر مونڈنا مکروہ ہے اور یہ شوافع کی معتمدرائے ہے اور امام نووی اور رافعی کا یہی مسلک ہے۔ ([83]) ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کے اجتہادی مسائل میں انکار یا مذمت نہیں کی جاتی اور کسی کو بھی اپنے متبعین کو اس کا پابند نہیں بنانا چاہئے بلکہ انہیں علمی د لائل سے گفتگو کرنی چاہئے اور دوآراء میں سے جو رائے صحیح ہو اسے قبول کرلینا چاہئے اگر کوئی شخص دوسرے کی رائے کو قبول اور اس پر عمل کرتا ہے تو اس میں برائی نہیں ۔ ختم ۔ داڑھی منڈھنے والے کو فاسق کہنا کسی مسلمان کو نا حق ایذا دینا ہے اللہ رب العزت کسی مومن کو ایذا دینے کو پسند نہیں کرتا جو اللہ یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہیں دیتا۔ اور جواللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ ([84]) واللہ اعلم۔ ([85])

ڈاکٹر احمد عید

---

[82] الفروع لابن مفلح ۱۳۰/۱

[83] المجموع از نووی ۳۴۳/۱، اسنی المطالب۵۵۱/۱:میں ہے (ان کا یہ قول کہ داڑھی منڈنا ناپسند ہے یا مکروہ ہے تو الحلیمی نے اپنی کتاب منہاج میں کہاکہ کسی کیلئے بھی داڑھی منڈوانا یا بھنوں کو نوچناجائز نہیں ،ضعیف ہے ۔تحفہ المحتاج میںیہ ہے کہ داڑھی ترشوانے کے بارے میں ہمارے ائمہ کی عمومی اور ظاہری رائے مطلق کراہیت کی ہے ۔تحفہ المحتجا فی شرح المنہاج ۳۷۶/۹۔

[84] ڈاکٹر عبداللہ فقی کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ:فتویٰ نمبر۱۶۳۸۷تاریخ فتویٰ :یکم ربیع ا لاول سن ۱۴۲۳۔

[85] الترمذی۳۰۵۹، البخاری ۵۱۸۵۔

41۔ وضو ء کے دوران ذکر کرنے کا حکم

سوال: وضوء کے اثنا ء میں ذکر کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: وضوء کے دوران ذکر کرنا بدعت ہے کیونکہ یہ ثابت نہیں اوراسکی کوئی اصل نہیں ہے-

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء **۵ /۲۰۵**

تبصرہ:

وضوء کے دوران دعائیں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ حضور اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- کے کوئی حدیث شریف ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن یہ سلف صالحین سے منقول ہے۔ اور اللہ رب العزت کے عمومی حکم کے ضمن میں آتاہے ۔ اور اس سے منع کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے-

علمی رد:

وضوء کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے ۔ رسول اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- کی حدیث شریف ہے: " كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه ببسم اللّٰه الرحمن الرحيم فهو أقطع "

جو بھی اہم کام بِسْمِ اللّٰہِ الرّحْمٰنِ الرّحِیْم سے شروع نہیں کیا جاتا وہ ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے۔ ایک اور حدیث شریف ہے: "لَا وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرْ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ"، جو وضوء شروع کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا اُس کا وضوء نہیں۔ یہ دونوں احادیث شریف روایت کی ہیں۔ لیکن اگر کوئی بھول سے یا ارادۃً اسے ترک کردے تو اکثر علماء کی رائے کے مطابق اُس کا وضوء صحیح ہوتا ہے۔ حنابلہ کے نزدیک بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور اگر کوئی ارادۃً اسے ترک کرتا ہے تو اُس کا وضوء باطل ہوجاتا ہے۔ وضوء کرنے کے بعد یہ پڑھنا بھی سنت ہے۔ أشھد لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ : میں گواہی دیتا ہو کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے ، وہ یکتا ہے اُس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم- اُس کے بندے اور رسول ہیں۔

مسلم میں حدیث شریف ہے جس نے یہ کہا ،اُس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ جس دروازے سے چاہے اُس میں داخل ہو۔ ایک اور روایت میں ہے : اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین ۔

اے اللہ مجھے بہت زیادہ توبہ کرنے والوں میں بنا اور مجھے پاکی حاصل کرنے والوں میں سے بنا۔ ایک اور روایت میں ہے:

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت استغفرک و اتوب الیک ۔ ([86])

اے اللہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں تیری حمد و ثناء کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود سوائے تیرے ،میں تیری مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔ جہاں تک وضوء کے دوران ذکر کا تعلق ہے تو (حضرت) ابی موسیٰ الاشعری سے مروی صحیح حدیث شریف ہے: رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- وضوء کا پانی لے کر تشریف لائے چنانچہ میں نے آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "اللھم اغفر لی ذنبی، ووسع لی فی داری، وبارک لی فی رزقی"، اے اللہ ! میرے گناہوں کی مغفرت فرمادے ، میرے لئے میرا گھر وسیع فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔ حضوراکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- نے یہ دعا وضوء کے آغاز میں پڑھی تھی یا درمیان میں یا آخر میں اس میں اختلاف ہے ،بعض نے کہا یہ وضوء کرنے سے اثناء میں پڑھی تھی اور بعض نے کہا کہ وضوء کے آخر میں پڑھی تھی اور اسی میں یہ ہے کہ اباموسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- میں نے آ پ - صلی اللہ علیہ وسلم- کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ۔آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا جس کا مفہوم ہے: کیا تم نے کوئی چیز چھوڑی؟ جہاں تک وضوء کے دوران اعضاء کی دعاؤں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں حضور اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- سے کوئی شئی وارد نہیں۔ امام نووی اپنی کتاب "الاذکار" میں کہتے ہیں : فقہا نے کہا سلف صالحین کی دعائیں پڑھنا مستحب ہیں ۔ اسی میں انہوں نے اضافہ اور کمی کی ہے ۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بسم اللہ کے بعد کہے: الحمد اللہ الذی جعلاالماء طہوراً: تمام تعریف اللہ رب العزت کیلئے ہے جس نے پانی کو پاک کرنے والا بنایا ، کلی یا غرارا کرتے ہوئے کہے: اللھم اسقنی من حوض نبیک - صلی اللہ علیہ وسلم- کأسا لا أظمأ بعده أبداً ،اے اللہ! مجھے اپنے نبی - صلی اللہ علیہ وسلم- کے حوض سے ایک پیا لا پلا جس کے بعد کبھی پیاسا نہ ہوں ۔ ناک میں چڑھاتے ہوئے کہے: اللھم لا تحرمنی رائحۃ نعیمک وجناتک،اے اللہ ! مجھے اپنی نعمتوں اور جنتوں کی خوشبو سے محروم نہ کرنا۔ چہرہ دھوتے ہوئے کہے : اللھم بیض وجھی یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ، اے اللہ! میرا چہرہ اُس دن سفید(روشن) بنانا جس دن کے روشن ہوجائےں گے کچھ چہرے اور

---

[86] الأذكار از النووی ص: ۳۲۔

کچھ چہرے سیاہ ہوجائےں گے ۔ اپنے دونوں ہاتھ دھوتے یہ پڑھے: اللھم أعطنی کتابی بیمینی وحاسنبی حسابا یسیرا، اللھم لا تعطنی کتابی بشالی و لا من وراء ظہری، اے اللہ ! مجھے میری کتاب (نامہ اعمال) میرے سیدھے ہاتھ میں دینا اور میرا حساب آسان کرنا اے اللہ! میری کتاب بائیں طرف سے یا پیچھے سے نہ دینا۔ اور سر کا مسح کرتے وقت کہے: اللھم حرم شعری و بشری علی النار، وأظلنی تحت عرشک یوم لا ظل ا لاظلک، اے اللہ! میرے بال اور بشرے پر آگ حرام کردے اور اُس دن اپنے عرش کے نیچے مجھ پر سایہ کرنا ،جس دن تیرے سائے کے علاوہ کسی اور کا سایہ نہیں ہوگا۔ دونوں کانوں کا مسح کرتے ہوئے کہے: اللہم اجعلنی من الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنہ ۔

اے اللہ! مجھے أن لوگوں میں بنادے جو کان لگا کربات سنتے ہیں پھر أس کی بہترین باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ دونوں پیروں کو دھوتے ہوئے کہے: اللھم ثبت قدمی علی الصراط المستقیم۔ اے اللہ! میرے قدموں کو صراط مستقیم پر مضبوطی سے قائم کردے۔

یہ دعائیں ہیں۔ اگرچہ اِن کے بارے میں رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی لیکن اِن کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ۔ بالخصوص جب کہ یہ سلف صالحین سے وارد ہوئی ہیں۔ اور اللہ رب العزت کے ذکر کے بارے میں عمومی حکم کے ضمن میں آتی ہیں۔ اور اِن سے منع نہیں کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

ڈاکٹر احمد عید

42 - جمعہ کے غسل کا حکم

سوال: جمعہ کے غسل کے بارے مین کیا حکم ہے ؟

خلاصہ فتوی: جمعہ کی نماز میں شرکت کرنے والے ہر بالغ شخص پر غسل جمعہ واجب ہے ۔

الشیخ الشیخ ابن عثیمین ،مجموع فتاوی و رسائل 135/16

تبصرہ:

اکثر اہل علم کے نزدیک جمعہ کا غسل واجب نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔

علمی رد :

جمعہ کے نماز میں شرکت کرنے والے ہر بالغ شخص پر غسل کرنا ،صاف کپڑے پہننا اور خوشبو لگانا مستحب ہے ،اسکے مستحب ہونے مین کو ئی اختلاف نہیں اور اسکے بارے مین بہت سی صحیح احادیث ہیں ،انہیں میں سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ،انہوں نے کہا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ و صلم نے ارشاد فرمایا: "لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ ثُمَّ يَرُوحُ إِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ يُصَلِّي مَا كَتَبَ اللَّهُ لَهُ ثُمَّ يُنْصِتُ لِلْإِمَامِ إِذَا تَكَلَّمَ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى" اسے امام بخاری نے روایت کیا ھے، جو آدمی جمعہ کے دن غسل کرے جہان تک ہو سکے صفائی و پا کیزگی کا خیال کرے اور جو تیل خوشبو اسکے گھر مین ہو وہ لگائے ،پھر وہ گھر سے نماز کے لے جائے اور مسجد مین پہنچ کر اسکی احتیاط کرے کہ جو آدمی پہلے سے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں انکے بیچ نہ بیٹھے،[جگہ تنگ نہ کرے] پھر نماز یعنی سنن و نوافل کی جتنی رکعتین اسکے لے مقدر ہون پڑھے ،پھر جب امام خطبہ دے تو توجہ و خاموشی سے اسکو سنے تو اللہ تعالی کی طرف سے اس جمعہ اور دوسرے جمعہ کے درمیان اسکی ساری خطائین معاف کردی جائین گی -

اور اکثر اہل علم کی رائے کے مطابق یہ غسل واجب نہیں. اور کہا گیا ہے کہ اسی پر اجماع ھے. علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے: کہ جدید و قدیم علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جمعہ کے دن غسل فرض و واجب نہیں ,اور انہون نے امام احمد ابن حنبل سے ایک روایت کی ہے کہ وہ واجب ہے ،اسکی دلیل نبی پاک نبی صلی اللہ علیہ و صلم کی یہ حدیث ہے [غسل الجمعة واجب على كل محتلم] "غسل جمہ ھر بالغ پر فرض ھے"-

جبکہ جمہور علماء نے اس سے سنت کی تاکید مراد لی ہے جمہور علماء نے اجماع اور نبی پاک صلی اللہ علیہ و صلم کی اس حدیث مبارکہ سے استد لال کیا ہے جس مین آپ نے فرمایا: "من توضأ يوم الجمع' فبها و نعمت ،ومن اغتسل فالغسل افضل "، جس نے جمعہ کے دن وضو کیا سو اس نے اچھا کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل افضل ہے] اس حدیث کو امام نسائی و ترمذی نے نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے- ([87])

87 فتاوی اسلام سوال و جواب زیر نگرانی محمد صالح المنجد ج1،1779-

عبد اللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز کا فتوی ہے کہ چارون فقہی مذاہب مین غسل جمعہ مستحب ہے اور یہ واجب نہیں ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے اور جہان تک ہو سکے غسل جمعہ باقاعدگی سے کرنا چاہئے کیونکہ اسکی ترغیب د لائی گی ہے۔

ڈاکٹر علی منصور

43- عطر وغیرہ میں کیمیکل کے استعمال کا حکم

سوال: عطر وغیرہ میں کیمیکل کے استعمال کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : چنانچہ جواب دیا گیا کہ ناجائز ہے کیونکہ یہ نشہ آور اور نجس ہے۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ (13- 54- 55)

الشیخ سعید عبدالعظیم www.alsalafway.com

تبصرہ:

کیمیکل کی نجاست میں اختلاف ہے ۔اور اسکا استعمال میڈسن ،صفائی مختلف تجزیاتی معاینوں اور عطر وغیرہ میں عام ہو چکا ہے ۔اور اسکی پاکیز گی کا قول معتبر د لائل پر مبنی ہیں -

علمی رد:

کیمیکل سے تیا ر کردہ عطور کے استعمال کا حکم کیمیکل کے حکم پر منحصر ہے کہ کیا وہ نجس ہے یا ناپاک؟ اس میں علماء کا اتفاق ہے کہ اسکا پینا حرام ہے کیونکہ یہ نشہ آور ہے اور ہر نشہ آور چیز (خمر) شراب ہے اور ہر شراب حرام ہے ۔جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے۔ اسکو شراب کی مانند کہنے والو ں کے درمیان اسکی ناپاکی پر اختلاف ہے۔ چنانچہ چاروں ائمہ کرام کے نزدیک شراب نجس ہے ،کیونکہ ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (المائدہ 90)، تر جمہ: اے ایمان والو بےشک شراب اور جوا اور (عبادت کے لئے) نصب کئے گئے بتوں اور (قسمت معلوم کرنے کے لئے) فال سب ناپاک اور شیطانی کام ہے سو تم ان سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ.

اس حکم میں بعض اسلاف جیسے امام مالک کے استاد امام ربیعہ ،لیث بن سعد او رالمزنی وغیرہ نے اختلاف کیا ہے ۔اور انکی رائے میں شراب پاک ہے ،اور انہو ںنے اسکے حرام کرنے کی نص کے نازل ہونے پر مدینہ منورہ میں شراب کے بہائے جانے کے واقعہ سے اسکی پاکیزگی کا استد لال کیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر یہ ناپاک ہوتی تو صحابہ کرام ایسا نہیں کرتے اور یقینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے منع فرماتے تھے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رستے میں پاخانہ اور پیشاب کرنے سے منع فرمایا تھا اور اس بنا پر کیمیکل پاک ہے۔ اور جمہور کے نزدیک اسکے نجس ہو نے کی دلیل جوکہ مذکورہ آیت کریمہ ہے، کا جواب دیا ہے کہ یہا ں نجاست حکمی ہے ۔جیسا کہ مشرکین کے نجس ہونے پر اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (التوبہ 28)، تر جمہ: مشرکین تو سراپا نجس ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حرام چیز حکما نجس ہے۔

اور اسکی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آیت کریمہ میں الرجس جوکہ شراب ،جوئے نصب کئے گئے بت اور فال کے تیرو ں کی صفت ہے ۔اور کسی نے بھی ان چیزوں کی نجاست کو نجاست حقیقی نہیں کہا ۔لہذا شراب بھی ایسے ہی ہے اور اسکی نجاست حقیقی نہیں بلکہ نجاست حکمی ہے ،اور اسے نجاست حقیقی ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے ([88])۔

اور متاخرین میں سے امام شوکانی ،ضعانی مؤلف کتاب سبل السلام ،صدیق حسن خان ،روضۃالھبہ اور شیخ محمد رشید رضا نے اپنی تفسیر میں اسکے بارے میں اس طرح بیان کیاہے کہ علماء اسلام کے نز دیک شراب کی ناپاکی کا مسئلہ اختلافی ہے ۔

امام ابو حنیفہ کے نز دیک نبیذ پاک ہے اور اس میں کیمیکل ہوتا ہے اور کیمیکل شراب نہیں ہوتی ہے اور یورپی عطور کیمیکل نہیں بلکہ ان میں کیمیکل کی کچھ مقدار پائی جاتی ہے جیسے با لاتفاق دوسری اشیاء میں پائی جاتی ہے ۔ اور بے شک اسکو نجس کہنے کی کوئی وجہ نہیں ۔یہاں تک کہ شراب کو نجس کہنے والو ں کے پاس بھی دلیل نہیں ۔

اور جبکہ یہ ایک اختلافی معاملہ ہے اور شاید میڈسن ،صفائی کرنے ، مختلف تجزیاتی معاینوں اور عطور وغیرہ میں اسکا استعمال عام ہونے کے بعد آسانی کے لئے رجحان اسکی پاکیزگی کے قول کی طرف ہے [1] اور وہ آجکل مختلف چیزو ں سے نکا لاجاتاہے ۔

اس بنا پر جسم یا لباس وغیرہ کو اگر کو لو نیا لگ جائے تو اسکا دھونا لاز م نہیں اوراسکے ساتھ نماز ادا کرنا بھی صحیح ہے ([89])

شیخ ابن عثمین نے کہا ہے کہ ایسی خوشبو جن میں کولونیا یا الکوہل ہو تا ہے ان دونو ں میں ہمیں فرق کرنا چاہئے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر اسکا استعمال کم ہو جائے تو نقصان نہیں دیتی تو انسان کو چاہئے کہ وہ اسے بغیر پریشانی کے استعمال کرے جیسے کہ اسکی مقدار 5 فیصد یا اس سے بھی کم ہو تو اسکی تاثیر نہیں ۔ہا ں اگر اسکی مقدار زیادہ ہو کہ وہ اثر کرتی ہے تو پھر افضل یہ ہے کہ انسان اسے ضرورت جیسے زخم کی صفائی وغیرہ کے علاوہ استعمال نہ کرے ۔جبکہ اگر ضرورت نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ وہ استعمال ہی نہ کرے اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ حرام ہے ([90])

ڈاکٹر أنس أبو شادی

4۴۔ کتے رکھنے کا حکم

88 امام نودی نے مجموع میں کہا ہے آیت کریمہ سے واضح د لالت ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ اہل لغت کے نزدیک الرجس سے مراد گندگی ہے اور اس سے نجاست لازم نہیں آتی ،اور اسی طرح اجتناب کا معاملہ ہے اس سے بھی نجاست لازم نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا اس میں امام غزالی نے جو بیان کیا ہ ےوہ اقرب ہے کہ کتے کے جوٹھے پر قیاس کرتے ہوئے اس سے منع کرنے کے لئے نجاست غلیظہ کا حکم لگایا جاتاہے ۔ اللہ اعلم المجموع از نودی 2/ 582 ۔

[89] فتاوی دار لافتاء المصریہ موضوع 9 ،مفتی فضلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997 ۔

90 کتاب فتاوی السلامیہ سوال وجواب ج/1 ص171 سوال نمبر 1365، لقاءالباب المفتمح از ابن عثمین 240-

سوال: ایسے کتوں کی پرورش سے متعلق دریافت کیا گیا جو شکار کے مقصد سے نہیں ہے، اور اگر شکار کرلے تو اس کے شکار کا حکم کیا ہے؟

خلاصہ فتوی : جواب دیا گیا کتے رکھنا ناجائز ہے ، سوائے اسکے کہ وہ شکار یا کھیتی یا مویشیوں کی حفاظت کے لئے ہو، جہاں تک اس کی قیمت کی بات ہے تو حضرت نبی کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے.

الشیخ ابن عثیمین، نور علی الدرب ص۴۷

تبصرہ:
فائدہ مند کتوں کو رکھنا جائز ہے لیکن بے فائدہ کتے کو رکھنا ناجائز ہے. کتوں کی تجارت امام مالک کے نزدیک جائز ہے ،اور اگر ضرر رساں نہ ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی جائز ہے.

علمی رد:
امام مسلم نے روایت کی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا إِلاَّ كَلْبَ صَيْدٍ أَوْ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطَانِ ». وفي رواية « إِلاَّ كَلْبَ زَرْعٍ أَوْ غَنَمٍ أَوْ صَيْدٍ"، اگر شکار یا مویشی کے کتے کے سوا کوئی کتا رکھا تو اس کے ثواب میں سے ہر روز دو قیراط کم ہوجائیں گے" اور ایک دوسری روایت میں ہے" کھیتی یا بکریوںیا شکار کے کتے کے سوا " اس روایت سے بے فائدہ کتے رکھنے کی حرمت واضح ہے اور احادیث مبارکہ میں خود فائدہ مند کتوں کو اس حکم سے مستثنی رکھا گیا ہے جن میں شکاری اور حفاظتی کتے شامل ہیں خواہ زراعت کی حفاظت کے لئے ہوں یا مویشی کی حفاظت کے لئے ہوں، اور اسی پر گھروں اور گلیوں کی حفاظت کے لئے رکھے گئے کتے اور پولیس کے کتے بھی قیاس کئے جائیں گے.
جہاں تک ان کی تجارت کی بات ہے، تو امام مسلم نے ابو مسعود انصاری سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت ، اورزنا کی کمائی،اور کہانت کے پیسے سے منع فرمایاہے، لیکن امام شافعی کے نزدیک کتے کی تجارت درست نہیں برخلاف امام مالک کے کیونکہ انہوں نے اس کی تجارت کو جائز قرار دیا ہے بلکہ سحنون نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس کی کمائی سے حج بھی کرسکتا ہے اور امام ابو حنیفہ نے کاٹنے والے کتے کی استثنا کے ساتھ اس کی تجارت کو جائز قرار دیا ہے.([91])
اس کی دلیل امام نسائی کی روایت کردہ حدیث پاک ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیان کیا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت سے منع فرمایا سوائے شکاری کتے کے، لیکن اس روایت کی سند میں کلام ہے.
مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ بقول: سحنون امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتے کی تجارت درست ہے.

---

91 شرح صحیح مسلم ج ۱۰ ص۲۳۲.

اسی طرح اگر ضرر رساں نہ ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی جائز ہے لیکن امام شافعی کےنزدیک بالکل ناجائز ہے. واللہ أعلم.[92]

ڈاکٹر انس ابو شادی

45 ۔ سونے یا چاندی کے برتن کے استعمال کا حکم
سوال: سونے کا پانی چڑھائے ہوئے برتن کے استعمال کے بارے میں سوال کیا گیا، اور یہ دریافت کیا گیا ،کیاسونے کے استعمال کی ممانعت کا حکم اسے بھی شامل ہے؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیاکہ ناجائز ہے ، کیونکہ سونے کا پانی چڑھائے ہوئے برتن کے استعمال پراصل سونے کے استعمال کی ممانعت صادق آتی ہے.

الشیخ ابن باز مجموع فتاوی ومقا لات ۱۲۴/۴

تبصرہ:
بلاضرورت سونے کی زینت مرد پر حرام ہے، لیکن عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں،جہاں تک سونے کے برتن کی بات ہے تو اس کا استعمال دونوں کےلئے مطلقاً حرام ہے یہاں یہ بأت ذہن نشیں رہے کہ جس دھات پر سونے کا پانی چڑھا یا گیا ہووہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے کیونکہ اسے جداکرنا ممکن نہیں.
علمی رد:
عورتوں کے لئے سونا جائز ہے اور مردوں پر بلاضرورت حرام ہے لیکن بصورت مجبوری مرد کے لئے بھی جائز ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے انہوں نے بیان کیا ہے (میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم لیا اوراسے اپنے داہنے دست مبارک میں رکھا، اور سونا لیا اوراسے اپنے بائیں دست مبارک میں رکھا پھر ارشاد فرمایا: یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں) امام ابو داود نے سند حسن سے اس کی روایت کی ہے اور امام ابن ماجہ کی روایت میں **"حل لإناثهم"** کا اضافہ ہے یعنی ان کی عورتوں کے لئے حلال ہیں.اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيرِ وَالذَّهَبِ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي وَأُحِلَّ لِإِنَاثِهِمْ" (میری امت کے مردوں پرریشم اور سونا حرام کئے گئے لیکن ان کی عورتوں کے لئے حلال کئے گئے) امام ترمذی نے اس کی روایت کی ہے.
واضح رہے کہ سونے اور چاندی کے برتن کا استعمال مردوخواتین دونوں کے لئے حرام ہیں، چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے انہوں نے بیان کیا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿مَنْ شَرِبَ فِي إِنَاءٍ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَاراً مِنْ

92 فتاویٰ دار ا لافتاء المصریۃ: مضمون نمبر۵۹المفتی :فضیلۃ الشیخ عطیۃ صقر، مئی ۱۹۹۷. مضمون نمبر(۱۰٦۷)المفتی: فضیلۃ الشیخ احمد ہریدی۲٦ اکٹوبر۱۹٦۸م.

جَهَنَّمَ﴾ جس نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا تودرحقیقت وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اتارتا ہے".[93]

اورسونے اور چاندی کے علاوہ جیسے لوہا تانبا وغیرہ وغیرہ تو وہ اپنی اصلی حکم جواز پر برقرار ہیں، اس بارے میں حنفی فقہائے کرام کے علاوہ کسی کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ حضرات مذکورہ بالا دھاتوں کی انگوٹھی کو مکروہ قرار دیتے ہیں.
بہرحال جس دھات پر سونے کا پانی چڑھا یا گیا ہوکہ جدا کرنا ممکن نہ ہو تو وہ اس ممانعت میں شامل نہیں ہے. واللہ أعلم.[94]

ڈاکٹرانس ابو شادی

93 امام مسلم نے اس کی روایت کی ہے ملاحظہ ہو ۵۵۰۹.
94 فتاوی دار ا لافتاء المصریۃ: مضمون نمبر(١٠٧٦)المفتی: فضیلۃ الشیخ حسن مامون٢١ محرم ۱۳۷۵ھ۸ سپٹمبر۱۹۵۵م..

باب پنجم نماز

46 - اذان کے بغیر نماز کا حکم
سوال: اذان کے بغیر نماز کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: اذان کے بغیر نماز اداکرنا جائز نہیں کیونکہ اذان فرض کفایہ ہے.
اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 55/6 – 56

تبصرہ:
باجماعت اور تنہا ہرنماز کیلئے اذان اور اقامت سنت ہے ، اگر ان دونوں کے بغیر بھی باجماعت یا تنہا نماز ادا کی تو صحیح ہے ۔
علمی رد:
جمہور علماء کی رائے کے مطابق سفر اور قیام میں باجماعت اور تنہا ہر نماز کیلئے اذان اور اقامت سنت ہے اور یہ کسی حالت میں بھی واجب نہیں اور اگر ان دونوں کے بغیر بھی باجماعت یا تنہا نماز اداکی تو صحیح ہے۔
اور یہی رائے امام اعظم ابو حنیفہ ، امام شافعی اور اکثر علماء کی ہے۔
امام مالک نے کہا کہ صرف مسجد میں باجماعت نماز کی ادائیگی کیلئے (اذان اور اقامت) دونوں واجب ہیں ۔
اور امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ یہ دونوں فرض کفایہ ہیں ، اور ظاھریہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں ہر نماز کیلئے واجب ہیں ، اس سے مراد یہ ہوا کہ انکے لئے جائز نہیں کہ وہ اسکے بغیر نماز اداکریں ۔
اور بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ دونوں نماز کے صحیح ہونے کی شرط ہیں [95]. اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر احمد عید

47 - اذان کے بعد حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – پر درود پاک (الصلاۃ) پڑھنے کا حکم
سوال: اذان کے بعد حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – پر درود پاک (الصلاۃ) پڑھنے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: اذان کے بعد کسی ذکر کا بیان نہ ہونے کی وجہ سے مؤذن اذان کے بعد بآواز بلند حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – پر درود پاک (الصلاۃ) نہ پڑھے۔
اللجنة الدائمة للبحوث العلمية وا لافتاء 6 /101 – 102

تبصرہ:
اذان کے بعد حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – پر درود پاک (الصلاۃ) پڑھنا ممنوع نہیں کیونکہ ایسی کوئی حدیث مبارکہ نہیں جو اس سے منع کرے ، اور عام نصوص (قرآن و حدیث) بھی اسکے مخالف نہیں ۔
علمی رد:

---
[95] المجموع لامام النووی 3 / 90 .

تاریخ میں آیا ہے کہ حضرت بلال – رضی اللہ عنہ – جب اذان سے فارغ ہوتے تو وہ حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کے دراقدس پر کھڑے ہو کر کہتے تھے (السلام علیك یا رسول اللہ) اے اللہ تعالی کے رسول آپ پر سلام ہو ، اور غالبا یہ کہتے: یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – پر فدا ہوں ۔ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – پر سلام ہو ۔ آپ نماز کیلئے تشریف لائیے آپ نماز کیلئے تشریف لائیے ۔ یا رسول اللہ آپ پر سلام ہو[96] ۔

جب حضرت ابو بکر صدیق – رضی اللہ عنہ – مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے ، مؤذن سعد القرظی (اذان کے بعد) آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہتے اے رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – کے خلیفہ آپ پر سلامتی ، اللہ تعالی کی رحمت اور اسکی برکتیں ہوں ، آئیے نماز کی طرف آئیے نماز کی طرف ، اے رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – کے خلیفہ ۔

جب حضرت عمر فاروق – رضی اللہ عنہ – نے عہدہ خلافت سنبھالا ، تو حضرت سعد القرظی (اذان کے بعد) آپ – رضی اللہ عنہ – کے دروازے پر کھڑے ہوکر ایسے ہی کلمات کہتے جیسے حضرت ابو بکر صدیق – رضی اللہ عنہ – کیلئے کہتے تھے ۔ جب حضرت عمر – رضی اللہ عنہ – نے لوگوں سے فرمایا کہ تم مؤمن ہو اور میں تمہارا امیر ہوں چنانچہ آپ کو امیر المؤمنین کا لقب دیا گیا تو مؤذن نے بھی اذان کے بعد " السلام علیك یا امیر المومنین " کہنا شروع کر دیا۔

جب حضرت عثمان بن عفان – رضی اللہ عنہ – مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو اسی پر عمل ہوتا رہا اور مؤذنین اسی پر کابند رہے کہ جب وہ اذان کہتے تو خلفاء پر سلام بھیجتے ، پھر وہ سلام کے بعد نماز کیلئے اقامت کہتے ۔ تو خلیفہ یا امیر تشریف لاتے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے ۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے عہدوں میں مصر ، شام ، حجاز اور دیگر تمام علاقوں میں اسی طرح عمل جاری رہا ۔

جب مصر میں فاطمی بر سر اقتدار آئے تو جوھر الصقلی نے حکم دیا کہ اذان آل بیت کے عمل پر ہو ۔ تو اس میں " حی علی خیر العمل " کے الفاظ اور کلمات کا اضافہ کیا گیا ، اور مؤذن اذان کے بعد محل کے دروازے پر کھڑا ہوتا اور کہتا : السلام علیك یا امیر المومنین ، اور شاید اسکے بعد یہ کہتا تھا " الصلاۃ و السلام علیك یا امیر المومنین و علی آبائك الطاھرین " ، اے امیر المومنین آپ پر اور آپ کے طاہر آباؤ اجداد پر صلاہ اور سلام ہو ۔

جب فاطمی حکومت ختم ہوئی اور ایوبی حکومت قائم ہوئی تو صلاح الدین ایوبی نے انکے تمام شعائر ختم کر دیئے ۔ اور خلیفہ پر سلام کو حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – پر سلام پھیجنے میں بدل دیا ۔ چنانچہ (اس زمانے میں) مؤذن اذان کے بعد کہتا : السلام علیك یا رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ ، اور غالبا وہ کہتا : الصلاۃ و السلام ۔ اور یہ عمل صرف ایوان حکومت تک محدود تھا یعنی شاہی مسجد اور اسی طرح کی دوسری مسجدوں میں یہی عمل تھا آخری ایوبی بادشاہ الملک صالح نجم الدین ایوب نے اپنے زمانۂ حکومت میں مصر اور قاہرہ کے تمام مؤذنوں کو حکم دیا کہ وہ اذان کے بعد منبروں پر " الصلاۃ و السلام علیك یا رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ " بآواز بلند پڑھیں اور اسے عشاء کی آذان تک محدود رکھیں ۔ اور منصور حاجی بن اشرف شعبان بن حسین بن ناصر محمد بن المنصور قلاوون کے زمانے تک اسی پر عمل جاری رہا ۔ اور اس نے حکم دیا کہ مغرب کی اذان کے علاوہ فجر اور دوسری تمام آذانوں کے بعد بھی یہی (الصلاۃ و السلام علیك یا رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ" بلند آواز سے) پڑھا جائے اور مؤذن آجتک بدستور اسی پر عمل پیرا ہیں [97] ۔

---

96 التراتیب الاداریہ ، ج 1 / 75 از الکتانی ۔

97 مجلہ الاسلام جلد دوم ۔ شمارہ 41 ۔ از قلم حسن محمد قاسم ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کے بعد حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ وسلم – پر الصلاۃ و السلام پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ثواب ہے اور بعد کے لوگوں نے اسے لوگوں کو وقت نماز کے شروع ہونے کی اطلاع دینے میں مبالغہ کرنے میں مستحسن قرار دیا ، اور جس چیز کو مسلمان بہتر سمجھیں وہ اللہ تعالی کے نزدیک بھی عمدہ اور بہتر ہے ۔

اور کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (چاروں مذہبوں کی فقہ کی کتاب) میں آیا ہے کہ بعض متأخرین نے اذان کے بعد اور اس سے پہلے کچھ امور کا اضافہ کیا ہے انھیں میں سے رات کو اذان کے بعد (الصلاہ علی النبی – صلی اللہ علیہ و سلم -) اذان سے پہلے تسبیحات اور مناجات کرنا و غیرہ ۔ اور یہ بدعت حسنہ ہے کیونکہ احادیث مبارکہ میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس سے منع کرے اور عمومی نصوص انہیں کا تقاضا کرتی ہیں ۔

اور کسی بھی (نئی) چیز پر بدعت (سیئہ) کا حکم لگانے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے اور واجب تو یہ ہے کہ (حکم لگانے سے پہلے) توقف ، تحقیق اور گہرائی سے غور و خوض اور مطالعہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں کسی ایسے فروعی مسئلہ کے شرعی حکم کی وجہ سے تفرقہ پیدا نہ ہو جسکے بارے میں قرون اولی سے ہی مشاہیر فقہاء کی آراء مختلف ہیں[98].

اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر احمد عید

48 - ترک نماز اور اسے ترک کرنے والے خاندان سے تعامل کی کیفیت

سوال: نماز ترک کرنے والے خاندان سے تعامل کرنے کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: اگر اهل خانہ نماز ادا نہ کرتے ہوں تو وہ مرتد اور کافر ہیں ۔ انکے ساتھ رہنا جائز نہیں ہے۔

شیخ ابن عثیمین ۔ رسالۃ صفۃ صلاۃ النبی – صلی اللہ علیہ و سلم – صـ29 – 30

تبصرہ:

اگر تارک نماز نے نماز کی فرضیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے سستی سے نماز ترک کی تو وہ کافر نہیں اور نہ ہی اسکے اور اسکی بیوی کے درمیاں علیحدگی کرانا جائز ہے۔

علمی رد:

تارک نماز اگر اسکی فرضیت کا منکر ہے تو وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر کافر ہے ۔ اور اگر نماز کی فرضیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس سے سستی اور کاہلی کی وجہ سے نماز ترک ہوئی جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے تو وہ ائمہ اربعہ اور پہلے اور بعد کے عام علما کے نزدیک وہ کافر نہیں ہے ۔

ابن قدامہ نے بیان کیا ہیکہ پوری اسلامی تاریخ میں یہ ثابت نہیں کہ مسلمان حجوں نے ترک نماز کی وجہ سے شوہر اور بیوی میں علیحدگی کرائی ہو ۔ باوجود اسکےکہ ہر زمانے میں نماز ترک کرنے والوں کی تعداد زیادہ رہی ہے ۔

---

[98] مجلہ ا لاسلام کی جلد دوم ۔ شمارہ 48 میں شیخ عبدالرحمن خلیفہ کے مقالے کو دیکھے ، اسی طرح فتاوی دار الافتاء المصریہ ۔ موضوع (177) مفتی فضیلہ شیخ عطیہ صقر ۔ مئی 1997۔

اس بناپر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسکے اور اسکی بیوی کے درمیان (ازدواجی) تعلقات صحیح ہیں [99] ۔
اسی بناپر نماز نہ پڑھنے وا لا شوہر اس وقت تک کافر نہیں سمجھا جاتا جبتک کہ وہ نماز کے واجب ہونے پر ایمان رکھتا ہے ، اور بیوی کو چاہیے کہ اسکو مسلسل نصیحت کرتی رہے ، اور نا امید ہوئے بغیر اسے نماز کی طرف بلاتی رہے اور اسے نماز ترک کرنے کے (برے) انجام کا خوف بھی د لاتی رہے اور اسے ایسی اچھی صحبت دے جو اسے راہ حق پرلے آئے.پس اچھی صحبت ان حا لات میں طلسماتی اثر رکھتی ہے۔
اور انسان ایسی واضح اور بلا واسطہ دعوت نا پسند کرتا ہے جسکی بنیاد مطالبے اور حکم پر ہو اور اس سے فرار اختیار کرتا ہے لیکن اگر اسکا تعلق کسی دیندارگروپ کے ساتھ ہو تو انکے اخلاق اور صفات بغیر کسی حکم اور مطالبے کے اس میں سرایت کر جائیں گی ۔
سچ فرمایا ہے نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – :" المرء علی دین خلیلہ "، تر جمہ: "انسان اپنے دوست کے مذھب پر ہوتا ہے".
اور اس طرح نماز نہ پڑھنے والی بیوی کا حکم بھی یہی ہے اور اسکے شوھر کیلئے بھی وہی نصیحتیں ہیں کہ وہ اسے نماز اور استقامت کی طرف لائے اور اسے طلاق دینے میں جلدی نہ کرے ، اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالی کا یہ فرمان یاد رکھے: ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طہ – 132)، تر جمہ: اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم فرمائیں اور اس پر ثابت قدم رہیں۔
اور ان دونوں کو چاہیے کہ وہ نماز تہجد اور فجر کی دعاؤں سے مدد حاصل کریں ، اور وہ اللہ تعالی سے سوال کرے کہ وہ اسکو اپنے آگے سجدہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور کثرت سے یہ دعا مانگے: ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً﴾ (الفرقان 74)، ترجمہ : اے ھمارے رب ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری او لاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پر ہیزگاروں کا پیشوا بنادے۔
اور اسے اللہ تعالی کا یہ فرمان بھی یاد رکھنا چاہئے: ﴿كَذَلِكَ كُنتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً﴾ (النساء 94) ، ترجمہ : اس سے پیشتر تم (بھی) تو ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا (اور تم مسلمان ہو گئے) پس (دوسروں کے بارے میں بھی) تحقیق کر لیا کرو ۔ بیشک اللہ تعالی تمھارے کاموں سے خبردار ہے۔
اور اسے جان لینا چاہیے کہ اگر اللہ تعالی بے نمازی کو ھدایت عطا فرما دے تو یہ اسکے دین کیلئے بہتر ہے اور اسکے لئے دنیا اور اسکی تمام اشیاء سے کہیں زیادہ ہے۔
اور اسے چاہیے کہ وہ اسے مختلف انداز اور طریقوں سے نماز کی دعوت دے ، اور بہتر طریقہ تو یہ ہیکہ اسے علماء اور نمایاں واعظیں کے مؤثر وعظ و نصیحت سنائے اور اسے سنانے کیلئے براہ راست طریقہ اختیار نہ کرے بلکہ ایسا طریقہ تلاش کرے کہ جس سے وہ اکتا ہٹ محسوس نہ کرے اور چاہیے کہ اللہ رب العزت کی صفات ، مخلوق پر اسکے انعام و اکرام ، تو بہ کرنے والوں کے قصوں ، جنت ، دوزخ سے متعلق بیانات ، وعظ و نصیحت اور آسان لیکچر

[99] فضیلت ڈاکٹر عبداللہ الفنیسان کہتے ہیں : پوری اسلامی تاریخ میں آجتک ایسی بات سامنے نہیں آئی کہ کسی شخص کو ترک نماز کی وجہ سے مرتد کے طور پر قتل کیا گیا ہو ۔ علاوہ ازیں اس قول کی بناپر اسکی بیوی کو طلاق اور اسکی او لاد نا جائز ہوگی جبکہ نماز ترک کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور میرے نزدیک سستی اور عدم اہتمام کی وجہ سے نماز ادا نہ کرنے والوں کی تکفیر نہ کرنے وا لا قول صحیح ہے ۔ اللہ اعلم بالصواب .
ڈاکٹر سعود بن عبداللہ الفنیسان سابق ڈین کلیہ الشریعہ جامعہ امام محمد بن سعود ۔ ویپ سائیڈ: ا لاسلام الیوم . بتاریخ 8 ذیقعد 1427 ھ

رسے آغاز کرے، نماز اور اس طرح کے دوسرے احکام سے شروع نہ کرے اور اسکے ساتھ عجلت بھی نہ کرے ۔ اللہ اعلم بالصواب.
ڈاکٹر احمد عید

49۔ نماز کے وقت عمال (محنت کش) کو کام سے منع کرنے کا وجوب

سوال: نماز کے وقت (اسٹاف) کام کرنے والوں کو کام سے روکنے کے بارے میں حکم دریافت کیاگیا ہے۔

خلاصۂ فتوی: اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جونہی نماز کے لیے اذان دی جائے کام سے روکنا واجب اور لازمی ہے ۔

الشیخ ابن جبرین الدر الثمین ص 28

تبصرہ :
کارکن کے لیے یہ ضرووی نہیں کہ وہ پانچوں نمازیں پہلے وقت میں ادا کرے ۔ اگرچہ وقت کے پہلے حصے میں نماز کی ادائیگی افضل ہے۔

علمی رد:
نماز کا وقت آغاز سے انتہا تک وسیع ہوتا ہے ، اس لیے کسی بھی عامل (کام کرنے والے) کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر پانچوں نمازیں اپنے پہلے وقت میں ادا کرے، اگرچہ پہلے وقت میں نماز کے لیے جلدی کرنا افضل ہے ، لیکن اس کا محل یا موقع تب ہے جب انسان کسی ایسے کام میں مصروف نہ ہو کہ اگر اسے چھوڑ کر وہ پہلے وقت میں نماز کی ادائیگی کے لیے چلا جائے تو اس کام کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے میں دوسری نماز کے وقت کے داخل ہونے سے پہلےتک وہ نماز کو مؤخر کر سکتا ہے ۔ جہاں تک نماز جمعہ کا تعلق ہے تو اس کے لیے واجب یہ ہے کہ خرید و فروخت اور ہر اس کام کو جو نماز جمعہ کی پہلی اذان کے بعد سعی جمعہ کے لیے سد راہ ہو اسے ترک کردے ۔ اور زوال شمس کے بعد اللہ رب العزت کے اس فرمان پر عمل کرے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِي لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ (الجمعہ 9)، تر جمہ: اے ایمان والو ! جب (تمھیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن تو دوڑ کر جاؤ اللہ کے ذکر کی طرف اور (فورا) چھوڑ دو خرید و فروخت ۔

اس آیت کریمہ میں ایسی کوئی بات نہیں جو جمعہ کے روز کاروباری اداروں کو بند کرنے کے وجوب پر د لالت کرتی ہو اور نہ ہی نماز کےے وقت اور نہ ہی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ۔اس اعتبار سے کاروباری مراکز کے کھلے رکھنے یا بند کرنے کی اباحت اپنے اصل پر باقی ہے ۔ اللہ جل مجدہ کا فرمان ہے: ﴿فَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾

(الجمعہ 10)، تر جمہ: پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل سے۔
یہ آیت کریمہ کاروبار کے لیے نکلنے ، اپنی ضرویات کے لیے تدبیر کرنے اور رزق کی تلاش کے معاملے میں واضح ہے ۔ یہ حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ جواز اور اباحت کے لیے ہے ۔ ایسا کوئی شرعی حکم نہیں جس کے بموجب جمعہ کے دن تجارتی یا کاروباری محل کا بند کرنا واجب ہو ۔ البتہ شرعا جو چیز واجب ہے وہ نماز جمعہ کے لیے سعی کرنا ہے ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

باب ششم باجماعت نماز اور امامت

50 - با جماعت نماز کا حکم
سوال: با جماعت نماز کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنا ہر مکلف پر فرض عین ہے۔
الشیخ ابن باز تبصرہ وذکری صـ 53 – 57
الشیخ سعید عبدالعظیم www.alsalafway.com

تبصرہ:
جمہور علماء کے نزدیک با جماعت نماز ادا کرنا ہر مکلف پر فرض عین نہیں ہے بلکہ یہ سنت مؤکدہ یا فرض کفایہ ہے ، اگر بعض لوگ با جماعت نماز ادا کر لیں تو باقیوں پر سے (جماعت) ساقط ہو جاتی ہے۔
علمی رد:
با جماعت نماز کے حکم کے بارے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے ۔ امام احمد بن حنبل – رضی اللہ عنہ – کی رائے کے مطابق با جماعت نماز کی قدرت رکھنے والے ہر شخص پر یہ فرض عین ہے انکی دلیل حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کی یہ حدیث مبارکہ ہے ۔ کہ : آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے ایک نابینے آدمی کو گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے انکار فرما دیا ، اور یہ با جماعت نماز کے واجب ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اگر یہ واجب نہ ہوئی تو آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – اسے اجازت دے دیتے۔
انکی دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ – رضی اللہ عنہ – سے مروی مسلم شریف کی یہ حدیث مبارکہ ہے کہ : ان النبی – صلی اللہ علیہ و سلم – قال: "لقد هممت أن آمر فتيتي فيجمعوا لي حزما من الحطب "، اس کا مفہوم یہ ہیکہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : میں نے ارادہ کیا کہ اپنے نوجوانوں کو لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں ۔ پھر ایسے لوگوں کی طرف آؤں جو بغیر عذر کے گھروں میں نماز ادا کرتے ہیں ، اور انکے گھروں کو آگ لگا دوں ۔
یہ حدیث مبارکہ بھی با جماعت نماز کے واجب ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔
جمہور علماء کرام (جیسے) امام ابو حنیفہ – رضی اللہ عنہ – ، امام مالک – رضی اللہ عنہ – اور اکثر فقہاء شافعیہ کے نزدیک با جماعت نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے۔
انہوں نے اس متفق علیہ حدیث شریف سے استد لال کیا ہے کہ : أن رسول الله – صلی اللہ علیہ و سلم – قال "صلاة الجماعة تفضل على صلاة الرجل وحده بسبع و عشرين درجة " ([100])۔
حضور نبی اکرم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : با جماعت نماز ادا کرنا تنہا نماز ادا کرنے پر ستائیس درجے قضیلت رکھتا ہے ۔
یہ حدیث جواز پر د لالت کرتی ہے کیونکہ واجب کیلئے افضل و غیرہ کے الفاظ نہیں کہے جاتے ، اور جمہور علماء نے بیان فرمایا ہے کہ حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کا نابینا صحابی (حضرت ابن ام مکتوم) کو با جماعت نمازسے پیچھے رہنے کی اجازت نہ دینا اسکے واجب ہونے کی دلیل نہیں یہانتک کہ عذر والوں پر بھی ۔ یہ اس وجہ سے کہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – حضرت ابن ام مکتوم کی نیکی اور بھلائی کی خواہش سے واقف ہیں، اور آپ – صلی اللہ علیہ

[100] بخاری و مسلم اور اصحاب سنن نے روایت کیا یہ ترمذی کے الفاظ میں 2/5 .

و سلم – انکی ذہانت اور کسی بھی راہنما کے بغیر جماعت میں شریک ہونے کی قدرت رکھنے سے بھی واقف ہیں ۔
جبکہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے (حضرت ابن ام مکتوم) کے علاوہ دوسرے صاحب عذر کو انکے گھر میں نماز ادا کرنے اور مسجد میں جماعت کیلئے نہ جانے کی اجازت فرمائی تھی۔
چنانچہ حضرت امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کی ہے ، حضرت عتبان بن مالک جو کہ غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام میں سے ہیں، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ میری نظر کمزور ہوگئی ہے اور میں نمازمیں اپنی قوم کی امامت کرتا ہوں ۔ جب بارش ہوتی ہے تو میرے اور انکے درمیان برساتی نالہ حائل ہو جاتا ہے اور میں انکی مسجد میں جا کر انہیں نماز نہیں پڑھا سکتا ، یا رسول اللہ میری شدید خواہش ہے کہ آپ میرے یہاں تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز ادا فرمائیں ۔ تاکہ میں (اس جگہ) کو جائے نماز نبالوں ۔
تو آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے اسکی دعوت قبول فرمائی اور اسکے گھر میں (نماز کی) دو رکعتیں ادا فرمائیں ۔
اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حدیث جو جماعت سے پیچھے رہ جانے والوں کے گھروں کو جلا دینے کےبارے میں ہے یہ حدیث جماعت کے واجب ہونے پر د لالت نہیں کرتی ۔ کیونکہ با جماعت نماز اگر واجب ہوتی تو پیچھے رہنے والوں کے گھروں کو جلانا صحیح ہوتا اور آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – انکی نا فرمانی کی سزا کے طور پر انکے گھروں کو جلانے میں تاخیر نہ فرماتے۔
لیکن آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے ایسا نہ کیا جو اسکے واجب نہ ہونے کی دلیل ہے اور اسکا مقصد یہ ہیکہ یہ (با جماعت نماز) اھم ہے یا یہ کہ اس سے مراد حقیقی معنی نہیں بلکہ ڈرانا مقصود تھا کیونکہ جلانا صرف کفار کیلئے ہے اور مسلمانوں کو جلانے کی ممانعت پر اتفاق ہے ، یا اس سے مراد نماز جمعہ ہے، یا یہ کہ پہلے پہل (ابتدائے اسلام میں) تمام لوگوں کو پیغام حق پہنچانے اور انکی راہنمائی کیلئے حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کی انکو جمع کرنی کی خواہش کی وجہ سے فرض تھی اور پھر اسکی فرضیت منسوخ ہوگی ہو ۔
اور اکثر اھل علم کی رائے یہ ہیکہ با جماعت نماز ادا کرنا فرض کفایہ ہے ۔ اھل محلہ کو چاہیے کہ وہ اسے قائم کریں اور اگر ان میں سے بعض نے ادا کرلی تو باقیوں سے (جماعت کی فرضیت) ساقط ہو جائیگی ۔ اور انکے حق میں سنت ہوگی ۔ اور یہ اس لئے کہ موذن کی اذان کا جواب دینا اور با جماعت نماز ادا کرنا اسلامی شعائر کا اظہار ہے ۔
اور اسی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ یہ تمام د لائل کی جامع ہے ۔
اور ایک جماعت کی رائے ہے کہ اگر کسی کی بیوی اور بچے ہوں تو وہ انکے ساتھ گھر میں با جماعت نماز ادا کرتا ہے ۔ اور اگر وہ انہیں چھوڑ کر مسجد میں لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرے تو وہ نماز ترک کرتے ہیں ۔ (اس صورت میں) انکو چھوڑ نے اور مسجد میں اپنی نماز ادا کرنے سے افضل یہ ہیکہ وہ انکے ساتھ با جماعت نماز ادا کرے ۔ جبتک کہ مسجد میں اسکے علاوہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو لوگوں کی امامت کرے ۔[101]
اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر احمد عید

---

[101] تفسیر قرطبی ج 1 – 348 ۔ المغنی از ابن قدامہ ج 2 ۔ صـ 2 .

51 - فاسق اور بدعتی کی امامت کا حکم

سوال: فاسق اور بدعتی کی امامت کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: فاسق اور بدعتی کے پیچھے نماز ادا نہ کی جائے۔
اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 7 / 364

تبصرہ:
صحابہ کرام اور تابعین فرسقوں اور بدعتیوں کے پیچھے نماز ادا کرنے تھے۔
ہر وہ شخص جسکی اپنی نماز صحیح ہے تو اسکے (پیچھے) دوسروں کی نماز بھی صحیح ہے۔

علمی رد:
امام بخاری – رضی اللہ عنہ – نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر – رضی اللہ عنہ – حجاج بن یوسف الثقفی کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے ، اور امام مسلم نے روایت کی ہے کہ ابو سعید الخدری – رضی اللہ عنہ – نے " مروان " کے پیچھے نماز عید ادا کی اور حضرت عبداللہ بن مسعود – رضی اللہ عنہ – نے ولید بن عقبۃ بن ابی معیط کے پیچھے نماز ادا کی اور وہ شراب پیتے تھے (اور اسی وجہ سے) ایک مرتبہ اس نے نماز فجر کی چار رکعتیں پڑھادیں تو حضرت عثمان – رضی اللہ عنہ – اس وجہ سے اسے کوڑے مارے تھے ، اور صحابہ کرام اور تابعین ابن عبید کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے در آنحا لانکہ اس پر بے دینیت کا الزام تھا اور وہ گمراہی کی طرف بلایا کرتے تھے۔
ہر وہ شخص جسکی اپنی نماز صحیح ہے اسکے (پیچھے) دوسروں کی نماز بھی صحیح ہے لیکن منحرفین کے پیچھے نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔
ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی شخص نے ایک قوم کی امامت کی ، اور اس نے قبلے کی سمت تھوکا جبکہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – اسے دیکھ رہے تھے چنانچہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے (ان لوگوں سے) فرمایا کہ (اب) وہ تمھیں نماز نہ پڑھائے ۔ تو انہوں نے اس وجہ سے اسے نماز پڑھانے سے منع کر دیا ۔ جب اس نے حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – سے شکایت کی تو آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے اسے فرمایا: "نعم، انك آذيت الله و رسولہ"([102])، "ھاں، تم نے اللہ اور اسکے رسول کو اذیت دی ہے"۔
اگر نیک شخص موجود ہو تو اسکے پیچھے نماز ادا کرنا افضل ہے اور اگر کسی بدنام اور منحرف کے پیچھے نماز اس وجہ سے ضروری ہو جائے کہ اسکا کام امامت ہے تو اسکے پیچھے نماز جائز ہے لیکن اسکے ساتھ اسے یہ نصیحت کرنا واجب ہے تاکہ لوگ اس سے راضی اور اسکی امامت سے مطمئن ہوں ۔ چنانچہ ابن ماجہ نے اپنی سنن ، اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ایک حدیث مبارکہ روایت کی ہے " اللہ تعالی تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں کرتا ۔ وہ امام جسے قوم نا پسند کرتی ہو ۔ اور وہ عورت جس نے اس حالت میں رات گزاری کہ اسکا شوھر اس سے ناراض تھا ، قطع تعلقی کرنے والے دو بھائی"، گو کہ فاسق کے پیچھے نماز ادا کرنا مکروہ ہے مگر یہ صحیح ہے باطل نہیں ۔

---

[102] ابو داود ، اور ابن حبان نے روایت کی ہے ابو داود (اسکے حکم کے بارے میں) خاموشی اختبار کی ،یہ حدیث مقبول ہے۔

اور امام بخاری اور امام مسلم کی بیان کردہ روایات کے علاوہ امام بیھقی کی یہ حدیث بھی اسکی تائید کرتی ہے ۔"صلوا خلف کل برّ وفاجر"، ہر نیک اور بدکار کے پیچھے نماز ادا کرو، ہر نیک اور بدکار کے پیچھے نماز ادا کرو اور ہر نیک اور بدکار کے ساتھ ملکر کوشش کرو۔
شیخ عبداللہ بن حمید کے فتاوی میں ہے کہ : اھل علم کی اکثریت نے بیان کیا ہیکہ فاسق کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح ہے ۔ اور جس نے اس کے پیچھے نماز ادا کی اس کو حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کے اس فرمان :کے مطابق اسے نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا جاتا ہے جسمیں آپ نے فرمایا: " صلوا خلف من قال لا الہ ا لا اللہ " ([103]) ۔ ہر اس کے پیچھے نماز ادا کرو جس نے " لا الہ ا لا اللہ " کہا ہے۔ اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر احمد عید

52- امام کیلئے نماز کو طویل کرنے کے قواعد

سوال: با جماعت نماز کو طویل کرنے کے قواعد کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: با جماعت نماز طویل کرنیکا قاعدہ یہ ہے کہ سنت کی اتباع کی جائے نہ کہ مقتدیوں کی خواہش کی ۔

الشیخ ابن عثیمین ۔ کتاب الدعوہ (5) 90/2 – 91

تبصرہ:

نماز کی طوالت کا مسألہ لوگوں کی قوت برداشت پر منحصر ہے نہ کہ امام کی خواہش پر کہ وہ جس سنت کا چاہیے انتخاب کرے ، جسمیں طویل اور مختصر نماز میں ، ہر ایک کیلئے مناسب اورمختلف پیمانے ہیں ۔

علمی رد:

امام نووی کی کتاب " ا لاذکار " میں آیا ہے : سنت یہ ہیکہ نماز فجر اور ظہر میں سورۃ ق اور الحجرات جیسی طوال مفصل ([104]) طویل سورتیں ، عصر اور عشاء میں سورۃ نبأ سے الضحی تک درمیانی سورتیں اور مغرب میں سورۃ الضحی کے بعد سے الناس تک کی چھوٹی سورتوں میں سے کوئی سورت پڑھی جائے۔

علماء کرام نے فرمایا : امام کیلئے مستحب یہ ہے کہ وہ قرات قرآن اور تسبیحات مختصر پڑھے اور مستحب کو بھی بطریق کمال ادا نہ کرے ، اور اکیلا نماز ادا کرنے وا لا ہے تو طویل اور درمیانی سورتیں ، اور رکوع و سجود میں طویل تسبیحات پڑھے۔

حضرت ابو ھریرہ – رضی اللہ عنہ – سے مروی حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کی حدیث مبارکہ ہے کہ :"اذا صلی أحدکم للناس فلیخفف فإن فیھم السقیم والضعیف والکبیر"([105])۔

اگر تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے مختصر کرے کیونکہ ان میں کوئی بیمار ، ناتوان اور بوڑھے بھی ہیں اور جب اکیلا اپنے لئے نماز ادا کرے تو جتنا چاہے اسے لمبا کرے.

---

103 ابو نعیم نے 1 / 320 ۔ دارقطنی 2 / 56 پر روایت کی ہے۔

104 مفصل : سورۃ ق اور الحجرات سے لیکر آخر تک قرآن کریم کی تمام سورتوں کو مفصل کہا جاتا ہے اسکی تین اقسام ہیں ۔ طویل : سورۃ ق سے سورۃ عم (نبأ) تک ، درمیانی : سورۃ نبأ سے سورۃ الضحی تک ۔ جبکہ چھوٹی سورتیں الضحی سے الناس تک ہیں۔

105 امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ھریرہ کے علاوہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور انکی بعض روایات میں ذا الحاجہ یعنی ضرورتمند کا لفظ آیا ہے۔

نماز کو لمبا کرنا مکروہ ہے ، اگر وہ (امام) ایسی قوم کو نماز پڑھائے جو کہ محصور ہے اور امام کو معلوم ہے کہ وہ طویل نماز کو ترجیح دیتے ہیں تو اس حالت میں مگر وہ نہیں بلکہ مستحب ہے۔

کیونکہ ممانعت انکے لئے ہےتو جب وہ اس پر راضی ہیں تو پھر مستحب ہے ، اور بعض اوقات نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – کی طویل قراءت کے بارے میں صحیح احادیث مبارکہ کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔

اور اگر امام انکے حال سے نا واقف یا ان میں وہ بھی ہیں جو لمبی قراءت کو نا پسند کرتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو پسند کرتے ہیں تو طویل نہ کرے ، اور صحیح احادیث مبارکہ اسی کی تائید کرتی ہیں -

اور انہی میں سے ایک حدیث حضرت انس – رضی اللہ عنہ – سے مروی ہے کہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا: "إنی لأقوم فی الصلاۃ أرید أن أطول فیھا فاسمع بکاء الصبی ".

میں جب نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو میں اسے لمبا کرنا چاہتا ہوں ۔ پھر بچے کا رونا سنتا ہوں تو میں اسکی ماں پر مشقت کو نا پسند کرتے ہوئے اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں (اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے) اور اگر وہ (لوگ) طویل نماز کو پسند کرتے ہیں مگر مسجد ایسی جگہ یہ ہے جہاں لوگ امام کے نماز شروع کرنے کے بعد بھی شامل ہوتے ہیں تو پھر نماز کو طویل نہ کرے ([106])۔

نماز کو طویل کرنے کا معاملہ لوگوں کی برداشت پر منحصر ہے ، امام کی مرضی پر نہیں کہ وہ جس سنت کا چاہیے انتخاب کرے جس میں طویل نماز اور مختصر نماز کے ، ہر ایک کیلئے مناسب اور مختلف پیمانے ہیں ([107])۔

سنت میں سورہ اعراف کی تلاوت کرنا وارد ہے ([108]) اور اسی طرح چھوٹی سورتوں کی تلاوت بھی سنت ہے [109] اور یہ امام کی مرضی پر منحصر نہیں کہ وہ چاہیے تو سورہ اعراف پڑھے اور چاہیے تو چھوٹی سورتیں پڑھے بلکہ یہ مسئلہ لوگوں کی برداشت پر منحصر ہے۔ اللہ اعلم بالصواب.

ڈاکٹر احمد عید

---

[106] المجموع از نووی 4 / 124 .

107 سنن ابی داود میں صہ 814 پر عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور اپنے داد سے روایت کی ہے ۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – سے فرض نمازوں کی امامت میں طویل اور چھوٹی سورتوں کی تلاوت سنی ہے ۔

اور سنن الترمذی میں صہ 307 پر قطبہ بن مالک سے مروی ہے آپ نے کہا : میں نے رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – کو فجر کی پہلی رکعت میں النخل باسقات یعنی سورہ ق کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے ۔

اور آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – کے بارے میں مروی ہے کہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے صبح سورہ واقعہ پڑھی تھی اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نماز فجر میں 60 سے 100 آیات کریمہ تک تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے " اذا الشمس کورت " کی تلاوت فرمائی -

108 سنن ابی داود کے صہ 814 پر مروان بن حکم – رضی اللہ عنہ – سے مروی ہے کہ آپ نے کہا : کہ مجھ سے زید بن ثابت – رضی اللہ عنہ – نے کہا : تجھے کیا ہے ؟ کہ تم مغرب میں چھوٹی ہی سورتیں پڑھتے ہو جبکہ میں نے مغرب رسول اللہ – صلی اللہ علیہ و سلم – کو طولی الطولیین ، پڑھتے دیکھا ہے ۔ آپ نے کہا کہ میں نے پوچھا ۔ یہ طولی الطولیین سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا سورہ اعراف اور سورہ انعام ۔

109 سنن الترمذی کے صہ 310 پر عبداللہ بن بربرہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا :

رسول کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نماز عشاء میں سورہ الشمس ، سورہ الضحی اور ان جیسی سورتوں کی تلاوت فرمائی ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے نماز عشاء میں سورہ التین اور سورہ الزیتون کی تلاوت فرمائی اور حضرت عثمان بن عفان – رضی اللہ عنہ – کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نماز عشاء میں درمیانی سورتیں جسے المنافقوں اور اس طرح کی دوسری سورتوں کی تلاوت کرتے تھے

اور حضور نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – کے صحابہ کرام اور تابعین کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اس سے زیادہ اور کم بھی پڑھا ہے اور انکے نزدیک اس مسئلے میں وسعت ہے ۔

اس مسئلے میں سب سے افضل بات وہ ہیکہ جو نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – کے با رے میں مروی ہیکہ آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے نماز عشاء مینسورہ الشمس ، سورہ التین اور سورہ الزیتون کی تلاوت بھی فرمائی ہے ۔

53- جس مسجد میں قبر ہو اس میں نماز ادا کرنے کا حکم
سوال: جس مسجد میں قبر ہو اس میں نماز ادا کرنے کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: وہ مساجد جن میں قبریں ہوں ان میں نماز ادا نہ کی جائے ، ان میں نماز ادا کرنا حرام ہے۔
الشیخ ابن باز ۔ مجموع فتاوی مقا لات 5 / 388 – 389

تبصرہ:
اگر نماز سے نمازی کا مقصد قبر کی تعظیم ہو تو یہ حرام اور باطل ہے ۔ قطع نظر اسکے کہ قبر کہاں ہے ۔ اگر یہ مقصد نہ ہو اور قبر نماز کے سامنے ہو تو نمازی صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ مکروہ ہے اگر قبر نمازی کے سامنے نہ ہو تو مکروہ بھی نہیں ہے۔
علمی رد:
امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کی ہے کہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا: "قاتل اللہ الیھود اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد"، اللہ تعالی نے یہودیوں پر لعنت بھیجی کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔
اور امام مسلم نے روایت کی ہے کہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے اپنے وصال مبارک سے پانچ (دن) پہلے فرمایا : کہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنا لیتے تھے خبر دار، تم قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) نہ بنانا، بے شک میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں ۔
امام بخاری اور ابن ماجہ کے علاوہ (راویوں کی) ایک جماعت نے آپ – صلی اللہ علیہ وسلم – کی یہ حدیث روایت کی ہے "لا تصلوا الی القبور و لا تجلسوا علیھا"، قبروں کی طرف (منہ کر کے) نماز ادا نہ کرو اور نہ ہی ان پر بیٹھو ۔
علماء کرام نے ان احادیث مبارکہ کے بارے میں (اپنی) آرا ء کا اظہار کیا ہے ۔ چنانچہ بعض نے کہا: قابل مذمت بات یہ ہے کہ دفن کے بعد مسجد بنائی جائے ۔ اور یہ قابل مذمت نہیں کہ پہلے مسجد کی تعمیر ہو اور پھر اسکے ایک حصے (یا کو نے) میں مسجد وقف کرنے والے یا کسی اور کو دفن کیا جائے ۔ لیکن امام عراقی نے کہا : کہ ظاہرا ان میں کوئی فرق نہیں، اگر کسی نے اس مقصد کے لئے مسجد بنائی کہ اسکے کچھ حصے میں اسے دفن کیا جائے تو یہ بھی لعنت میں داخل ہی نہیں بلکہ مسجد میں دفن کرنا حرام ہے ۔ اور اگر اس نے یہ شرط رکھی کہ اسے وہاں دفن کیا جائے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ مسجد وقف کرنے کے مقصد کے خلاف ہے۔
اگرچہ اس حدیث سے بعض علماء نے (نھی)سے ممانعت ، تو بعض دوسرے علماء نے اس سے کراہت مراد لی ہے یعنی قبر کی جانب نماز صحیح تو ہے مگر کراہت کے ساتھ ہے۔
اور جنہوں نے اسکو صحیح کہا ان میں پھر اختلاف ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ قبر خواہ نمازی کے سامنے یا پیچھے ہو یا دائیں یا بائیں جانب ہو توبھی (نماز) مکروہ ہے۔
دوسروں نے کہا : اگر قبر نمازی کے سامنے ہو تو مکروہ ہے کیونکہ اسی حالت میں وہ (قبر) کو مسجد بناتا۔ اور اس میں یا اسکی طرف (منہ کر کے) نماز ادا کرتا ہے ۔ اور اگر قبر (نمازی کے) پیچھے یا اسکے دائیں یا اسکے بائیں ہو تو کراہت نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ ، امام مالک ، اور امام شافعی) کے نزدیک، اگر قبر نمازی کے سامنے ہو تو نماز صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ مکروہ ہے اور اگر قبر نمازی کے سامنے نہ ہو تو کراہت بھی (بلکہ صحیح ہے) جبکہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک حرام اور باطل ہے۔
اور یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ قبر مسجد میں ہو اور اگر اس سے الگ ہو اور لوگ مزار میں یا اس حصے میں جہاں قبر ہے نماز ادا نہیں کرتے بلکہ مسجد میں ادا کرتے ہیں تو اسکے جائز ہونے ۔ حرام یا مکروہ نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ۔
خلاصہ کلام یہ ہیکہ قبر کی طرف نماز ادا کرنے کا مقصد اگر قبر کی تعظیم ہے تو یہ حرام اور باطل ہے قطع نظر اسکے کہ قبر کہاں ہے ۔ اور اگر یہ مقصد نہ ہو اور قبر نمازی کے سامنے نہ ہو تو کراہت بھی نہیں ہے ([110]) ۔ اللہ اعلم بالصواب۔
ڈاکٹر احمد عید

54- مسجد میں جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنے کا حکم
سوال: مسجد میں جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصۂ فتوی: جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے ۔ اور قالیں جوتوں کے ساتھ نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں ۔
شیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی و رسائل 12 / 387
تبصرہ:
کھلی فضا یا جگہ جو آلودگی سے پاک ہو وہاں جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں کوئی ممانعت نہیں اور اگر مسجد میں صاف ستھری جائے نماز بچھی ہوں تو ہمیں چاہتے کہ ہم انھیں آلودگی سے بچائیں خواہ وہ (آلودگی) پاک ہی کیوں نہ ہو ۔
علمی رد:
مساجد کی تعمیر ، انہیں آباد ، انکی نگہداشت اور ان میں بکھری ہوئی چیزوں کو درست کرنا سنت ہے ، حضرت عثمان بن عفان – رضی اللہ عنہ – سے مروی ہے ۔ آپ نے فرمایا : کہ میں نے رسول مکرم – صلی اللہ علیہ و سلم – کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "مَنْ بَنَى لِلّهِ مَسْجِداً بَنَى اللّهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الْجَنَّةِ" (امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کی ہے)، ترجمہ: جو اللہ تعالی کیلئے مسجد تعمیر کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے لئے اسکی مانند جنت میں (محل) تعمیر کرتا ہے۔
اور فقھاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ مسجدوں کو گندگی اور نجاستوں سے پاک رکھنا واجب ہے اور نا پاک چیزیں مسجد میں لے جانا ، یا وہ شخص جسکے بدن یا کپڑوں پر نجاست یا زخم ہو اسے داخل ہونے کی اجازت دینا جائز نہیں ۔
اور مسجدوں کو آلودگی (خواہ وہ پاک ہی کیوں نہ ہو) سے بچانا ، مسجد میں جھاڑو دینا، اسکی صفائی کرنا ، اور اس سے بلغم ، تھوک اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اسمیں نظر آئیں تو انہیں زائل کرنا بھی سنت ہے۔
صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت انس – رضی اللہ عنہ – سے مروی ہے کہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے مسجد میں تھوک دیکھا تو اسے اپنے دست مبارک سے کھرچ دیا۔

[110] فتاوی دار الافتاء المصریہ الموضوع 56 . مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997 .

اور آپ – صلی اللہ علیہ و سلم – نے فرمایا : مسجد میں تھوکنا خطا ہے اور اسے دفن کرنا اسکا کفارہ ہے۔
اور مسجدوں میں بد بو پھیلانا (بھی) نا پسندیدہ چیز ہے (کیونکہ) آپ – صلی اللہ علیہ وسلم – کی حدیث مبارکہ ہے : "أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْنَا أَوْ قَالَ فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا" ([111])،
ترجمہ: جس (شخص) نے لہسن یا پیاز کھایا تو وہ هم سے علیحدگی اختیار کرے یا هماری مساجد سے کنارہ کش رہے۔
مروی ہے کہ امام ابو حنیفہ – رضی اللہ عنہ – نے ایک شخص کو مسجد کے ستوں سے اپنے موزے صاف کرتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اسے فرمایا کہ اگر تو اسے اپنی داڑھی سے صاف کرتا تو یہ تمھارے لئے بہتر تھا ([112])۔
اور مسجد میں داخل ہونے والے ہر شخص کو چاہئے کہ مسجد کو آلودگی سے بچانے کیلئے اس میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اور چمڑے کے موزے اتار دے ۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ جوتے پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہونا خلاف ادب ہے ۔
حضرت علی – رضی اللہ عنہ – کے بارے میں مروی ہے کہ آپ – رضی اللہ عنہ – کے پاس جوتوں کے دو جوڑے تھے ، جب آپ – رضی اللہ عنہ – وضو کرتے تو ان میں سے ایک پہن کر مسجد کے دروازے تک (جاتے) پھر اسے اتار کر دوسرا پہن لیتے تھے اور مسجد میں نماز کی اپنی جگہ داخل ہوتے ([113])۔
اور یہ وہ وقت تھا جب مسجد کا فرش کچا ہوتا تھا ، تو آج جب مسجدوں میں جائے نمازیں اور قالین بچھے ہوئے ہوں ، تو آپ کا کیا خیال ہے۔
پس مسجد کے صاف ستھرے فرش ، جائے نماز کی حفاظت انتہائی ضروری ہے خواہ آلودہ اشیاء پاک ہی کیوں نہ ہوں ، جوتوں کے ساتھ مسجدوں‌میں داخل ہونے کے جائز ہونے کا فتوی شریعت اور عقل کے خلاف ہے ۔ کیونکہ ان مساجد میں قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں جنکو روزانہ آ لات اور مشینوں سے صاف کیا جاتا ہے تاکہ یہ بہترین حالت میں ہوں جبکہ جوتوں میں اکثر گندگی اور شاید نجاست بھی ہوتی ہے اور جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنا مستحب نہیں بلکہ اجازت کے طور پر ہے کیونکہ یہ اجازت نماز کے اصل مفہوم میں سے نہیں ۔
شیخ محمد صالح المنجد کی نگرانی میں سوال و جواب کے زیر عنوان دیئے جانے والے اسلامی فتوؤں میں ہے کہ ۔
آج کل مسجدوں میں قالین بچھے ہوتے ہیں چنانچہ جوتے پہنے ہوئے مسجد میں داخلہونے سے یہ گندے ہو سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بعض لا پرواہ لوگ گندگی و نجاست سے آلودہ اپنے جوتوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے ہوں ۔ اور اگر تمام نمازیوں کو جوتے پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے تو ہمیں مسجد کی صفائی کیلئے ہر روز نہیں بلکہ ہر نماز کے بعد صفائی کیلئے صاف کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد درکار ہوگی، اور هم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص بھی مٹی ، گرد و غبار کے علاوہ گندگی اور نجاستوں سے بھرے قالینوں پر نماز ادا کرنا پسند کریگا۔

111 مطالب اولی النهی 2 / 254.
112 المبسوط از سرخسی 1 / 85 .
113 البحر الرائق 2 / 37.

شیخ البانی نے کہا : میں نے اپنے سلفی بھائیوں کو مشورہ دیا کہ اس مسئلہ یعنی مسجدوںمیں جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں تشدد اور سختی نہ کریں کیونکہ عصر حاضر کی مساجد جن میں اعلی قسم کے قالین بچھے ہوئے ہیں ۔ ان میں، اور زمانہ اول کی مسجد نبوی– صلی اللہ علیہ و سلم – میں فرق ہے ، اور میں نے انکے سامنے اس مسئلہ میں حضور – صلی اللہ علیہ و سلم – کی سنت سے ایک دوسرا قصہ بیان کیا کہ نبی کریم – صلی اللہ علیہ و سلم – نے حالت نماز میں ہر تھوکنے والے یا ناک کی رطوبت صاف کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ اپنی بائیں طرف یا اپنے قدموں کے نیچے تھوکے۔
اور یہ حکم واضح اور زمین کی نوعیت کے عین مطابق ہے ، مسجد کی زمین جہاں وہ مجبورا تھوکے گا ۔ ریت اور پتھروں سے عبارت ہے لیکن آج مساجد میں قالین بچھے ہوئے ہیں تو کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قالین پر تھوکنا جائز ہے، اور یہ بات اسی کی مانند ہے [114]۔

خلاصہ یہ کہ ایک انسان کھلے مقامات یا آلودگی سے پاک جگہ میں جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھ سکتا ہے جہاں تک (ان) مساجد جن میں عام لوگ نماز ادا کرتے ہیں اور انکی صفائی، گندگی سے حفاظت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں کا تعلق ہے ۔ تو جوتوں کے ساتھ نماز ادا کرنے کے جائز ہونے کا فتوی لوگوں کیلئے فتنے کا سبب اور انکے درمیان شر کے دروازوں کو کھولنا ہے۔ اللہ اعلم.

ڈاکٹر احمد عید

كي علامت ہےاور عربون کے یھان یھ قبیلے یا جماعت کے علامت ھوتی تھی اور وہ (جماعت یا

کہا گیا ہے کھ غزوۂ تبوک مین حامل اللوا یعني علم بردار حضرت زید بن حارثھ تھے اور جب

اگر پرچم یا لواء کا احترام صحابھ کرام اور سلف صالح سے منقول ہے تو پرچم کو سلام کرنا

داکٹر یاسر عبد العظیم

114 کتاب فتاوی الاسلام ۔ سوال و جواب ج 1 / 5670 ۔ سوال نمبر 69793 .

55 - نماز تراویح میں کچھ نئ چیزوں کا حکم

سوال: نماز تراویح میں بعض نئ چیزوں جیسے یہ کہنا: صلاہ القیام اثابکم اللہ [نماز تراویح اللہ تعالی آپ کو اجر دے] ذکرو اذکار کے بارے میں کیا حکم ہے ؟

خلاصہ فتوی۔ صلاہ القیام اثابکم اللہ [نماز تراویح اللہ تعالی آپ کو اجر دے] کہنا اور نمازکی رکعتوں کے درمیان تسبیح یا ذکر کرنا بدعت ھے اور اسلام میں کو ئی بدعت حسنہ نہیں ہے ۔
اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 2/352۔353

تبصرہ:

جمہور علماء کے مطابق دین میں نئ چیزوں کی دو قسمیں ھے :

پہلی قسم مذمو م: وہ قسم ھے جو کہ ؛اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ و صلم کے حکم کے خلاف ھو۔

دوسری قسم ممدوح: وہ قسم ہے جو کہ عمومی حکم کے تحت آتی ہے ۔اور اللہ اور اسکے رسول نے اسکی ترغیب دی ہے اور یہ بدعت حسنہ ہے ۔

علمی رد :

امام نووی نے مجموع میں بیان کیا ھے کہ اذان اور اقامت دونوں صحیح نصوص اور اجماع سے پانچوں نمازوں کے لے مشروع ہیں اور ان پانچوں نمازں کے علاوہ اذان اور اقامت متفقہ طور پر ناجائزہیں،لیکن نماز عید ،کسوف اور استسقاء کے لے ۔الصلاہ جامعۃ ([115])کے الفاظ سے ندا دی جا تی ھے ،اس طرح اگر نماز تراویح با جماعت ادا کی جاے تو اس کے لے بھی الصلاۃ جامعۃ الفاظ سے ندا دی جاتی ھے ([116])۔

اس سے اخذ کیا جاتا ہے کہ" الصلاۃ جامعۃ" کہنا اور اسی طرح "صلاۃ القیام اثابکم اللہ" کہنا اور تراویح کی رکعتوں کے درمیان نبی پاک صلی اللہ علیہ و صلم پر درورد و سلام پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

115 بخاری 1051،حضرت عمر سے مروی ھے ،انھون نے فرمایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے مبارک میں سورج گرھن ھوا تو الصلاہ جامعہ الفاظ کی ندا دی گئ۔

116 - المجموع النووی۔3۔83۔

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھین تو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہوتی ہے۔

جمھور علماء کے نزدیک بدعت کی دو قسمیں ھین حسنہ اور سیہء،اور دلیل نبی پاک صلی اللہ علیہ و صلم کا یہ فر مان ھے: [من سن فی ا لاسلام سنہ حسنہ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا (117)۔

جو شخص اسلام میں کسی نیک کام کی بنیاد ڈالے تو اس کے لے اسکے اپنے اعمال اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا بھی ثواب ھے بغیر اسکے کہ انکے ثواب میں کوئی کمی کی جائے ۔اور جس نے اسلام مین کسی بری بات کی ابتدا کی تو اس کے لے اسکے اپنے اعمال اور جو لوگ اس پر عمل کرین گے ان کا بھی گناہ ھے اسکے گناہ مین کوئی کمی کئےبغیر،اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فر مان ھے :[نعمت البدعۃ ھذہ۔ (118)

یہ کتنی اچھی بدعت ہے جبکہ وہ نیک اعمال مین سے ہے اور مدح کے زمرے مین ائی ھے اسے بدعت کا نام دیا اور اسکی تعریف فر مائی کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ کرام کے لے سنت نہیں بنایا بلکہ اسے کبھی ادا کیا پھر ترک فرما دیا اور اسکی پابندی نہیں فرمائی ، اورنہ ہی لوگون کو اسکے لے جمع فرمایا اور نہ ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے مین تھی جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگون کو اسکے لے جمع کیا اور انہیں اسکی ترغیب دی ، اسی لئے اسے بدعت سے موسوم کیا درحقیقیت یہ سنت ہی ہے۔

چنانچہ بدعت کی دو قسمین ہیں ،بدعت ھدایت و بدعت ضلالت ، سو جو بات اللہ اوراسکے رسول کے حکم کے خلاف ہو وہ منکر و مذموم ہے اور جو بات اللہ تعالی کی عمومی دعوت کے تحت آتی ہے اور اللہ تعالی ,یا رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے اسکی ترغیب دی ہو تو وہ ممدوح ہے ،اور یہی رائے جمھو ر اہل علم کی ہے اور اکثر اہل علم کی رائے بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

ڈاکٹر احمد عید

117 صحیح مسلم2398۔حدیث جریرمین سے۔

118 موطا امام مالک249۔

باب ہفتم جنائز

56- تارک نماز اور اولیا ء کرام کے لے ذبیحہ کرنے والوں کا حکم

سوال: تارک نماز اور اولیا ء کرام کے لے ذبیحہ کرنے والوں اور ان سے توسل کرنے والوں کی نماز جنازہ کا کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: انکی نماز جنازہ جائز نہیں کیونکہ وہ اسلام سے خارج اور کفار ہین ۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 410-8

تبصرہ:

مسلمانون کی اکثریت کے نزدیک سستی سے نماز ترک کرنے وا لا کافرنہیں ہے۔

عام مسلمانون کو انہیں کافر قرار دینے مین جلدی نہیں کرنی چاہئے جن کے صحیح ہو نے کے احتمال سے ممکن ہےوہ کافر نہ ہوں اور مسلمانون کے عمل کو ایک حد تک صحیح قرار دینا واجب ہے۔

علمی رد:

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ھے کہ نماز ترک کرنے وا لا اگر اسکی فرضیت کا منکر ھے توعام مسلمانون کے نزدیک متفقہ طور پر کافر ہے اور اگر نماز کی فرضیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس سے سستی کی وجہ سے نماز ترک ہوئی جیسا کہ اکثر الوگون کا حال ہے تو وہ چارون ائمہ کرام اور پہلے و بعد کے علماء کے نزدیک کافر نہیں ہوتا ہے۔

اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ عام لوگ اولیاء کرام کے لے جو جانور ذبح کرتے ہین اگر اس سے انکا مقصد ان اولیاء کرام کو ثواب پہچانا ،ذبیحۃ کا گوشت فقراء مین تقسیم کرنا تو یہ صحیح ہے اگر اس کا مقصد ولی کی ذات سے قرب ہے تو صحیح نہیں ہے ۔چنانچہ عام مسلمانون کو ان اعمال کی وجہ سے کافر قرار دینے مین جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے جنکے صحیح ھونے کے احتمال سے ممکن ہے وہ کافر نہ ہوں اور مسلمانون کے اعمال کو ممکنہ حد تک صحیح قراردینا واجب ہے ۔ اور لا علمی ان موانع میں سے ہے جو کسی شخص کو کافر قرار دینے میں مانع ہوتےہیں ۔

کتاب فتاوی صغری مین ہے کہ کفر بہت بڑی چیز ہے تو جب تک کسی کے کفر نہ کرنے کی روایت موجود ہے تومیں مومن کو کافر نہیں قرار دیتاہون۔

خلاصہ وغیرہ میں ہے کہ اگر کسی مسئلہ مین اکثر وجوہ کفر ثابت کر رہی ہوں اور ایک وجہ کفر سے منع کر رہی ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ وہ مسلمان سے حسن ظن کی وجہ سے تکفیر سے منع کرنے والے سبب کی طرف مائل ہو اور جو شخص مسلمان پر کفر کا فتوی نہ لگانے کا عزم کرے تو یہ اس کی نیک نیتی شمار کی جائیگی یا اس کے کفر میں خواہ کمزور روایت ہی سے اختلاف ہو تو اس پر کفر کا فتوی نہیں لگایا جا سکتا اسی بنیاد پر تکفیر کے اکثر مذکورہ الفاظ سے مراد کفر کا حکم لگانا نہیں اور میں نے اس امر کو اپنے اوپر لازم کیا کہ ان چیزوں مین کسی کے بارے مین فتوی نہیں دونگا(1)حاشية ابن عابدين 224/4۔

ڈاکٹر علی منصور

57- قرآن کریم کی تلاوت سے میت کو فائدہ (نفع) پہچانے کا حکم
سوال: قرآن کریم کی تلاوت سے میت کو فائدہ پہچنے کے بارے میں دریافت کیاگیا؟

خلاصہ فتوی: میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے قرآن کریم کی تلاوت کرنا اسکے وارد نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔
اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 9/47-49

تبصرہ:

جمہور علماء کے نزدیک قرآن کریم کی تلاوت کا ثّواب میت کو پہنچتا ہے اور ہر زمانے اور علاقے میں بغیر انکار کے مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ جمع ہوتے اور قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اپنے فوت شدگان(اعزہ واقارب) کو ایصال ثواب کرتے ہیں۔

علمی رد:
اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ صدقہ اور دعا کا نفع میت کو پہنچتا ہے اور انکے علاوہ دوسرے نفلی اعمال صالحہ جیسے اسکی طرف سے روزہ رکھنا ،قرآن کریم کی تلاوت کرنا ،ایسے اعمال میں انکا اختلاف ہے۔چنانچہ جمہور علماء کی رائے میں میت کو ان اعمال کا ثواب پہنچتا ہے۔ جبکہ بعض علماء نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کی رو سے منع کیا ہے جس میں آپ نے فرمایا: "إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ"، ترجمہ: جب ابن آدم کا انتقال ہوجاتا ہے تو اسکے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین چیزوں کے, صدقہ جاریہ ,یا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جائے , یا نیک اولاد جو اسکے لئے دعا کرتی ہے۔
نبی کریم - صلی اللہ علیہ وسلم - نے فرمایا تین چیزوں کے علاوہ اسکے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے،اور آ پ صلی اللہ علیہ وسلم نےیہ نہیں فرمایا کہ اسے دوسروں کے عمل سے فائدہ نہیں پہنچتا ،تو جب کوئی اور شخص اسکے لئےدعا کرتا ہے تو یہ اس آدمی کے عمل میں سے

نہیں لیکن اسے فائدہ پہنچتا ہے اور اس طرح اگر اسکے لئے قرآن کریم پڑھاجائے تو بھی اسے فائدہ پہنچتا ہے۔

اور جنگی رائے میں تلاوت کا ثواب فوت ہو نیوالوں کو نہیں پہنچتا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ اگر کسی نے تلاوت کی اور اسکے بعد کہا کہ اے اللہ اس تلاوت کا ثواب فلاں شخص کو پہنچا دے تو یہ صحیح ہے ۔اور اسکو انہوں نے دعا قرار دیا ہے. اور احادیث مبارکہ اسپر دلالت کرتی ہیں کہ میت کے پاس اگر قرآن کی تلاوت کي جائےخواہ اسکا ایصال ثواب اسے کیا جائے یا نہیں ،اسکو فائدہ پہنچاتی ہے کیونکہ جب بھی قرآن کی تلاوت کیجائے بطور خاص جماعت کی صورت میں تو تلاوت کرنے والوں کو فرشتے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور رحمت الہی بھی انکو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔اور ان پر طمانینت اور راحت نازل ہوتی ہے بلکہ فرشتوں کے نزول کے لئے جماعت کی صورت میں تلاوت یا ذکر کرنا شرط نہیں کیونکہ یہ (سعادت)اکیلے شخص کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

امام بخاری اور مسلم نے اسید بن حضیر کی حدیث روایت کی ہے جوکہ اصطبل میں اپنے بیٹے اور گھوڑے کے پاس تلاوت کرتے تھے اس حدیث میں آیا ہے (تلاوت کرتے ہوئے)اچانک میں اپنے سر کے اوپر سائے کی مانند کوئی چیز دیکھتا کہ اس میں چراغوں کی طرح (کوئی چیز ہے) وہ آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ میری نظر وں سے اوجھل ہوجاتی تو رسول- صلی اللہ علیہ وسلم- نے آپ سے فرمایا: "تلك الملائكة تستمع لك، ولو قرأت لأصبحت يراها الناس ما تستتر منهم".

کہ یہ فرشتے ہیں جو آپکی تلاوت سنتے ہیں اور اگر تم تلاوت کرتے رہتے تو لوگ پوشیدہ چیزوں کا مشاہدہ کرتے۔

اور یہ کہ میت کے پاس سورۃ یسن پڑھنے کے بارے میں نص ہے امام احمد امام ابوداؤد امام نسائی ،(اسی کے الفاظ ہیں) بان ماجہ،ابن حبان،حاکم سے مروی ہے جسے ابن حبان کو حاکم نے صحیح کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قلب القرآن يس، لا يقرؤها رجل يريد الله والدار الآخرة إلا غفر الله له، اقرؤوها على موتاكم"([119])۔

قرآن کریم کا دل سورۃ یسن ہے اور جو شخص بھی رضائے الہی اور دار آخرت کے لئے اس کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ اسکے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور تم اپنے مردوں پر اسکی تلاوت کیا کرو([120])۔

اور قبر کے پاس تلاوت کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ،امام احمد بن حنبل رحمۃاللہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے کہا جب تم قبرستان میں داخل ہو تو آیت الکرسی اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھو پھر یہ کہو (اللهم إن فضله لأهل المقابر)

اے اللہ اسکا ثواب اہل قبر کے لئے ہو ۔

اور بغیر انکار کے ہر زمانے اور علاقے میں مسلمانوں کا اس پر اتفاق رہاہے کہ وہ جمع ہوتے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے اوراپنے فوت شدگان (اعز اقارب) کو ایصال ثواب کرتے ہیں۔

---

[119] ابن قطان اور دارالقطنی نے اس حدیث کو ضعیف کے قریب بتایا ہے اور ابن حاکم اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا اور میت کی موت کے وقت تلاوت کرنا مراد لیا ہے.اور صحیح بتانے والوں نےمسند فردوس کی حدیث کی بنا پر حالت نزع کے وقت قرن کریم کی تلاوت کو جائز قرار دیا ہے. حدیث کا مفہوم یہ ہےکہ جب مرنے والے کے سامنے سورۃ یس کی تلاوت کی جاتی ہے تو اللہ تعالی اس پر آسانی فرماتا ہے. لیکن بعض علماء کا کہنا ہے کہیہاں لفظ میت عام ہے اور حالت نزع کیلئے مخصوص نہیں ہےچنانچہ اسکے پاس تلاوت کرنے سے اسے فائدہ پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں جب اسکی زندگی ختم ہو گئی خواہ اسے دفن کیا گیا ہو یا دفن نہ کیا گیا ہو.

[120] المغنی از ابن قدامة 225/2۔

کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح حدیث مبارکہ ہے (إن المیت یعذب ببکاء أھله علیه)، بے شک میت کو اسکے اہل وعیال کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔
اور اللہ تعالی اسکے گناہوں کی سزا دینے سے زیادہ کریم ہے کہ وہ اسے (نیک اعمال) کے ثواب سے محروم نہ کرے۔
علاوہ ازیں الأبی نے کہا: اگر چہ میت کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں اختلاف ہے پھر بھی اس سے غفلت نہیں کرنی چاہئے غالبا صحیح ثواب کا پہنچنا ہے لیکن یہ امور ہم سے پوشیدہ ہیں اس وجہ سے اور یہ کسی حکم شرعی میں اختلاف نہیں بلکہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا ایسا واقعی ہوتاہے یاکہ نہیں یہی بات بہتر ہے کیونکہ میت کیلئے کی گئ تلاوت قرآن کریم اگر میت کو فائدہ نہیں پہنچاتی توبھی پڑھنے وا لا ضرور اس سے استفادہ کرتاہے, اور اللہ تعالی کی رحمت اور فضل سے غالبا امید یہ رکھی جائے کہ میت کو اس سے فائدہ ہوتا ہے جیسے شفاعت اور دعا میت کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور دوسری چیزوں سے بھی فائدہ حاصل کرتی ہے۔
ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کے زیر نگرانی فتوی مرکزکے فتوی میں ہے:
شیخ ابن عثمین کی رائے ہے کہ تلاوت قرآن کا ثواب ھدیہ (ایصال وثواب) کرنا جائز ہے اور یہ کہ یہ اسے پہنچتا اور انشاء اللہ اس سے اسے فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔
جبکہ قبروں کے پاس اجتماع اور ان پر پڑھنے کو انہوں نے ناجائز قرار دیا ہے، جمہور علماء اہل علم اور محققین کا مذہب بھی یہی ہے جو شیخ نے کہا ہے۔([121])، دیکھئے مجموع فتاوی العقیدہ الشیخ بن ابن عثمین -ج 2ص305۔

ڈاکٹر علی منصور

58 - مزارات پر گنبد تعمیر کرنے کا حکم

سوال:۔ مزارات پر گنبد تعمیر کرنے کا کیا حکم ہے؟

خلاصہ فتوی: مزارات پر گنبد تعمیر کرناحرام اور شرک کے ذرائع میں سے ہے۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 83۔82/9

تبصرہ:

قبورپر کچھ تعمیر کرنا اور اسے ا س طرح بلند کر نا کہ وہ نمایا ں ہوں مکروہ ہے اور اگر یہ گزرگاہ یا دفن کے لے وقف کردہ زمین پر ہو تو حرام ہے ۔

علمی رد :

[121] مرکز الفتوی ۔زیرنگرانی ڈاکٹر عبداللہ فقیہ فتوی نمبر 3406 تاریخ الفتوی 26 ذوالحجہ 1421۔

امام مسلم اور دوسرے ائمہ نے روایت کیا ہے کہ ثمامہ بن شقی نے کہا ہم فضالہ بن عبید کے ساتھ سرزمین روم [روڈس] مین تھے تو ہمارے ا یک ساتھی کا وصال ہو گیا چنانچہ فضالہ بن عبید نے اسے دفن کرنے کے لئے کہا: پس انکی قبر کو ہموار کیا پھر کہا: میں نے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ و سلم- کو حکم دیتے ہوے سنا کہ اس(قبر)کو ہموار کرو۔

ابو الهیاج ا لاسدی سے روایت ہے کہ آپ نے کہا مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہین اسکی ترغیب نہ دون جسکی ترغیب مجھے دی گئ ہے کہ کسی خیمے کو نہ چھوڑو یہانتک کہ اسکا نشان مٹا دو اور کوئی قبر بلند نہ ہو سو اسے ہموار کر دو ۔

امام ترمذی نے کہا ہے کہ بعض اہل علم قبر کے زمین سے بلند ہونے کو ناپسند کرتے ہین سوائے یہ کہ وہ اتنی بلند ہو کہ معلوم ہو کہ یہ قبر ہے تاکہ لوگ اسے پاؤں سے نہ روند ین اور نہ اس پربیٹھیں ۔

مصری وزارت اوقاف کی شائیع کردہ کتاب ، الفقہ علی المذاهب ا لاربعہ ،میں آیا ہے کہ قبر پر گھر یا گنبد یا مدرسہ یا اسکے گرد چاردیواری بنانے کا مقصد زیب وزینت او ر فخر نہ ہو تو مکروہ ہے ورنہ حرام ہے اور اگر زمین گزرگاہ یا دفن کے لے وقف شدہ ہو تو بھی حرام ہے کیونکہ تعمیر لوگوں کے لے تنگی کا باعث بنتی ہے۔

فقھاء شافعیہ نے کہا ہے کہ انبیاء کرام ، شھداء عزام اورصالحین کی قبر پر گنبد تعمیر کرنا جائز ہے خواہ وقف کردہ زمین میں ہو اور یہ انکے ذکرکے احیاء کیلئے ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ قبروں کی تعمیر کرنا اور انہیں اس طرح بلند کرنا کہ وہ نمایاں ہوں مکروہ ہے حرام نہیں ہے سوائے فخر کے لئے یا گزرگاہ یا دفن کیلئے وقف کردہ زمین ھو تو حرام ہے۔

فقھاء شافعیہ نے انبیاء کرام، شھداء عزام اور صالحین کے مزارات کو کراہت اور حرمت سے مستثنی قرار دیا اور انکے(انبیاء) ذکرکے احیاء کیلئے انکی قبروں پر گنبد تعمیر کرنے کی اجازت دی ہے اور جمہور کی رائے زیادہ قوی ہے۔ واللہ اعلم۔

ڈاکٹر علی منصور

59 - قبروں پر پھول چڑھانے کا حکم

سوال: قبروں پر پھول چڑھانے کاکیا حکم ہے ؟

خلاصہ فتوی: قبروں پر پھول چڑھاناشرعا بد عت ہےکیونکہ یے کفا ر سے مشا بہ ہے۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 92.89/9

تبصرہ:

شاخیں جبتک تروتا زہ رہہتی ہیں تسبیح کر تی ہیں تو تسبیح کی برکت سے میت پر عذاب کم ہو تا ہے اس بنیاد پر عام قاعدہ سے اس کا اطلاق درختون اور ان کے علاوہ ہر اس چیز سے ہوتا ہے جس مین نمی یا رتوبت پائی جاتی ہے۔

علمی رد:

امام بخاری نے حضرت ابن عبا س سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " إنهما ليعذبان، وما يعذبان في كبير، أما هذا فكان لا يستنزه من البول، وأما هذا فكان يمشي بين الناس بالنميمة" ان دونوں کو عذاب ہو رہا تھا ااور انکو عذاب کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہین ہو رہا تھا، یہ شخص پیشاب کرتے وقت محتاط نہین رہتا تھا جبکہ یہ لوگوں کی غیبت کیا کرتا تھا ، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک ٹہنی منگو ا کر لمبا ئی مین اسکے دو ٹکڑے کر کے ایک اس قبر پر اور دوسری، دوسر ی قبر پر لگا دی اور فرمایا: **"لعله يخفف عنهما ما لم ييبسا"** جب تک یہ دونوں خشک نہ ہوں ہو سکتا ھے کہ عذاب ان سے کم ہو جائے۔

[العسیب] کھجور رکی ہو شاخ جس پر پتے لگے ہوں ااور اس پر پتے اگے ہوں اس سلسلہ میںایک اور دوسرا قصہ ہے جسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزرے اور کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا: " ایتونی بجریدتین" میرے پاس کھجور کی دو ٹہنیاں لاؤ" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹہنی اس کے سرہانے لگائی اور دوسری اس کے دونوں قدموں کے طرف لگآئی۔

جبتک ٹہنیاں تازہ رہیں اس وقت تک عذاب میں تخفیف کی حکمت کے بارے میں بات کہا گیا ہے :کہ تازہ ٹہنیاں تسبیح کرتی ہیں چنانچہ تسبیح کی برکت سے عذاب میں کمی ہوتی ہے اور اس اصول کا اطلاق درخت اور ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس مین تازگی اور نمی موجود ہو اور اسی بنیاد پر مزاروں پر پودے اور پھول لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس بات پر ایمان ہو کہ نفع و نقصان پہچانے والی ذات صرف اللہ تعالی کی ہے اور دعا و صدقہ کے علاوہ

جو کچہ ہم میث کے لے پیش کرتے یہ بطور اسباب کے ہے جس سے اللہ تعالی کی رحمت برستی ہے -

جہاں تک مشابہت کا تعلق ہے تو جب تک ان سے مشابہت کی نیت نہ ہو تو یہ بھی حرام نہین ہے ،اللہ اعلم -

ڈاکٹر علی منصور

60- میت کو تلقیں کرنیکا حکم

سوال: میت کو تلقیں کرنےکا کیا حکم ہے؟

خلاصہ فتوی: دفن کے بعد میت کو تلقین کرنا بدعت ہے کیونکہ یہ وارد نہیں ہوا ہے-

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء 340/8

تبصرہ:

بڑی عمر کی میت کو دفن کرنے کے بعد تلقین کرنے میں ممانعت نہیں جبکہ بچے کو مکلف نہ ہو نے کی وجہ سے تلقین نہین کی جاتی. شافعی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک میت کو تلقین کرنا مستحب ہے اور امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے-

علمی رد:

امام نووی نے بیان کیا ہے کہ تلقین مستحب ہے اور یہ شوافع ،کی کئی جماعتون سے منقول ہے انہوں نے کہا میت کو تلقین کرنا مستحب ہے. چنانچہ کوئی شخص اسکے سرہانے بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: کہ اے فلاں ابن فلاں اور اے عبداللہ ابن أمة اللہ اس عھد کو یاد کرو جس پر تو اس دنیا سے رخصت ہوا ہے یہ شھادت کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اسکا کوئی شریک نہین ہے اور محمد -صلی اللہ علیہ وسلم- اسکے عبد مقرب اور رسول ہیں ۔اور بیشک جنت برحق ہے دوزخ حق ہے، دوبارہ اٹھایا جانا برحق ھے، قیا مت کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جو قبروں میں ہیں اللہ تعالی انہیں دوبارہ اٹھائے گا.

اور یہ کہ تو راضی ہواکہ اللہ تعالی رب ہے ،اور اسلام دین ہے ، حضرت محمد- صلی اللہ علیہ وسلم - نبی، قران کریم امام ، کعبہ قبلہ اور مو منین آپس مین بھایی بھائی ہیں -

شیخ نصر نے ان کلمات کا اضافہ کیا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اس کے سوا کو ئی معبود نہیں اسی پر میرا بھروسہ ہے اور عر ش عظیم کا رب ہے یہ تلقین انکے نزدیک مستحب ہے ۔

اس بارے میں ابو امامہ کی حدیث ہے جسے اما م طبرانی نے اپنے اپنی معجم مین ضعیف اسناد سے روایت کیا ہے کہ اس کےالفاظ ہیں: سعید ابن عبد اللہ ا لازدی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں ابو امامہ کی وفات کے وقت انکے پاس تھا ۔انہو ن نے کہا اگر میں انتقال کر جا وں تو میرے ساتھ وہی کرنا جو رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے ہمیں حکم دیا ھے. اور آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا ہے تمھاریے بھائوں میں سے جب کو۴ی انتقال کر جاے اور تم اس قبر پرمٹی ہموار کر دو تو تم میں سے کسی ایک کو چاہیےکہ اس کی قبر کے سرھانے کھڑا ہو کر یہ کہے اے فلان ابن فلانة، وہ اسے سنتا ہے مگر جواب نہین دیتا۔

پھر وہ کہے اے فلاں ابن فلاں تو وہ مردہ سیدھا بیٹھ جاتا ہے پھر وہ کہے اے فلاں ابن فلاں تو صاحب قبر کہتا ہےہماری رھنمائی کر اللہ تعالی تم پر رحم فرمائے. لیکن ان زندوں کو شعو ر نہیں ہوتا چنانچہ اسے چاہیے کہ کہ وہ کہے(اس عھد) کو یا د کرو جس پر تو اس دنیا سے رخصت ہوا ہے یہ شھادت کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اسکا کوئی شریک نہین ہے اور محمد - صلی اللہ علیہ وسلم- اسکے عبد مقرب اور رسول ہیں ۔اور بیشک جنت برحق ہے دوزخ حق ہے، دوبارہ اٹھایا جانا برحق ھے، قیا مت کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جو قبروں میں ہیں اللہ تعالی انہیں دوبارہ اٹھائے گا.

اور یہ کہ تو راضی ہواکہ اللہ تعالی رب ہے ،اور اسلام دین ہے ، حضرت محمد - صلی اللہ علیہ وسلم- نبی، قران کریم امام ،اور بیشک منکر و نکیر میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا ھاتھ پکڑتا ہے اور کہتا ہے او ہم چلیںؓ ھم اسکے پاس نہیں بیٹھتے جسے اپنی حجت حاصل کر لی ہو، تو ایک آدمی نے عر ض کیا یا رسول اللہ- صلی اللہ علیہ وسلم- اگر ہم اسکی ماں کو نہ جانتے ہوں تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا اسے اس اکی ماں حواکی طرف منسوب کردو.

اے فلان ابن حوا:

امام نووی نے کہا کہ اگر چہ یہ حدیث ضعیف ہے مگر اس سے تائید لی جاتی ہے اور محدچین اور دیگر علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ترغیب و تر ھیب اور فضائل میں کی جاتی ہے

اور احادیثکے شواھد اسے مزید مضبوط کرتے ہیں ،جیسے حدیث: "واسألوا لہ التثبیت" اور اسکی کیلئے ثابت قدمی کی دعا کرو۔

اور حضرت عمر وبن العاص رضی اللہ عنہ کی وصیت اور یہ دونوں صحیح ہیں جنکا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اہل شام پہلے زمانے سے آج تک اسی پر عمل پیرا ہیں اور یہ تلقین اس میت کو ہو گی جو دنیامیں مکلف تھی جبکہ بچے کو تلقین نہین کی جاتی ۔ واللہ اعلم۔ ([122])

اور ابن تیمیہ نے بھی بیان کیا ہے کہ تلقین صحابہ کرام اور تابعین سے بھی منقول ہے اور اس مین تین اقوال ہین مستحب ،مکروہ ، مباح ([123])۔

عبد اللہ فقییہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز کا فتوی:

دفن کرنے کے بعد میت کو تلقین کرنا واجب نہین ہے اور یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عھد اور آپ کے خلفاء راشدین کے زمانے میں مشہور مسلمانوں کا عمل نہیں تھا لیکن یہ کئ صحابہ کرام سے منقول ہے جیسے امامہ اور واثلہ بن ا لاسقع . اور ائمہ کرام میں سے امام احمد بن حنبل نے اجازت دی اور آپ کے اور امام شافعی کے ساتھیوں نے مستحب قرار دیا اور کچھ علماء نے بدعت کے اعتقاد کی وجہ سے مکروہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ اس مین تین آراءہیں مستحب ،مکروہ ،مباح اور یہ سب سے صحیح قول ہے۔([124]) واللہ اعلم۔

ڈاکٹر علی منصور

باب ہشتم روزہ

61 – بے نماز روزے دار کا حکم

سوال: وہ (شخص) جو روزہ رکھتا ہے مگر نماز نہیں ادا کرتا اسکے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: نماز کے بغیر روز ہ رکھنا جائز نہیں کیونکہ تارک نماز کافر ہے چنانچہ اسکا روزہ صحیح نہیں ہے

الشیخ ابن عثیمین فتاوی الصیام ص34

تبصرہ :

122 مجموع نووی247/5۔

123 الفتاوی الکبری ابن تیمیہ25/3۔

124 مرکز فتوی ،فتوی نمبر1907 تاریخ 12ربیع ا لاول1422۔

جس نے نیت ،طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے ،پینے اور عمل زوجیت سے اجتناب کی جیسے روزے کے ا رکان پورے کئے تو اس کا روزہ صحیح ہے اور نماز ترک کرنا روزے کے صحیح ہونےپر اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔

علمی رد:

اگر عبادت اسکے ارکان وشرائط پورے کرتے ہوئے ادا کی جائے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور اسے لوٹا نا واجب نہیں اور جو شخص روزہ رکھتا ہے اگر وہ طلوع فجر سے لیکر مغرب تک مفطرات یعنی کھانے پینے اور شھو ت سے رکا رہے تو اسکا روزہ صحیح ہے باطل نہیں،یہاں تک کہ اگر وہ جھوٹ ،ترک نماز جیسے کچھ گناہوں کا بھی مرتکب ہو تو بھی (روزہ) صحیح ہے۔

لیکن کیا یہ روزہ صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ قبول بھی ہوگا اور اسے روزے دار پر اللہ کے جانب سے اجر ملے گا؟

اس روزے دار کی عدم قبولیت پر صحیح احادیث مبارکہ ہیں جیسے حدیث مبارکہ ہے:

"مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ وَالْجَهْلَ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ" امام مسلم کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے، ترجمہ: جو شخص بحالت روزہ جھوٹ بولنا اور اس پر برے عمل کرنا ترک نہ کرے تو اللہ تعالی کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے.

روزے کی عدم مقبولیت سے مراد اس کے اجر ثواب سے محرومی ہے، لیکن اسے لوٹا نے یا اسکی قضاء کرنے کا اس سے مطالبہ نہیں کیا جا تا ،کیونکہ وہ حقیقتا صحیح ہے اگرچہ مقبول نہیں ، جیسے جو روزہ رکھتا ہے اور نماز ادا نہیں کرتا ،اسکا روزہ صحیح ہے اور ترک نمازکی وجہ سے اسکا لوٹانا واجب نہیں جبکہ اسکی عدم قبولیت پر حدیث مبارکہ د لالت کرتی ہے۔

فرض کریں کہ اسکا روزہ مقبول ہے اور اسے ثواب بھی حاصل ہوگیا پھر بھی ترک نماز کا عذاب بہت شدید ہے اور اگر اللہ تعالی کی طرف سے معافی نہ ہوئی تو قیامت کے دن یہ میزان میں ظاہر ہوگا۔

چنانچہ ہمیں چاہئے کہ اللہ کا یہ فرمان اپنے مد نظر رکھیں اور اسے دلوں میں بٹھالیں جس میں اللہ نے فرمایا :﴿ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَه(7)وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزلہ7-8)، ترجمہ: اور جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لےگا او رجس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (فصلت 46)، ترجمہ: جس نےنیک عمل کیا تو اس نے اپنی ہی ذات کے (نفع کے) لئے کیا اور جس نے گناہ کیا سو (اسکا وبال) اسی کی جان پر ہے اور آپکا رب بندوں پر ظلم کرنے وا لا نہیں ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسکے کفر کی وجہ سے اسکا روزہ صحیح نہیں تو یہ پہلے بیان ہو ہو چکا ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک سستی سے ترک کرنے وا لا کافر نہیں ہے۔ اللہ اعلم۔

ڈاکٹر علی منصور

62- رمضان کے روزے کی قضا کا حکم

سوال: اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے کئی سالوں تک رمضان کے روزے نہیں رکھے اسکے بعد اس نے اللہ تعالی سے توبہ کی تو کیا ان سالوں کے ماہ رمضان کے روز ے کی قضاء اس پر واجب ہے؟

خلاصہ فتوی: اس پر قضاء لازم نہیں،لیکن اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالی سے توبہ کرے اور کثرت سے نیک اعمال کرے۔

الشیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی ورسائل (19/ 87)ف(41)

تبصرہ :

یہ فتوی علماء کے اتفاق کے خلاف ہے اور لوگوں میں روزے اور ماہ رمضان کے دنوں کی قضاء سے بے رغبتی پیدا کرتا ہے اور چھوڑے ہوئے روزوں کی قضاء متفقہ طور پر واجب ہے۔

علمی رد:

وہ عبادات جنکے لئے اوقات معین ہیں ، معین وقت پر ادا نہ کی جائیں تو قضاء ہو جاتی ہیں اور جب تک انہیں ادا نہ کیا جائے انکی قضاء واجب ہوتی ہے وقت پر ادا نہ کی گئی عبادت کی قضاء تمام فقہاء کے نزدیک واجب ہے۔

امام سیوطی نے کہا: کہ ہر وہ جس پر کوئی چیز واجب ہو اور ادا نہ کی تو اسکے فوائد کے حصول کے لئےاس کی قضاء لازم ہے۔

اور صاحب تلخیص نے کہا: کہ اگر کسی شخص نے واجب عبا دت ترک کر دی تو اس پر قضاء کا کفارہ لازم ہے۔

فتاوی الہندیہ میں آیا ہے فرض کی قضاء ،فرض، واجب کی قضاء واجب اور سنت کی قضاء سنت ہے([125])۔

عمدا ترک کرنے کی قضاء واجب ہونے کی دلیل ، حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ: "أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر المجامع في نهار رمضان أن يصوم يوما مع الكفارة"، نبی کریم - صلی اللہ علیہ وسلم- نے ماہ رمضان کے دنوں میں ازدواجی تعلقات قائم کرنے والے کو حکم فرمایا کہ وہ کفارہ کے ساتھ ایک دن کا روزہ رکھے یعنی اس دن کا روزہ رکھے جس دن اس نےازدواجی تعلقات سے روزہ توڑا ہے۔

اور کیونکہ جب بھول میں(عبادت) ترک کرنیوالے پر قضاء واجب ہو جاتی ہے تو عمد ا ترک کرنے والے پر بدرجہ اولی واجب ہوتی ہے۔

اور امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ کی روایت کردہ یہ حدیث اسکی دلیل ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ سلم علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی ماں کے بارے میںدریافت کیا کہ وہ فوت ہوگئی ہیں اور ان پر ایک ماہ کے روزے واجب ہیں تو کیا وہ ا نکی طرف سے قضاء کرے تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اس سے فرمایا: "نعم، فَدَيْنُ اللّهِ أَحَقّ أَنْ يُقْضَى"، ترجمہ: ہاں پس اللہ تعالی کا قرض زیادہ حقدار ہے کہ اسکو (پہلے) ادا کیا جائے۔

اور ایک روایت میں کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کیا کہ اسنے حج کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی یہاں تک کہ فوت ہو گئی تو وہ اسکی طرف سے حج کرے تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا:

---

[125] الموسوعۃ الفقیہ 34/ 25۔

تم اسکی طرف سے حج کرو ۔ بھلا بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتیں ؟ پس اللہ کا حق ادا کرو کیونکہ وہ ز یادہ حقدار ہے کہ اسکا قرض ادا کیا جائے۔
چنانچہ یہ حدیث مبارکہ عموما اللہ تعالی کے قرض کی ادائیگی کے واجب ہو نے کی دلیل ہے. بغیرعذر کے جس نےروزہ ترک کیا اسکی قضاء کے واجب ہو نے پر اور بھی د لائل ہیں اللہ تعالی کا ارشاد ہے :﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (سورۃ البقرہ 183)، ترجمہ: تم پر روزے فرض کئے گے ہیں۔
اس میں فرق نہیں کیا کہ (اسکی ادائیگی) اپنے وقت میں یا اسکے بعد ہو، اوریہ روزے کے وقت اور غیر وقت میں وجوب کا تقاضا کرتا ہے، اسکی ادائیگي واجب ہے۔
1. مریض اور مسافر پر قضآ ء کرنا ثابت ہے اور اسکے ساتھـ وہ دونوں گناہگار بھی نہیں چنانچہ عمدا ترک کرنےوالے پر اسکی قضاء پہلے ہوتی ہے۔
2.لوگوں کے قرضے وقت سے مربوط ہیں پھر جب وقت آگیا تو انکے واجب ہونے کے بعد انکی ادائیگی ساقط نہیں اور یہ ان میں سے ہیں جو ادائیگی سےہی ساقط ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اللہ تعالی کے قرضوں میں براءت صحیح نہیں اور افضل یہ ہے کہ اسکے اذن کے بغیر انکی قضاء ساقط نہ ہو ۔اور یہ اذن موجود نہیں ہے۔
3.علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ رمضان میں نہ رکھے گئے روزوں کی قضاء (رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں) میں واجب ہے.
4. ابن قدامہ نے المغنی میںبیان کیا ہے کہ (رمضان میں دن کو) کسی نے روزہ توڑ نے والی چیزوںسے روزہ توڑ لیا تو اس پر قضاء لازم ہے ۔ہم نہیں جانتے کہ اس میں اختلاف ہے کیونکہ روزہ اسکے ذمے واجب ا لادا تھا تو وہ اسکو ادا کئے بغیر اس سے بری نہیں ہو سکتا ،اور اس نے ادا نہیں کیا تو اس پرجو (واجب) تھا وہ باقی رہا ([126]) اللہ اعلم۔

فتاوی اسلام سوال وجواب میں ہے کہ عذر کے بغیر قضاء کی (ادائیگی میں) تاخیر جسے وہ قضاء پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس نے قضاء ادا نہ کی یہا'ں تک کہ اگلا رمضان آگیا تو وہ بغیر کسی عذر کے قضاء کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے گناہگار ہے اور ائمہ کرام اس پر اتفاق ہے کہ اس پر قضاء لازم ہے۔ ([127])
ڈاکٹر علی منصور

63- رمضان میں دن کے وقت انجکشن لگوانے کا حکم
سوال: رمضان المبارک میں دن کے وقت انجکشن (ٹیکہ) لگوانے کے بارے میں دریافت کیا گیا ؟

خلاصہ فتوی : اگر انجکشن غذائی ضرورت کو پورا کرتا ہو تو روزے کو توڑ دیتاہے اور اگر غذائی ضرورت کو پورا نہ کر تا ہو تو نہیں توڑتا۔
الشیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی الصیام 58

[126] المغنی ازابن قدامہ 22/3 ۔

[127] فتاوی ا لاسلام ۔سوال وجواب زیر نگرانی شیخ محمد صالح المنجد ج 1 ص 2893 سوال نمبر 26865۔

تبصرہ :
انجکشن خواہ مغذی ([128]) ہو یا مغذی نہ ہو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ جسم کے عمومی راستو ں میں سے داخل نہیں ہوتا ۔
علمی رد:
عضلات یا رگوں یا جلد کے نیچے انجکشن (لگوانے کے بارے میں) سابق مفتی مصر محمد بخیت المطیعی نے 1919ء میں فتوی دیا تھا کہ اگر روزہ دار یہ انجکشن لگوائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے کیونکہ یہ مواد جسم کے عام راستوں سے پیٹ اور معدے تک پہنچتا اور غیر عمومی راستوں یا مسام کے ذریعے جسم میں پہنچنے (والی چیز) سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے ۔ انہوں نے کہا کہ روزہ توڑنے والی چیز کے لئے شرط ہے کہ وہ پیٹ میں پہنچ کر وہاں رہے اس سے مراد یہ ہیکہ وہ پیٹ میں داخل ہو اور پیٹ کا خارجی کنارہ نہ ہو اور نہ ہی وہ پیٹ سے باہر کسی چیز سے ملی ہوئی ہو ۔ اور یہ کہ وہ عمومی راستوں سے پیٹ میں پہنچے کیونکہ مسام وغیرہ عام طور پر وہ راستے نہیں جن کے ذریعے عموما چیز پیٹ تک پہنچتی ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جلد کے نیچے معروف طریقوں جیسے بازؤں یا دونوں رانوں یا کولہوں کے با لائی حصوں پر یا جسم کی کسی ظاہری جگہ پر انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ،کیونکہ اس طرح کے ٹیکے سے کوئی چیز بنیادی طور پر عمومی راستوں سے پیٹ تک نہیں پہنچتی ہے۔
اور فرض کریں کہ پہنچتی بھی ہے تو وہ فقط مسام کے ذریعے سے پہنچتی ہے اور جہاں تک پہنچتی ہے وہ پیٹ نہیں اور نہ ہی یہ پیٹ کے حکم میں آتا ہے([129])
واللہ اعلم۔

ڈاکٹر علی منصور

[128] وہ چیز جو غذائی ضرورت پوری کرے۔

[129] موضوع (23) مفتی فضیلت شیخ محمد بخیت ،شعبان 1337 ھ مئی1919ء۔
موضوع (759) مفتی فضیلت شیخ حسن مامون 11/ شعبان 1370ھ -8 مارچ 1960ء۔

باب نہم حج

64- محرم کے بغیر عورت کے حج کا حکم
سوال: محرم کے بغیر کسی عورت کے لئے حج اور عمرے کے سفر کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : محرم کی عدم موجودگی میں عورت پر حج فرض نہیں ہے۔
الشیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی ورسائل 590/2

تبصرہ :
اس حکم کا دارو مدار اس پر ہے کہ عورت کو امن وامان اور آرام میسر ہو اگر کسی صورت میں بھی اسے یہ حاصل ہو جائے جیسے محرم یا پرامن ساتھ یا سرکاری ذ مہ دار کی نگرانی یا اسی قسم کا کوئی اور ذریعہ ہو تو اس کے لئے حج اور سفر کر نا جائز ہے۔
علمی رد:
امام بخاری اور مسلم رحمہمااللہ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَصَاعِدًا إِلَّا وَمَعَهَا أَبُوهَا أَوْ أَخُوهَا أَوْ زَوْجُهَا أَوْ ابْنُهَا أَوْ ذُو مَحْرَمٍ مِنْهَا"، ترجمہ: اللہ تعالی اور یوم آخرت پر ایمان رکھنےوالی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے باپ یا اپنے بھائی یا اپنے شوہر یا اپنے بیٹے یا کسی محرم کے بغیر تین دن یا اس سے زیادہ سفر کرے۔
انہوں نے یہ بھی روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ وہ غزوے میں شریک ہے اور اسکی بیوی حج کے لئے چلی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ےفریایا "حج مع امرأتك"، اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔
ان دونوں اور دیگر نصوص کی روشنی میں عورت کے لئے حج فرض ہونے کی محرم کی شرط کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔
احناف کے نز دیک شوہر یا محرم کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔
اور امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا کی شرط نہیں بلکہ اسکی حفاظت شرط ہے ۔اور آپکے ساتھیوں نے کہا کہ شوہر یا محرم یا قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ ہونے سے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے ۔اور بعض کا خیال ہے کہ اگر عورت بھی ساتھ ہو تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے ۔ اور کبھی اتنا امن اور حفاظت ہوتی ہے کہ کسی کی ضرورت نہیں ہو تی بلکہ وہ خود قافلے کے ساتھ اکیلی ہی محفوظ ہو تی ہے۔
اور مالکیوں کے نزدیک اگر امن یقینی ہو تو عموما سفر کے لئے محرم کی شرط نہیں، او رامام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کے نز دیک عورت پر حج فرض ہو نے کے لئے شوہر اور محرم کا ہونا شرط ہے۔
اورانہی سے ایک روایت میں ہے کہ فریضئہ حج کے لئے یہ شرط نہیں۔
ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی میں اسکو ترجیح دی کہ سفر حج میں شوہر اور محرم کی موجودگی واجب نہیں ہے۔اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اسے نہ ملے تو وہ حج کرلے اس پر کو ئی گناہ نہیں ۔
اور جنہوں نے شوہر اور محرم کی موجودگی کی شرط رکھی وہ صرف عورت کو انکے بغیر سفر کرنے کی وجہ سے گناہ اور حرج کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ لیکن اگر وہ انکے بغیر حج کے لئے گئی تو اگر(حج)کے ارکان اور شروط پوری ہوں تو اسکل حج صحیح ہے اور اس سے فرض

ساقط ہو جاتا ہے اور محرم کے ساتھ اسے لوٹا نا ضروری نہیں ہے اگر چہ شرط لگانے والوں کے نز دیک وہ شوہر یا محرم یا ان دونوں کے قائم مقام کے بغیر نکلنےکی وجہ سے گناہگار ہے۔
سفر میں عورت کیلئے شوہر یا محرم کی موجودگی کی شرط میں حکمت یہ ہے کہ اسے دوران سفر تحفظ فراہم ہو ۔ اور ان امور کے پورا کرنے میں اسے مدد حاصل ہو جن میں اختلاط یا تھکن کی وجہ سے اسے ضرورت ہوتی ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اب وسائل سفر میں ترقی، وطن سے دوری کی مدت میں کمی ،آرام آشائش کی فراہمی اور امن امان قائم ہو نے کی وجہ سے اس زمانے میں ماضی کے مقابلے میں شعائر حج آسانی س ےادا کئے جاتے ہیں. اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے اکیلے سفرسے متعلق ،خاص حدیث مبارکہ سمجھنے میں ان تمام چیزوں کا اثر ہونا چاہئے۔
صحیح بخاری میں عدی بن حاتم کی صحیح حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرما یا: "يستتب ا لأمن حتى ترتحل الظعينة من الحيرة وتطوف بالكعبة لا تخاف إلا الله "۔
" کہ اس طرح امن قائم کرے یہاں تک کہ عورت پالکی میں سفر کرے ،وہ خانہ کعبہ کا طواف کرے ۔اور اللہ تعالی کے سوا کسی سے نہ ڈرے"۔
پس ظاہر ہے کہ اس حکم کا دارو مدار اس پر ہے کہ عورت کو امن وامان اور آرام میسر ہو اگر کسی صورت میں بھی اسے یہ حاصل ہو جائے جیسے محرم یا پرامن ساتھ یا سرکاری ذ مہ دار کی نگرانی یا اسی قسم کا کوئی اور ذریعہ ہو تو اس پر حج فرض ہے۔
از واج رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت کے بعد حج کیا اور انکے ساتھ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور انکا یہ حج سنت تھا کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کیا تھا ([130])۔

ڈ اکٹر محمود عبدالجواد

65- تارک صلاۃ کے حج کا حکم

سوال: تارک صلاۃ کے حج کے حکم کے بارے میں دریافت کیاگیا؟

خلاصہ فتوی : تارک صلاۃ خواہ اسکی فرضیت کا اقرار یا انکار کرنیوا لا ہو وہ کفر کرنے وا لا بڑا کافر ہے اور اسکے کفر کی وجہ سے اسکا حج صحیح نہیں ہے۔
الشیخ ابن باز فتاوی اسلامیہ 185/2

تبصرہ:
جس نےحج کے ارکان پورے کئے اسکا حج صحیح ہے اسکے صحیح ہونے میں نماز ترک کرنے کا اس پرکو ئی اثر نہیں ہوتا ۔

علمی رد:
عبادت اگر اسکے ارکان و شرائط پورا کرتے ہوئے ادا کی جائے تو وہ صحیح ہو تی ہے اسے لوٹانا واجب نہیں جو شخص حج کے ارکان جیسے احرام باندھنا ،طواف کرنا ،سعی کرنا ،میدان عرفات میں ٹھہرنا او ر سر منڈ انا وغیرہ پور ے کرتا ہے تو اسکا حج صحیح ہے فاسد نہیں ،یہاں تک

[130] فتاوی دارا لافتاء المصریہ اہموضع 9 مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997 فضیلت شیخ عبدالحسن العبیکان نے یہ فتوی ۔ MBC سے گفتگو میں دیا ہے۔

کہ وہ اگر کچھ گناہوں جیسے جھوٹ بولنا، ترک نماز وغیرہ کا بھی مرتکب ہو ۔لیکن کیا یہ حج صحیح ہونے کے ساتھ مقبول بھی ہوگا اور اسے اس پر اللہ تعا لی سے اجر ملےگا ؟ ،،مقبول ہوگا یا کہ نہیں ، اسکے حج کی عدم قبولیت یعنی اجر وثواب سے محرومی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سے ظاہر ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا: "مَنْ حَجّ الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ أُمُّهُ"، ترجمہ: جس ن ےحج کیا پس وہ نہ تو عورت کے قریب گیا اور نہ ہی کوئی گناہ کیا تو(تمام گاہوں سے پاک ہوکر) اس طرح لو ٹا جیسے اس کی ماں نے اسےجنم دیا تھا۔

لیکن اسکو لو ٹانے یا اسکی قضاء کرنے کا اس سے مطالبہ نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ حقیقتا صحیح ہے اگر چہ وہ مقبول نہیں۔

فرض کریں کہ اسکا حج مقبول ہے او راس ےاسکا ثواب بھی ملا پھر بھی ترک نماز کا عذاب شدید ہوگا اور اللہ کی طرف سے معافی نہ ہوئی تو قیامت کے دن میزان میں یہ ظاہر ہوگا۔

چنانچہ ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ تعالی کا وہ ارشاد اپنے مد نظر رکھیں او راسے دلوں میں بٹھائیں جس میں اس نے فرمایا: ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَه(7) وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزلہ7-8)، ترجمہ: اور جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لےگا او رجس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔

اور جہاں تک اسکے کفر کی وجہ سے حج کے صحیح نہ ہونے کی تعلق ہے تو یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نز دیک سستی سے نما ز ترک کرنے وا لا کافر نہیں ۔ اللہ اعلم۔

ڈاکٹر محمود عبدالجواد

66- قربانی کا ارادہ کرنے والے کے لیئے ذوالحجہ کے شروع میں بال اور ناخن کاٹنے کا حکم

سوال: قربانی کی نیت رکھنے والسے شخص کے لئ ماہ ذوالحجہ کے اوئل میں بال اور ناخن کٹوانے کے حکم کے بارے میں دریا فت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : جس نے قربانی کا ارادہ کیا اس کے لئے ذوالحجہ کے شروع میں بال یا ناخن کٹوانا حرام ہے۔

الشيخ ابن جبرين فتوى بتاريخ 1421/12/8 ھ

تبصرہ:

جمہور فقہاء کے نز دیک قربانی کا ارادہ رکھنے والے شخص کے لئے بال اور ناخن کٹوانا حرام نہیں ہے بلکہ ان کے نز دیک یا تو جائز یا تو مکروہ ہے۔

علمی رد:

امام بخاری کے علاوہ دیگر ائمہ کی ایک جماعت نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ" وفى رواية لمسلم "فلا يأخذن من شعره وأظفاره حتى يضحى"، ترجمہ: جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ رکھتا ہوتو اسے چاہئے کہ اپنے بال اور ناخنوں کو کٹوانے سے پرہیز کرے اور امام مسلم کی روایت میں ہے" فلا يأخذن من شعره وأظفاره حتى يضحي"، ترجمہ: "وہ قربانی کرنے تک ہر گز اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے"۔

قربانی کا ارادہ کرنے والے شخص کے بال اور ناخن کاٹنے کے بارے میں علماء کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے۔

1. امام شافعی رحمہ االلہ نے فرمایا کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے یعنی اس میں گناہ نہیں ہے اس کی دلیل مذکورہ حدیث شریف ہے انہوں نے اس میں نہیں سے مراد کراہت لی ہے حرمت نہیں اسکی تائید صحیح بخاری کی یہ حدیث مبارکہ کرتی ہے ۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اہل مدینہ کی جانب سے قربانی فرماتے تھے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی (کے جانوروں) کے لئے گلے کے پٹے تیار کرتی اور جن چیزوں سے محرم(احرام باندھنے والا) اجتناب کرتاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان چیز و ں میں سے کسی سے بھی اجتناب نہیں فرماتے تھے۔
2. امام احمد ابن حنبل اور بعض فقہاء شافعیہ کے نز دیک یہ حرام ہے انہوں نے حدیث میں نہی سے حرام مراد لیا ہے۔
3. اور امام ابو حنیفہ رحمہم االلہ کے نز دیک حلق (سر منڈوانا) التقصیر(یا چھوٹے کرانا مکروہ نہیں ہے۔
4. امام مالک- رحمہ اللہ - سے ایک قول امام ابو حنیفہ کی طرح عدم کراہت کا مروی ہے جبکہ ان کا ایک قول ہے کہ واجب تو نہیں البتہ غیر واجب ممانعت ہے۔

ان تمام اقوال سے اخذ ہوتا ہے کہ قربانی کا ارادہ کرنے والے کے لئے بال اور ناخن کٹوانا جمہور فقہاء کے نزدیک حرام نہیں ہے بلکہ انکے نزدیک یا تو جائز یا تو مکروہ ہے۔ اورفقہی رائے کے لئے تعصب نہیں ہونا چاہئے بطور خاص جب کہ جمہور کی رائے یہ نہ ہو ([131])۔

ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز کا فتوی ہے:
قربانی کا ارادہ رکھنے والے شخص کو چاہئے کی وہ ماہ ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں اپنے بال اور ناخن کٹوانے سے اجتناب کرے ان میں سے معمولی کٹوانا بھی ممنوع ہے اور مکروہ بھی بتایا گیا ہے ،اور اکثر اہل علم کی رائے جیسا کہ امام مسلم نے حضرت ام سلمہ رضی للہ عنہ سے روایت کی ہے: "إذا دخل العشر وأراد أحدكم أن يضحي، فلا يأخذ من شعره ولا من أظفاره شيئاً حتى يضحي" کہ جب ماہ ذوالحجہ کا پہلا عشرہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے بال اور اپنےناخن قربانی کرنے تک نہ کاٹے اور ایک روایت میں ہے کہ اپنےچہرے سے بھی۔
اور اگر اس نے اپنے بال اور ناخن کاٹ لئے تو وہ اللہ تعا لی سے استغفار کرے اور اس پر کوئی فدیہ نہیں ہے۔([132]) اللہ اعلم۔

ڈاکٹر محمود عبدالجواد

[131] فتاوی ارا لافتاء المصریہ موضوع 60/ مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997۔

[132] فتوی مرکز زیر نگرانی ڈاکٹر عبداللہ فقیہ فتوی نمبر 7510 تاریخ فتوی 3 ذوالحجہ 1424 ھ۔

باب دہم خرید وفروخت اورمعاملات

67- تجارتی دکانون کے انعامات کا حکم

سوال: سامان کو رواج دینے کے لے تجارتی دکانون کی جانب سے پیش کے جانے والے انعامات کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جائز نہیں کیونکہ شرعی طور پر ممنوع ہے۔

الشیخ ابن باز مجموعہ فتاوے اور مقا لات398/19

تبصرہ:

وہ انعامات جو سامان خریدنے والے کو دئے جاتے ہیں یہ بیچنے والے کے طرف سے خریدنے والے کے لے ھبہ ہے اور شرعی ممانعت نہ ہو نے کی وجہ سے اصل میں حلال ہے اورت یہ ایسے ہی ہے جیسے قیمت مین کمی اور رعایت ہے۔

علمی رد:

تجارتی دکانون کے انعامات جو کہ خریدنے والے کو مختلف سامان خریدنے پر دئیے جاتے ہین، کبھی یہ سامان کے ساتھ مربوط یا ڈبوں کے اندر بند یا فروخت شدہ اشیاء کی مقدار مین اضافہ ہوتا ہے. ان انعامات مین کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ فروخت کرنے والون کے طرف سے عطیہ ہوتا ہے اور انعامات کے وعدہ کے زمرے مین آتے ہیں، جسے فقہاء نے جائز قرار دیا اور شرعی ممانعت نہ ہو نے کی وجہ سے اصل مین حلال ہے اور یہ قیمت مین رعایت یا کمی کی طرح ہے،اور اس تحفہ مین کسی قسم کا دھوکا نہیں ہے۔
وہ کمپنیان جو اپنی مصنوعات کی مشہوری انہیں رواج دینے کے لئے اس طریقے پر عمل کرتی ہین یہ جوا نہیں اور نہ اس میں جوے کا مفہوم ہے بلکہ انکی مصنوعات خریدنے والون کے لے عین چیز یا نقد مال کے تحفون کی مختلف انواع ہین اور انہیں انکی مصنوعات خریدنے پر آمادہ کرنے کے مختلف اسلوب اور طریقے ہیں اور اسطرح بڑے پیمانے پر ان اشیاء کی مقبولیت اور دائرہ وسیع ہونے سے منافع زیادہ ہوتا ہے۔
یہ ممنوعہ لاٹری سے مختلف ہے جس میں بعض ادارے یا سوسائٹیاں مخصوص نمبروں والے (اوراق) پرائز بانڈ چھاپ کر عام لوگوں کو معین قیمت پرفروخت کرتی ہیں اور معین اوراق کیلئے رقم مختص کرتی ہیںتو یہ لاٹری حرام اور شرعا ناجائز ہے کیونکہ یہ جوا ہے اور اسطرح یہ بغیر عوض اور ناجائز ذریعے سےدوسروں کا مال حاصل کرنا ہے. جہاں تک اشیاء خریدنے کے انعامات کا تعلق ہے تووہ تحفے ہیں خریدار انکی کوئی قیمت ادا نہیں کرتا بلکہ وہ صرف اس سامان کی قیمت ادا کرتا ہے جو وہ خریدتا ہے ،اور اگر اسے تحفہ ملے تو وہ اسے کمپنی کی مصنوعات خریدنے پر حوصلہ افزائی کے طور پر بغیر عوض کے حاصل کرتا ہے ۔([133]) اللہ اعلم۔

---

[133] فتاوی دارا لافتاء المصریہ موضوع (10 68) مفتی فضیلت شیخ احمد ھریدی 11 نومبر 1968۔

اور شیخ ابن عثمین رحمہ اللہ نے کہا آجکل کمپنیاں خریداروں کے لئے انعامات مقرر کرتی ہیں ان میں کوئی حرج تو نہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ دو شر طوں کا ہونا ضروری ہے۔
پہلی شرط: یہ کہ سامان کی قیمت حقیقی ہو یعنی (کمپنی) انعام کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کرے کیونکہ انعام کی وجہ سے قیمت میں ا"ضافہ کرنا جوا ہے اور وہ جائز نہیں۔
دوسری شرط: یہ کہ انسان انعام کے حصول کے لئے سامان نہ خریدے اگر اس نے انعام کی غرض سے بغیر ضرورت سامان خریدا تو یہ مال کا ضیاع ہوگا۔([134])
ہم نے سنا ہے کہ بعض لوگ بغیر ضرورت کے دودھ یا دھی کا ڈبہ بغیر ضرورت خریدتے ہیں کہ شاید اس سے انعام مل جائے تو آپ اسے دیکھتے ہیں کہ وہ اسے خریدتا ہے اور اسے بازار یا گھر کے کسی کونے میں بہا دیتا ہے ۔ اور یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مال کا ضیاع ہے اور مال ضائع کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔([135]) اللہ اعلم۔

ڈاکٹر أنس أبو شادی

68- قسطوں پر خرید وفروخت کا حکم
سوال: اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر انہیں قسطوں پر خرید وفروخت کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی:جواب دیا گیا کہ یہ حرام سود کھانے کے لئے اللہ کے نزدیک حیلہ بازی ہے۔
الشیخ ابن عثیمین فتاوی معاصرہ 47 -52

تبصرہ:
قسطوں کے عوض میں قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے جبکہ سودی فائدے کے بارے میں نص نہ ہو۔
علمی رد:
ادائیگی میں سہولت کے عوض قیمت میں اضافہ شرعا جائزہے۔ یہی ائمہ اربعہ کی رائے ہے بشرطیکہ یہ معاملہ شرعی ممنوعات سے پاک ہو۔
اس بیع کے جائز ہونے کی اہم شرو ط میں سے یہ ہے کہ فریقین عقد کے وقت (ادائیگی) مؤخر کرنے کی مقررہ مدت کی کیفیت اور مجموعی قیمت پر متفق ہوں۔
قسطو ں پر خرید وفروخت کے جائز ہونے کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأَحَلَّ اللّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (البقرہ 275)، ترجمہ: اور اللہ نے تجارت (سود اگری) کو حلال فرمایا اور سودکو حرام کیا ہے۔
اس میں لفظ بیع عام ہے اس میں حال (نقد) اور مؤجل و مؤخر دونو ں کو شامل کیا ہے اسی طرح اللہ کا فرمان ہے: ﴿أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ﴾ (النساء 29)، ترجمہ: سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو۔ اس میں لفظ تجارت بھی عام ہے۔

134 صحیح بخاری میں (1477) میں مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایہ اللہ تعا لی نے تمہارے لئے تین چیز وں کو ناپسند فرمایا ہے فضول گوئی ،مال کا ضائع کرنا او رکثرت سوال۔

135 اسلامی فتاوی ،سوال جواب ۔زیر نگرانی شیخ محمد صالح النحد حرا/ 166 ۔سوال 12583۔ مسئلہ باب 1 فتوی (162)۔

قسطو ں پر خرید و فروخت کے جائز ہونے پر اللہ تعا لی کا یہ ارشاد بھی د لالت کرتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ (البقرہ 282)، ترجمہ: اے ایمان والو ںجب تم کسی مقررہ مدت کی لئے آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارکہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں لشکر کو تیار کرنے کا حکم فرمایا: چنانچہ اونٹ ختم ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم فرمایا: کہ وہ صدقے کے اونٹ لےلے تو وہ دو اونٹو ں کے بدلے صدقے کا ایک اونٹ لیتےتھے ، یہ حدیث مبارکہ واضح دلیل ہے کہ تاخیر کے عوض قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے۔
اور بعض لوگو ں کے نز دیک تاخیر کے عوض قیمت میں اضافہ ناجائز ہے اور اضافہ حرام سود کے باب میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ابوبکر جصاص حنفی اور بعض اسلاف کا قول ہے ۔اور بہتر رائے جمہور علماء کی ہے۔([136]) اللہ اعلم۔

نقد کے بجائے مؤخر قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے ۔ جیسے سامان کی نقد قیمت اور معلو م مدت میں اقساط کی صورت میںقیمت کا بیان جائز ہوتا ہے اور جبتک فریقین یہ قطعی فیصلہ نہ کر لیں کہ قیمت کی ادائیگی فوری ہوگی یا تاخیر سے تب تک یہ بیع صحیح نہیں ہو تی ہے ۔
اور اگر قیمت کی فوری یا مؤخر ادائیگی میں تردد کے ساتھ یعنی ایک قیمت پر قطعی اتفاق کے بغیر یہ خرید وفروخت ہو گئی تو شرعا نا جائز ہے([137]) اللہ اعلم۔
ڈاکٹر أنس أبو شادی

69- کیمیکل کی خرید وفروخت کا حکم
سوال: کیمیکل کی خرید وفروخت کے بارے میںحکم دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ یہ نا جائز ہے کیونکہ نشہ آور اور نجس ہے۔
فتاوی اللجنۃ الدائمہ 53/13

تبصرہ:
فقہاء احناف او رظاہریہ ہر نجس شئے جس میں فائدہ ہو اسکی خرید وفروخت اور تجارت کو حرمت سے مستثنی کرتے ہیں اس رائے کے مطابق کیمیکلز کی خرید وفروخت جائز ہے۔
علمی رد:

[136] سعودی عرب کے شہر جدہ میں قسطوں پر خرید وفروخت کے موضوع پر مجمع الفقۃ الاسلامی (اسلامی فقہ اکیڈمی) کی چھٹی کانفرس کی قرار داد میں آیا ہے۔

[137] مجلس مجمع الفقہ الاسلامی المنعقدہ فی دورہ مؤتمر السادس بجدہ فی المملکہ العربیہ السعودیہ 17_ 23 شعبان 410 الموافق 14_ 20 ـمارچ 1995۔

حضرت جابر بن عبداللہ -رضی اللہ عنہ- سے روایت ہے کہ رسول اکرم -صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "إن اللّه حرّم بيع الخمر والميتة والخنزير وا لأصنام"، اسے راویوں کی ایک جماعت نے روایت کیا، اللہ تعالی نے شراب ،مردار خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کیا ہے۔
عرض کی گئی کہ یا رسول اللہ - -صلی اللہ علیہ وسلم-مردار کی چربی کے بارے میں آپ - صلی اللہ علیہ وسلم-کیا فرماتے ہیں ا سے جہازوں پر لگایا جاتاہے اور اسے کھالوں پر لگایا جاتا ہے اور لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں تو آپ - صلی اللہ وسلم- نے فرمایا: "لا، هو حرام"، "نہیں یہ حرام ہے۔
امام بیہقی رحمہ اللہ عنہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہےکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس تیل کے بارے میں دریافت کیا گیا جس میں چوہا گر گیا ہو تو آپ نےفرمایا: اس سے چراغ جلاؤ اور جسم پر لگاؤ۔(138)
اور نبی کریم -صلی اللہ علیہ وسلم- قبیلہ میمونہ کی بکری کے پاس سے گزرے چنانچہ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اسے مردہ پڑے ہوئے پایا تو -صلی اللہ علیہ وسلم-نے فرمایا: "هلاّ أخذتم إهابها فدبغتموه وانتفعتم به"، تم اس کی کھال کیو ں نہیں لیتے ہو اور اسے دباغت کے بعد اس سے فائدہ حاصل کرو تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- یہ مردہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "إنما حرّم أكلها"، فقط اس کا کھا نا حرام ہے (دوسرے فوائد حاصل کرسکتے ہو) ۔ اسے ابن ماجہ کے علاوہ ایک جماعت نے روایت کیا۔
جمہور علماء کے نزدیک نجس چیز کی خرید وفروخت یا تجارت حرام ہے ۔اور اس پر عقد (بیع) باطل ہے اسکی دلیل پہلی حدیث مبارکہ ہے جو کہ اس کے حرام ہو نے کی صراحت کرتی ہے۔
دوسری حدیث اورحضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی روشنی میں کھانے کے علاوہ ناپاک چیز کا استعمال جائز ہے۔
فقہاء حنفیہ کے نزدیک ہر نجس چیز جس میں نفع ہو اسکی خرید وفروخت اور تجارت جائز ہے اور فقہاء ظاہر یہ نے انکی پیروی کی اور انہوں نے کہا جانوروں کا گوبر اور ناپاک کوڑا کھاد اور ایندھدن کے طور پر استعمال ہوتا ہے اسکی بیع بھی جائز ہے اسی طرح ناپاک تیل اور ناپاک رنگو ںسے کھانے کے علاوہ استفادہ کرنا جائز ہے۔(139)
اس میں انکی دلیل یہ ہے جب تک فائدہ حاصل کرنا جائز ہے تو اس مقصد کے لئے (کھانےکے علاوہ) اسکی خرید فروخت بھی جائز ہے ۔ اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارےمیں جواب دیا ہے کہ خرید وفروخت کی ممانعت اوائل اسلام میں تھی جب مسلمان اسے کھانا جائز سمجھتے تھے تو جب اسلام انکے دلو ں میں راسخ ہو گیا تو کھانے کے سوا انکے نفع کو حلال قرار دیا۔(140)

ڈاکٹر أنس أبو شادی

---

138 سنس البہقی 20116۔

139 صحیح البخاری 2221 صحیح مسلم 832

140 فتاوی دارا لافتاء المصریہ مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 997 ۔

70- ویڈ یو کیسٹس کی تجارت کا حکم
سوال: ویڈیو کیسٹس کی تجارت کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : جواب دیا گیا کہ یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ فساد کی دعوت دیتی ہے اس لئے انکی خرید وفروخت حرام ہے ۔
شیخ ابن باز مجلۃ الدعوہ ۔ شمارہ 1045

تبصرہ:
یہ جدید آ لات بھلائی اور برائی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اسکی شرعی ذمہ داری اسکے نشر کرنے اور استعمال کرنے والے پر ہے۔
علمی رد:
یہ جدید آ لات کسی ایسے آلے کی طرح ہے جو نیکی اور برائی دونں کیلئے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے قلم اس سے ہم علمی سبق بھی لکھتے ہیں اور اس سے گالی او ر غلط خبریں بھی لکھتے ہیں ۔
او راسی طرح گلاس جس میں آپ پانی اور حلال چیزیں نوش کرتے ہیں اور اسی میں آپ حرام مشروب بھی پیتے ہیں اور متعدد معاملات ایسے ہیں کہ اگر یہ آ لات نہ ہوں تو انہیں حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔چنانچہ وہ معاملات اور اشیاء جو اصلا یا غالبا حلال ہیں اور عقیدے اور اخلاق پر انکی بری تاثیر نہیں ہے اور نہ کو ئی فرض ترک ہوتا تو انکا سننا اور دیکھنا حلال ہے اور اسی طرح ان میں تجارت بھی حلال ہے وگرنہ جائز نہیں ۔
اگر ان آ لات کو نیکی کی ریکارڈ نگ یا براڈکاسٹنگ یا دیکھنے اور سننے کے لئے استعمال کیا جائے تو انکے بہت عظیم فوائد ہیں او ر یہ انسان کے لئے اسی وقت ممکن ہے کہ وہ ان آ لات استعمال کی قدرت رکھتا ہو اور ہر انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ ان کو کنٹرول کرے چنانچہ شرعا اس کی ذمہ داری اسنعمال کرنے والے پر ہے، بنانے یل فروخت کرنے والے پر نہیں، اور اگر وہ کنٹرول کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو پھر نشر کرنے اور پیش کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالی سے ڈریں اور ایسی چیز اختیار کریں جو نفع بخش اور سود مند ہوں اور دین اور ذوق کے منافی ہر چیز سے اجتناب کریں ۔
اسکی بنا پر جب کوئی چیز نشر یا پیش کیا جائے تو نشریات کے ذمہ داروں کو قرآن کی روشنی می ںاس کی رعایت کی تنبیہ کی جائے ۔ارشاد باری ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل 125)، ترجمہ: "اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم- آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے "۔([141]) اللہ اعلم۔
ڈاکٹر أنس أبو شادی

[141] فتاوی دارا لافتاء المصریہ موضوع 72 مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997۔

71- بینکوں کے معاملات کا حکم

سوال: بینکوں کے ساتھ معاملات کرنے کے بارے میں دریافت کیاگیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ انکی بنیاد سود پر ہے اور یہ لین دین میں اسی(سود) پر ہی معاملات کرتے ہیں اور ان میں فوائد کے بغیر اموال رکھنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ظلم اور گناہ میں تعاون ہے۔

الشیخ ابن باز مجموع فتاوی و مقا لات 137/19

تبصرہ :

(1) اسلام نے نقد میں سود کے اضافے اور مدت کی شرط پر سود، دونوں قسموں(کےسود) کو حرام قرار دیا ہے۔ اور یہ حرمت قرآن کریم ، حدیث نبوی کی قطعی نصوص او رائمہ کے اجماع سے ثابت ہے۔

(2) بیکنو ں کے فوائد بھی حرام سود میں سے ہیں لیکن بینکوں میں فوائد کے بغیر حفاظت کے لئے اموال جمع کرنا جائز ہے کیونکہ تعین کرنے سے انکا تعین (ممکن) نہیں ہو تا اور سودی اموال میں انکے اختلاط (کے خوف)سےانکا جمع کرانا حرام نہیں ہوتا۔

علمی رد:

اسلام نے سود اور مدت یا تاخیر سے ادائیگی کے عوض مخصوص پیشگی فوائد پر قرض کی اہم انواع کو حرام قراردیا ہے۔

اور اس کا حرام ہونا قرآن کریم ، حدیث نبوی کی قطعی نصوص او رائمہ کے اجماع سے ثابت ہے ۔ ارشاد باری ہے: ﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لاَ يَقُومُونَ إِلاَّ كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ(275) يَمْحَقُ اللّهُ الْرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (البقرہ 276/275)، ترجمہ: "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ روز قیامت کھڑ ے نہیں ہو سکیں گے مگر جسے وہ شخص کھڑا ہوتاہے جسے شیطان نے چھوکر بد حواس کردیا ہو ،یہ اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت (خریدو فروخت) بھی سود کی مانند ہے ،حا لانکہ اللہنے تجارت کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کیا ہے ،پس جس کے پاس اس کے رب کی جانب سے نصیحت پہنچی سو وہ سود سے باز آگیا تو پہل ےگزر چکا وہ اسی کا ہے اور اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ،اور جس نے پھر بھی لیا سو ایسے لوگ جہنمی ہیں ،وہ ہمیشہاس میں رہینگے ،او راللہ سود کو مٹاتا ہے (یعنی سودی مال سے برکت ختم کرتا ہے) اور صدقات کو بڑ ھاتاہے (یعنی صدقہ کے ذریعے مال کو زیادہ کرتاہے)اور اللہ کسی بھی نافرمان کو پسند نہیں کرتا"۔

حضور -صلی اللہ علیہ وسلم-نے فرمایا: "الذھب بالذھب یدا بید والفضل ربا" ہاتھوں ہاتھ سونے کے بدلے (برابر) سونا (قرض) لینا اور دینا اور اضافہ سود ہے۔

ان شرعی نصوص وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سود حرام ہے اور وہ مبلغ جو بینکوں اور ڈاکخانوں میں رکھی جا تی ہے اگر اس پر مقررہ کردہ پیشگی فوائد ہو ں جنہیں قانون قرضوں کے فوائد قرار دیتا ہے تو یہ مذکورہ نصوص اور مسلمانوں کے اجماع کی وجہ سے اسلا م میں حرام سود کی اقسام ہوتی ہیں۔

جبکہ فوائد کے بغیر حفاظت کے لئے نقد اموال جمع کرانا جائز ہے کیونکہ تعین کرنے سے انکا تعین (ممکن) نہیں ہو تا اور سودی اموال میں انکے اختلاط (کے خوف)سےانکا جمع کرانا حرام نہیں ہوتا ۔ اور اگرایسا ہوتا ہےتو مسلمانوں میں سے صاحبان ثروت پر لازم ہے کہ وہ اپنےاموال کی ایسی سرمایہ کاری کریں جس سے حرام نہ آئے ،کیو نکہ اللہ سبحانہ وتعالی ہر انسان سے اسکے مال کے بارے میں پوچھے گا کہ تم نے اسے کیسے کمایا اور کیسے خرچ کیا ۔جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے۔
خاص طور پر اگر یہ بینک اموال کی سرمایہ کاری اور تعامل کرتے اور اسلام کے تقاضوں کے مطابق انکی زکاۃ بھی نکالتے ہیں (تو ان میں سرمایہ کاری جائز ہے)۔
اور یہ وہ رائے ہے جس پر ازہر شریف کے جمہور معاصر علماء اور انکے علاوہ علماء بھی ہیںا ور صحیح شرعی نصوص اسی کی تائید کرتی ہے۔([142])
اور بعض کے نزدیک یہ(بینک کے) فوائد حلال ہیں۔([143])
اور اسکی تائید صرف شافعیہ کا قول کرتاہے کہ مروجہ نقد پیسوں میں سود کا اطلاق نہیں ہوتا (جیسے ورق کے نوٹ) اور جواب شافعیہ نے کہا ہے یہ انکے پرانے قول کے خلاف ہے ورق کے پیسے تمام زمانو ں اور مکانوں میں عام قیمت بن چکے ہیں جسکی وجہ سے انہیں سونے اور چاندی سے ملانا واجب ہے۔ اللہ اعلم۔
ڈاکٹر انس ابو شادی

72- بینکوں کے حصص کا حکم

سوال: بینکو ں کے حصص کے لین دین (تجارت) کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ بینکو ں کا کام حرام ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔
الشیخ ابن عثیمین نے1412/7/9 ھ کو اسے لکھا

تبصرہ:
حصص جاری کرنے والی کمپنی اگر حلال شعبے میں کام کرتی ہے تو عام حصص کا لین دین (خرید وفروخت) جائز ہے ۔ اور اگر کمپنیاں حرام او ر خبیث شعبوں میں کام کرتی ہین تو حصص کی خرید وفروخت جائزنہیں۔

علمی رد:
عام حصص میں خرید وفروخت (تجارت) جائز ہے بشرطیکہ حصص جاری کرنے والی کمپنی حلال شعبے میں کام کرتی ہو ،وار انکے معاملات ، سود ، ملاوٹ ذخیرہ اندوزی ،دھوکہ،فریب

---

[142] فتاوی دارا لافتاء المصریہ موضوع (615) (618) مفتی شیخ عبدالمجید سلیم 27 شعبان 1342 ھ27 جنوری 1930ء16 جمادی ا لاول 1362ھ 20 مئی 1943 الموضوع (950)مفتی فضیلت شیخ حسن مامون ذوالقعدہ 1379 ھ24 مئی 1960۔
موضوع (744) مفتی فضیلت شیخ احمد ھریدی 2جو لائی 1969 موضوع (1255) (1258) مفتی فضیلت شیخ جادالحق 4ربیع ا لاول 1400 ھ 22 جنوری 1980 ،7 ربیع ا لاول 1401 ھ13 جنوری 1981 موضوع 4 ،مفتی فضیلت شیخ ،طیہ صقر مئی1997۔

[143] فضیلت شیخ محمد سید طنطاوی شیخ ازھر ،فضیلت شیخ الدکتور علی جمعہ مفتی دیار مصر اور سابق مفتی فضیلت الدکتور نصر فرید واصل۔

،جہالت جوئے اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی ہر صورت سے خالی ہوں ،اور اگر کمپنیاں حرام و خبیث شعبوں میں کام کرتی ہوں تو حصص کی تجارت جائز نہیں۔
جو شخص ممنوعہ چیزوں کی تجارت کرنیوالی کمپنیوں میں انکی تمام سرگرمیوں کو تبدیل کرنے کے ارادے سے حصص ڈالے کہ وہ انہیں شریعت اسلامی کی مخالفت سےروکے گا، تو اگر وہ صرف اپنا حصہ ڈ النے سے تبدیل کرنے پر قادر ہے تو یہ امر اس سے مطلوب ہے کیونکہ اس میں شریعت اسلامی کے احکام پر عمل پیرا ہونے میں مسلمانوں میں اضافہ ہے اور اگر وہ حصہ ڈالتے وقت اسکی قدرت نہیں رکھتا،لیکن وہ مستتقبل میں کوشش کرے گا اور وہ جنرل کمیٹی ، مجلس منتظمہ ،کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اجلاسوں کے دوران اس (تبدیلی) کی کوشش کرے گا تو اس حالت میں حصہ ڈالنا ،اس کے جائز ہونے میں اختلاف ہے. ان دونوں حالتو ں میں حصہ داروں کو چاہیے کہ وہ حرام چیزوں سے چھٹکاراحاصل کرکے کمپنی کی سرگرمیوں کو بھلائی اور خیر کے طریقوں میں تبدیل کریں۔([144])

ڈاکٹر انس ابو شادی

73- بینکوں میں کام کرنے کا حکم
سوال: بینکوں میں کام کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ انکی بنیاد سود پر ہے اور لین دین میں اسی سود پر تعامل (کاروبار) کرتے ہیں ۔اور جو بھی ایسے ہیں انکے ساتھ کام کرنا جائز نہیں ہے۔
الشیخ ابن عثیمین نے1412/7/9 ھ کو اسے لکھا

تبصرہ:
عام حا لات میں بینک کچھ سرگرمیاں ایسی کرتے ہیں جو دین کے مخالف نہیں ہوتی اور کچھ ایسی ہیں جو مخالف ہو تی ہیں ۔چنانچہ انکے اموال میں شبہ ہوتا ہے کیو نکہ ان میں حلال اور حرام (دونوں) ملے ہوتے ہیں ،چنانچہ اگر ملازم براہ راست سودی کام اور معاھدے میں شریک نہیں ہوتا تو اس کے لئے بینکو ں میں کام کرنا جائز ہے۔
علمی رد:
بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ ، چیک کیش کرنا ، تصدیق نامے اور داخلی ڈرافٹس جو کہ تاجروں کے درمیان یا بینکوں کے اندر انجام دئیےجاتےہیں ۔اور اس طرح کے اعمال سے جو حاصل ہوتا وہ سود نہیں اور بینک میں ان اعمال کا انجام دینا بھی حرام نہیں ہوتا۔
لیکن بینک کچھ ایسی سرگرمیاں کرتے ہیں جو کہ دین کے خلاف ہین .انہی میں سے ائتمان یعنی فائدے کے ساتھ قرض لینا اور دینا اور یہی بینکوں کا بنیادی کام ہے ،تو اس وجہ سے بینکوں کے اموال میں حلال اور حرام دونوں ملے ہو تے ہیں ۔
اس بنا پر ان بینکوں میں کام کرنے میں شبہ ہے اور شبہ اگرچہ حرام نہیں مگر حرام کی چراہ گاہ(ضرور) ہے۔
جیسے کہ امام بخاری اور مسلم کی روایت کردہ حدیث مبارکہ کی نص ہے۔

[144] فتاوی دارا لافتاء المصریہ موضوع 8 مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997۔

"الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُتَشَابِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنْ النَّاسِ فَمَنْ اتَّقَى الشُّبُهَات اسْتَبْرَأَ لِعِرْضِهِ وَدِينِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى فَيُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ"، ترجمہ: "حلال (امور) واضح اور حرام (امور) بھی واضح ہیں ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں انہین اکثرلوگ نہیں جانتے ۔پس جو شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنا دین اور عزت بچالی اور جو شبہات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں پڑ گیا جیسے (کوئی) چرواہا کسی ممنوع چراہگاہ کے گرد بکریا ں چراتا ہے تو قریب ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے"۔
اگر مومن چاہیے کہ وہ مکمل طور پر یا کچھ مطئن ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ایسا عمل تلاش کرے جس میں زیادۃ یا واضح طور پر شبہ نہ ہو خواہ کمائی یا اجر تھوڑا ہی ہو جو کہ زیب وزینت کے علاوہ ضرورتوں کیلئے کافی ہو اور اگر حلال روزگار میسر نہ ہو تو حرام اور شبہ سے خالی بہتر عمل کی تلاش کے ساتھ وقتی طور پر ضرورتا اس میدان میں کام جائز ہے ۔اور اگر نیت سچی ہوئی تو اللہ تعالی وہ کام آسان کر دیگا ۔جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا (2) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق3،2)، ترجمہ: اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے (دنیا و آخرت کے رنج وغم سے) نکلنے کی راہ پیدا کر دیتاہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے جہا ں سے اسکا گمان بھی نہیں ہوتا ۔ایک اور مقام پر فرمایا: "﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ (الطلاق 4)، ترجمہ: اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اس کے کام میں آسانی فرمادیتا ہے۔([145])
اور پہلے بیان ہوچکا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک بینکوں کے فوائد حلال ہیں۔
شوافع کے قول کہ" مروجہ روپیو ں جیسے ورق کے نوٹ پر سود کا اطلاق نہیں ہوتا "پر اعتماد کرتے ہوئے وہ شخص جو بینکوں میں کام کرنے کی آزمائش کا شکار ہے اُسے چاہئے کہ وہ اس رائے کی تقلید کرے ۔اور یہ حرام کا اعتقاد لے کر کام پر جانے سے افضل ہے۔([146]) اللہ اعلم۔
اور اگر ملازم براہ راست سودی کام اور معاھدے میں شریک نہ ہو تو بعض علماء نے بینک میں کام کرنے کی اجاز ت دی ہے ۔ شیخ عبدالمحسن بن ناصر آل عبیکان نے کہا : ہائی کورٹ کمیٹی کے سابق سر براہ عزت مآب ہمارے شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید کے نزدیک اگر ملازم کا براہ راست سودی کام اور عقد سے تعلق نہ ہو تو بینک میں ملازمت کرنا جائز ہے۔([147])

---

[145] فتاوي دارا لافتاء المصريہ موضوع 8 مفتي فضيلت شيخ عطيہ صقر مئي 1997۔

[146] او ریہ ایسے ہی ہے جیسے اہل علم نے اس شخص جو کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کو استعمال کی آزمائش میں ہے کے بارے میں کہا ہے کہ اسے چاہیے کہ وہ ابوداؤد ظاہری کے قول سے انکا استعمال کرنا مکروہ تن یہی ہے ۔حرام نہیں جوکہ جمہور علماء کہتے ہیں ،تاکہ حرام سے نجات ملے حاشیہ البیجوری علی ابن قاسم العزی 41/1۔

[147] ایک قول کی نص یہ ہے:
ہاں: جب تک تمہاری تنخواح میں باالذات عین سود نہیں بلکہ مخلوط ہے احتمال ہے کہ وہ سود ہو اور احتمال ہے کہ وہ سود نہ ہو تو اس میں کو ئی حرج ،چنانچہ جب تک معاملہ میں اشتباہ ہے ،تبرا کے لئے اسے تنخواہ لینا جائز ہے خاص طور پر تم لکھنے میں مدد نہیں کرتے ہو اور نہ ہی تم وہ پیسے لکھتے ہو جن میں سود کا شائبہ ہوتا ہے ۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعا لی سود کھانے ،اسکے کھلانے والے ،اسکے لکھنے والے اور اسکی گواہی دینےوالوں پر لعنت بھیجتا ہے ۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں اپ نے فرمایا (سود کے 73 دروازے ہیں ان میں کم تر ایسے ہے جیسے آدمی اپنی ماں سے زنا کرے"۔
چنانچہ سود بہت ہی بڑا گناہ ہے ۔اور ابن دقیق عید نے کہا کہ معاذاللہ سود کھانے والوں کا انجام برا ہے ۔خلاصہ یہ ہے کہ جب معاملے میں تمہیں شک اور تمہیں تمہاری تنخواہ دی جائے اور تمہیں معلوم نہیں کہ وہ عین سود یا اسکے علاوہ ہے تو اسکے لینے میں حرج ہے جیسا کہ شیخ ا لاسلام ابن تیمیہ نے اس کی تائید کی ہے ۔اور اگر تم سود نہیں لکھتے ،نہ لکھنے میں مدد کرتے ہو بلکہ دوسری چیزیں لکھتے ہو جیسا کہ تمہارے سوال سے ظاہر ہے تو انشاءاللہ تم پر کوئی گناہ نہیں ۔ اللہ اعلم۔ مجموع فتاوی (1871- 188)انٹرنیٹ پر شیخ عبیکان website۔

شیخ عبدالمحسن بن ناصر آل عبیکان نے کہا: یہی را ئے صحیح ہے۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

74- بینکوں کے فوائد سے نفغ اٹھا نے کا حکم
سوال: بینکوں کے فوائد سے نفغ اٹھا نے کے حکم کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلا صہ فتوی: جواب دیا گیا کہ(بینک کے) اس فائدہ کےحرام ہونے کی وجہ سے جائزنہیں کیونکہ یہ واضح سود ہے اور یہ کہ بینکو ںسے تعامل کے حرام ہو نے کی وجہ سے بھی نا جائزہے۔
شیخ ابن عثیمین ۔ مجموع دروس فتاوی الحرم المکی 3/386-390
تبصرہ:
بینکوں میں رکھے گئے اموال پر فوائد حاصل کرنا جائز ہوتا ہے لیکن ان فوائد سے نفع نہ اٹھایا جائے اور انہیں عام مسلمانوں کے لئے مفید منصوبوں پر خرچ کیا جائے۔
علمی رد:
اسلام نے سود اور طویل مدت یا تاخیر سے ادائیگی کے عوض مقررہ پیشگی فوائد پر قرض کی اہم اقسام کو حرام قرار دیا ہے۔
اور یہ حرمت قرآن کریم ،حدیث نبوی کی قطعی نصوص اور ائمہ کرام کے اجماع سے ثابت ہے ۔
ارشاد باری ہے : ﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لاَ يَقُومُونَ إِلاَّ كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَن جَاءهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ(275)يَمْحَقُ اللّهُ الْرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (البقرہ 275/276)، ترجمہ: "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ روز قیامت کھڑ ے نہیں ہو سکیں گے مگر جسے وہ شخص کھڑا ہوتاہے جسے شیطان نے چھوکر بد حواس کردیا ہو ،یہ اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت (خریدو فروخت) بھی سود کی مانند ہے ،حا لانکہ اللہنے تجارت کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کیا ہے ،پس جس کے پاس اس کے رب کی جانب سے نصیحت پہنچی سو وہ سود سے باز آگیا تو پہل ےگزر چکا وہ اسی کا ہے اور اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ،اور جس نے پھر بھی لیا سو ایسے لوگ جہنمی ہیں ،وہ ہمیشہاس میں رہینگے ،او راللہ سود کو مٹاتا ہے (یعنی سودی مال سے برکت ختم کرتا ہے) اور صدقات کو بڑ ھاتاہے (یعنی صدقہ کے ذریعے مال کو زیادہ کرتاہے)اور اللہ کسی بھی نافرمان کو پسند نہیں کرتا "۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الذهب بالذهب يدا بيد والفضل ربا" ہاتھوں ہاتھ سونے کے بدلے (برابر) سونا (قرض) لینا اور دینا اور اضافہ سود ہے۔
ان شرعی نصوص وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سود حرام ہے اور وہ مبلغ جو بینکوں اور ڈاکخانوں میں رکھی جا تی ہے اگر اس پر مقررہ کردہ پیشگی فوائد ہو ں جنہیں قانون قرضوں کے فوائد قرار دیتا ہے تو یہ مذکورہ نصوص اور مسلمانوں کے اجماع کی وجہ سے اسلا م میں حرام سود کی اقسام ہوتی ہیں۔

حرام کمائی ہونے کی وجہ سے ان بینکوں کے فوائد سے استفادہ کرنا مسلمان کے لئے جائز نہیں اور اسے چاہئے وہ انہیں لیکر کسی بھی نیکی کے کام میں لگا دے۔(148)
جیسے مساجد ،یا ہسپتالوں کی تعمیر یا انہیں کسی فقیر یا مسکین کو دےدے ،جیسا کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حرام مال کو خرچ کرنے کا اشارہ ہے تاکہ مسلمان اللہ تعا لی کے سامنے بری الذمہ ہو۔(149) اللہ اعلم۔
ڈاکٹر انس ابو شادی

75- سودی بینکوں میں حلال سرمایہ کاری کا حکم

سوال: سودی بینکوں میں حلال سرمایہ کاری کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں ہے کیونکہ بینکو ں کی بنیاد سود پر ہے اور ان سے لین دین کرنا اور ان میں سرمایہ کاری کرنا جائز نہیں ہے۔
فتاوی اللجنۃ الدائمہ21406

تبصرہ:
جب بینک یہ دعوی کریں کہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق کام کر رہے ہیں اور انکے لئے معروف علماء کرام پر مشتمل ایک نگراں کمیٹی ہے ۔اور اس نےان کے معاملات کی تائید کی ہے کہ یہ شریعت کے مطابق ہیں تو ایسے بینکوں سے معاملات کرنا جائز ہے ۔
علمی رد:
جب یہ دعوی کیا جائے کہ بینک شریعت اسلامیہ کے مطابق کام کر رہے ہیں اور انکے لئے معروف علماء کرام پر مشتمل ایک نگراں کمیٹی ہو ۔اور یہ علماہ کرام ان بینکوں کے معاملات کی تو ثیق کریں کہ یہ شریعت کے مطابق ہیں تو اس وقت ان بینکوں سے معاملات کرنا جائز ہے۔
تو ایسی صورت میں ان معاملات کی ذمہ داری شرعی نگرا ں کمیٹی پر ہوگی۔ اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

76- سرمایہ کاری کے سر ٹیفیکیٹس کا حکم

سوال: سرمایہ کاری کے انعامی سر ٹیفیکیٹ کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ یہ جوئے میں سے ہے۔
فتاوی اللجنہ الدائمہ نمبر 443/4
شیخ یاسر بر ہانی، www.alsalafway.com

تبصرہ:

---

148 دیکھئے امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین 882 ،883 مسلسل 92 ،93 زیر عنوان الحلال والحرام النظر الثانی فیا ا لصرف۔

149 تاوي دارا لافتاء المصریہ موضوع (126) فضیلت شیخ جادالحق علی جاد الحق 5 محرم 1402 ھ ،2 نومبر (1 981)۔

وہ انعامات جو گروپ ج میں سے سرمایہ کاری کے سرٹیفیکیٹس رکھنے والوں میں سے کامیاب ہونے والوں اور بچت دفتروں میں ذخیرہ اندوزوں کو دیئے جاتے ہیں یہ تحفہ یا انعام کے وعدے میں شمار ہو تے ہیں جنہیں فقہاء نے حلا ل قرار دیا ہے۔

علمی رد:

وہ انعامات جو گروپ ج میں سے سرمایہ کاری کے سرٹیفیکیٹس رکھنے والوں میں سے کامیاب ہونے والوں اور بچت دفتروں میں ذخیرہ اندوزوں کو دیئے جاتے ہیں یہ تحفہ یا انعام کے وعدے میں شمار ہو تے ہیں جنہیں فقہاء نے حلا ل قرار دیا ہے کیونکہ ان میں فائدہ مشروط ہے نہ ہی مدت اور مقدار مقرر ہے. تو یہ ان فقہاء کےنزدیک جنہوں نے انعام کے وعدے کی اجازت دی یہ جائز معاملات میں داخل ہوتے ہیں. اور یہ جوئے کی (اقسام)میں سےنہیں ہے ،اور اسکے جوا ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس میں شریک ہونے وا لا فائدہ حاصل کرے گا یا نقصان اٹھائے گا۔([150])

یہی جوئے کی تعریف ہے ۔اور سرماکاری کےیہ سر ٹیفیکیٹ ایسے نہیں ہیں بلکہ ان میں فقط فوائد حاصل کرنا ہے اور نقصان نہیں ہے کیونکہ ان میں حصہ لینے والوں کو اگر انعام نہ ملے تو اسکا مالی نقصان بھی نہیں ہے ،اس وجہ سے انکے معاملات جائز ہوتے ہیں اور گروپ ج سے سرمایہ کاری کے سرٹیفیکیٹس یا بچت دفاتر سے اسکو انعام ملناہے تو اسکی ملکیت جائزہوتی ہے۔([151]) (اسے لینا جائزہے) اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

77 - انشورنس کا حکم

سوال: تجارتی انشورنس کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ یہ جوا ہے اور اس میں دھوکا ہے۔

شیخ ابن جیرین اللؤلو المکین190 -191
شیخ یاسر بر ہانی www.alsalafway.com

تبصرہ:

انشورنس ایک جدید معاملہ ہے اس کے حکم میں معاصر علماء کا اختلاف ہے.مگر عصر حاضر کی زندگی کے حا لات ، تنگی ومشقت کو دور کرنے کے لئے انشورنس کی کچھ قسموں کو ضرور ی قرار دیتے ہیں۔

علمی رد:

انشورنس کا نظام بنیادی طور پر نفع پہنچانے ، باہمی تعاون اور ہمدردی پر قائم ہے ،اس معنی میں اگر وہ اپنے اموال کی سرمایہ کاری ، اپنے معاھدوں اور نظام میں شرعی احکام کی پابندی کرے تو یہ اصل اسلامی اقدار میں سے ہے ۔ اور آج ہمارے زمانے میں انشورنس کے معاھدوں

---

[150] امام شوکانی نے نیل الاطار میں کہا ہے کہ ہر وہ کھیل جو فائدے اور نقصان سے خالی نہیں ہوتا وہ جوا ہے۔ نیل الاوطار 107/8۔

[151] موضوع (1253) مفتی فضیلت شیخ جادالحق علی جادالحق 22 صفر 1400 ھ 10 جنوری 1980۔

اور نظام کی مختلف قسمیں ہیں. تجارتی انشورنس .سوشل انشورنس یا باہمی ضمانت وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔
سوشل انشورنس جسکا مقصد نفع نہیں بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے والوں /مستفید ہو نے والوں کی سوشل حفاظت ہوتی ہے. یہ اس طرح کہ ملازم کی پوری مدت ملازمت کے دوران قانونی طریقے سے اسکی تنخواہ کا کچھ حصہ منھا کیا جاتاہے (کٹوتی کی جاتی ہے) چنانچہ اس سے فائدہ اٹھانا ،اورجو ادارے یہ کا م انجام دیتے ہیں ان میں کرنا جائز ہوتا ہے ۔اور اسی کی مانند اسلامی انشورنس یا ضمانتی انشورنس یا تعاونی انشورنس ہے۔ اللہ اعلم۔

جبکہ تجارتی انشورنس میں اختلاف ہے اور جمہور علماء عصر کے نز دیک تجارتی انشورنس یا زندگی اورغیر منقولہ جائداد وغیرہ کا بیمہ کرانا ممنوع ہے ۔اور ان چیزوں کی انشورنس اس طرح ہوتی ہے ان کے آگ سے جلنے یا تلف ہونے کی صورت میں عوض کے طور پر مقررہ مدت کیلئےمعتمد کمپنی کو معین مبلغ دی جاتی ہے ،اوراس کے بدلے میں حادثات وغیرہ کی وجہ سے جو چیز ہلاک یا تلف ہوئی وہ کمپنی اسکے(نقصان) کی ذمہ داری لیتی ہے اور انکے نزدیک اس صورت میں انشورنس جائز نہیں ہے کیونکہ یہ معاهدہ خطرے یا حادثے کے ہونے سے مشروط ہے کبھی واقع ہوتا ہے اور کبھی نہیں ،اس معنی میں یہ جانبداری اور جوئے کے مشابہ ہے اورشرعا(یہی) اسکے فاسد ہونے کا راز ہے۔ ([152]) اور بعض معاصرعلماء کرام کے نزدیک یہ حلال ہے انٰ میں سے شیخ علی الحفیف ،محمد یوسف موسی ،عبد الوہاب خلاف ،مصطفی الزرقا اور مفتی دیار مصر ڈاکٹر علی جمعہ ہیں۔ ([153])
اور احتیاط کے لئے جمہور علماء کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے ۔مگر عصر حاضر کی زندگی کے حا لات ،تنگی ومشقت کو دور کرنے کے لئے انشورنس کی کچھ قسموں کو ضرور ی قرار دیتے ہیں ،اور یہ اس کے لئے جسے اپنےاموال کے ضائع ہونے کا خوف رہتا ہو۔ خاص طور پر وہ اموال جن میں اسکے ساتھ بہت سے لوگ شامل ہوں ۔بس ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں ،اور انشورینس سے اسکا لین دین۔
ضرورت کے باب میں یا یقینی طور پر شدیدحاجت ہوگی چنانچہ تجارتی انشورنس کے نظام میں موجود دھوکہ قابل معافی ہوگا ۔ اللہ اعلم۔
ڈاکٹر انس ابو شادی

---

[152] موضوع (666) مفتی فضیلت شیخ بکری الصدفی 10 شعبان 1328ء ۔موضوع (660)مفتی فضیلت شیخ محمد بخیت 13 ربیع ا لاخر 1337 ھ ۔ 15 جنوری 1919 ء موضوع (668) مفتی فضیلت شیخ عبدالرحمن قر عہ جمادی الثانی 23 ستمبر 1921 ء موضوع (1278) مفتی فضیلت شیخ جاد الحق علی جادالحق 7 صفر 1401 ھ 14 دسمبر 1980 م ۔

[153] انہوں نے عاقلہ پر قیاس سے استد لال کیا ہے ۔العاقلہ دیت دینے وا لا شرعی طور پر قتل خطا میں قاتل کی طرف سے دیت ادا کرتا ہے ،یہی حیثیت و حالت انشورنس کمپنیوں کی ہے کہ وہ نقصانات کی تلافی اور مصائب میں کمی کرتی ہے۔
اور انہوں نے راستے خطرات کی ضمانت کے مسألۃ سے بھی اسبد لال کیا ہے اور احناف نے اسکو جائز قرار دیا ہے اسکی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہتاہے تم اس راستے پر چلو یہ محفوظ ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں ضامن ہے ۔ اور وہ اس راستے پر چلا اور اسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تو کہنے والے پر ضمان ہے۔
اور انہوں نے پینشن اور اسکے مشابہ انشورنس کے نظام کے معاهدے پر قیاس سے بھی استد لال کیا ہے جوکہ ملازم کی تنخواہ میں سے کچھ حصہ ماہوار کٹوتی کی جاتی ہے تاکہ اسکی ملازمت کے اختتام پر اسکے بدلے میں اسے دیا جائے ۔اور یہ انشورینس کی اقساط کے مشابہ اور اسکا عوض ہے اور ان دونوں صورتوں میں اس شخص کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ دیگا اور اسکی مبلغ کتنی جمع ہوگی پھر وہ کبھی جمع شدہ اقساط سے زیادہ وصول کرتا ہے اور کبھی کچھ بھی وصول نہیں کرتا ۔چنانچہ اگر رٹائرمنٹ (پینشن) کا نظام جائز ہے تو انشورنس کا حکم بھی ایسے ہونا چاہئے۔

78- انشورنس کمپنیوں میں کام کرنے کا حکم
سوال: بیمہ یا انشورنس کمپنیوں میں کام کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ انشورنس کے ممنوع ہونے کی وجہ سے نا جائز ہے ۔کیونکہ یہ گناہ اور ظلم میں تعاون ہے۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ 15 /8

تبصرہ:
تجارتی انشورنس کمپنیوں میں کام کرنےکا حکم شرعی حکم کے تابع ہے ۔ چنانچہ نا جائز کہنے والوں کے نز دیک ان میں کام کرنا جائز نہیں ،اور ہم نے اسکی اجازت دی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہےکہ (ان کمپنیوں میں) کام کرنا جائز ہے۔
علمی رد:
فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اسلامی یا تعاونی انشورنس کمپنیوں میں کام کرنا جائز ہے جبکہ تجارتی انشورنس کمپنیوں میں کام کرنے کے سلسلے میں شرعی حکم کی پیروی کی جائے۔
جمہور علماء کی رائے ہے کہ ان میں دھوکہ ،فراڈ اور نقصان کی وجہ سے کام کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم میں معاونت ہے اور اللہ تعالی نے قرآن میں اس سے منع فرمایا ہے چنانچہ جو شخص اس رائے کی پیروی کرتا ہے اس کے لئے ان کمپنیوں میں کام کرنا جائز نہیں ۔
اور جواز کے قائل علماء کی رائے کی پیروی کرنے والے کیلئے ان کمپنیو ںمیں کام کرنا جائز ہے ۔ بہر حال اس معاملے میں شبہ ہے جوکہ حرام تو نہیں لیکن حرام کی چراہ گاہ ضرور ہے جیسے کہ امام بخاری اور مسلم کی روایت کردہ حدیث مبارکہ کی نص ہے: "الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُتَشَابِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنْ النَّاسِ فَمَنْ اتَّقَى الشُّبُهَات اسْتَبْرَأَ لِعِرْضِه وَدِينِه وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى فَيُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ"، ترجمہ: "حلال (امور) واضح اور حرام (امور) بھی واضح ہیں ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں انہین اکثرلوگ نہیں جانتے ۔پس جو شبھات سے بچ گیا تو اس نے اپنا دین اور عزت بچالی اور جو شبھات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں پڑ گیا جیسے (کوئی) چرواہا کسی ممنوع چراہگاہ کے گرد بکریا ں چراتا ہے تو قریب ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے"۔
اگر مومن چاہے کہ وہ مکمل طور پر یا کچھ مطئن ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ایسا عمل تلاش کرے جس میں زیادۃ یا واضح طور پر شبہ نہ ہو خواہ کمائی یا اجر تھوڑا ہی ہو جو کہ زیب وزینت کے علاوہ ضرورتوں کیلئے کافی ہو اور اگر حلال روزگار میسر نہ ہو تو حرام اور شبہ سے خالی بہتر عمل کی تلاش کے ساتھ وقتی طور پر ضرورتا اس میدان میں کام جائز ہے ۔اور اگر نیت سچی ہوئی تو اللہ تعالی وہ کام آسان کر دیگا ۔جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا (2) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق3،2)، ترجمہ: اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے (دنیا و آخرت کے رنج وغم سے) نکلنے کی راہ پیدا کر دیتاہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتا ہے جہا ں سے اسکا گمان بھی نہیں ہوتا۔
ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ (الطلاق 4)، ترجمہ: اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اس کے کام میں آسانی فرمادیتا ہے۔[154]

[154] فتاوي دارا لافتاء المصريہہ موضوع 8 مفتي فضيلت شيخ عطيہ صقر مئي 1997۔

79- سامبا ویزاکارڈ (تجارتی کا رڈز)کا حکم
سوال: سامبا ویزاکارڈ (تجارتی کارڈز) کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ یہ سود خوروں کا کام، اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا ہے۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ 13/ 524

تبصرہ:
اگر کریڈیٹ کارڈ کے کے مالک کے بینک اکاؤنٹ میں کارڈ سے خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ رقم ہو تو ان(کارڈز) کے مطابق عمل کرنا جائز ہے. اور بغیر غلاف کے کریڈٹ کارڈز سے لین دین کرنا جائز نہیں ۔ جبکہ وہ زیلدہ سودی فوائد سے مشروط ہوں ۔
علمی رد:
تجارتی کارڈ یا کریڈٹ کارڈ ، کسی بینک کی جاری کنندہ وہ دستاویز ہے جو وہ کسی شخص کے ساتھ معاھدے کی بنا پر حقیقی یا اعتباری (حامل کارڈ) کو دیتا ہے اس سے وہ فورا قیمت ادا کئے بغیر کسی معتمد تاجر سے سامان خرید ، یا خدمات حاصل کر سکتا ہے کیونکہ وہ مصدر (بینک) قیمت دینے کا پابند ہے اور (یہ قیمت) بینک اکاؤنٹ سے ادا ہو گی پھر وہ معینہ مدت کے دوران کارڈ کے مالک کی طرف لو ٹا دی جائے گی اور کچھ(کارڈز) وہ ہیں جو ادا نہ کی گئی رقم کے مجموعے پر مقررہ ادائیگی کی تاریخ کے بعد سودی فوائد عائد کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے (سودی) فوائد لاگو نہیں کرتے۔
او ریہ دو قسم کے ہیں جمیع اخراجات کو محیط کریڈٹ کارڈ اور جمیع اخراجات کوغیر محیط کریڈٹ کارڈ.
جمیع اخراجات کو محیط کریڈٹ کارڈز وہ ہیں جن کے مالک کے بینک اکاؤنٹ میں کارڈ سے خریدی ہوئی چیزوں کے برابر یا اس سے زیادہ رقم موجود ہوتی ہے۔
اور جمیع اخراجات کو غیر محیط کارڈ وہ ہیں جنکے مالک کے بینک اکاؤنٹ میں کارڈ سے خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت کے لئے رقم کافی نہیں ہوتی ہے۔
ا ن کارڈ ز کا حکم:
او لا: اگر اس کارڈ کا جاری کنندہ کوئی ایسا ادارہ یا کمپنی ہے جس میں نگراں شرعی کمیٹی ہو جو اسکے اعمال کی پیروی کرتی ہو تو ان کارڈ ز کے مطابق عمل کر نا جائز ہے بشرطیکہ یہ ادارے اپنے کسٹمرز(گاہکوں) پر واجب ا لادا قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے سودی اضافہ نہ کریں بلکہ اس کے اکاؤنٹ کی رقم قرضوں کے لئے پوری نہ ہو تو ، ضرورت اس امر کی ہے کہ قرض ادا کرنے تک اسکے کارڈ کو روک دیں ۔
ثانیا: تبصرہ اگر کریڈیٹ کارڈ کے کے مالک کے بینک اکاؤنٹ میں کارڈ سے خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ رقم ہو تو ان(کارڈز) کے مطابق عمل کرنا جائز ہے.
ثالثا: تبصرہ بغیر غلاف کے کریڈٹ کارڈز سے لین دین کرنا جائز نہیں ۔ جبکہ وہ زیلدہ سودی فوائد سے مشروط ہوں، یہاں تک کہ کارڈ کا خواہش مند اگر فراہم کردہ فری مدت کے اندر

ادائیگی کا عزم کرلے (تب بھی نہیں) بعض فقہاء نے([155]) بیرون ملک مقیم مسلمانوں کو دی گئی مہلت کے اندر ادائیگی کی پابندی کے ساتھ شدید حاجت کے لئے ان کارڈ ز کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ اس پر تاخیر کے فوائد کا اطلاق نہ ہوں۔
چنانچہ سود کھلانے وا لا بھی گناہ میں شامل ہوتا ہے او ربیرون ممالک یا اسلامی ممالک میں ر ہنے والوں کے درمیان بڑ ا فرق ظاہر نہیں ہوتا۔
رابعا: اصل قرض پر سود کی شرائط سے خالی، بغیر غلاف کےکارڈ جاری کرنا جائز ہے ۔ اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

80- ڈسکاؤنٹ کارڈ ز کا حکم

سوال: ڈسکاؤنٹ کارڈ ز کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں ۔کیونکہ اس میں دھوکہ ،سود ،خرچ کی زیادتی اور یہ دکانداروں کے درمیان بغض وعناد اور دشمنی کا سبب ہے۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ 14/13-16

تبصرہ:
ڈسکاؤنٹ کارڈ خریدنے وا لا شخص اگر یہ جانتا ہو کہ جو اس نے کارڈ کی قیمت ادا کی ہے اس سے عمومی طور پر خریداری کے مقابلہ میں کارڈ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے تو شرعی ممانعت نہ ہو نے کی وجہ سے کارڈ سے لین دین کرنا جائز ہے ۔کیونکہ یہ ڈسکاؤنٹ ،یا کمی کرانے کے قائم مقام ہے۔
علمی رد:
او لا: ڈسکاؤنٹ کارڈز جاری کرنا اور قبول کرنا شرعا جائز ہے بشرطیکہ یہ بغیر عوض اور فری جاری کئے جاتے ہوں ،کیونکہ یہ عطیہ دینے کا وعدہ یا بیچنے والے یا ایجنٹ کی طرف سے عطا کردہ تحفہ ہے۔
ثانیا: ڈسکاؤنٹ کارڈ(شرعی ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے) جاری کرنا اور قبول کرنا جائز ہے جب ان کی قیمت کا عوض قطعی یا سا لانہ اشتراک ہو اور ان کارڈز کا خریدارا جانتا ہے کہ جو اس نےکارڈ کی قیمت ادا کی ہے وہ عمومی طور پر خریداری کی نسبت کارڈ سے ز یادہ فائدہ حاصل کرتا ہے اور بیچنے وا لا اپنے سامان کی قیمت کم کرنے سے اسکی اشاعت سے فائدہ حاصل کرتا ہےکیونکہ یہ قیمت میں ڈسکاؤنٹ یا کمی کرنے کی طرح ہے اور اس میں کسی قسم کا دھوکہ فریب نہیں۔
ثالثا: مذکورہ ڈسکاؤنٹ کارڈ جاری کرنا یا انہیں خریدنا جائز نہیں جب انکی قیمت کا عوض قطعی ہو یا سا لانہ اشتراک تو ہو مگر خریدنے والے کو خریدنے کی عادت نہ ہو اور نہ ہی وہ جانتا ہے کہ اس سے استفادہ کر سکے گا یا کہ نہیں ۔ کارڈ خریدنے وا لا مال دیتاہے اور وہ نہیں جانتا کہ اسکے عوض اسے کیا حاصل ہو گا چنانچہ اس میں دھوکہ یقینی ہے اور اسکے مقابلے میں فائدے کی حصول میں احتمال ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر

[155] الدکتور یوسف القرضاوی وغیرہ ۔موقع الشیخ القرضاوی www.Islamonline.net علی ا لانترنیت۔

(دھوکہ سے خرید وفروخت سے) منع فرمایا ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت کردو حدیث مبارکہ میں ہے۔
ڈاکٹر سامی بن ابراہیم السویلم نے کہا:
مذکورہ کارڈ کو ڈسکاؤنٹ کارڈ کا نام دیا جاتا ہے ۔اسکے حکم کے بارے میں عصر حا ضر کے فقہائے کا اختلاف ہے۔
کسی کی رائے میں یہ ممنوع ہے کیونکہ یہ دھوکے اور جوئے کی قسم ہے ۔کیو نکہ مشترک کارڈ کی قیمت ادا کرتا ہے اور اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کریگا یا نہیں ، چنانچہ وہ نفع اور نقصان میں متذ بذب ہوتا ہے۔
بعض دوسروں کے خیال مین یہ جائز ہے اس وجہ سے کہ اشتراک کی قیمت خریدار کو ڈسکاؤنٹ (کارڈ خریدنے) پر قائل کرنے اور دکان پر کارڈ جاری کرنے والے کے ایجنٹ کا عوض ہے اور یہی کام کی اجرت ہے (دیکھئے الحوافز التجاریۃ ،خلد مصلح 179 ۔192۔ تفصیل اللہ تعالی بہتر جانتا ہے)۔

اور اس لئے کہ شرعا اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آدمی دوسرے سے کہے اگر تم فلاں دکان سے میرے لئے ڈسکاؤنٹ لے آؤ تو تمہارے لئے اتنا ہے۔
امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے جائز ہونے کی وضاحت کی ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میرے لئے تم فلاں سے سو (روپئے) قرض لاؤ تو دس تمہارے ہیں (المغنی دار ھجر 1441/6۔ پس اگر قرض کے حصول پر ا یجنٹ یا وکیل کا عوض جائز ہے تو یہ بدرجہ اولی جائز ہے([156])۔
اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

81- ملکیت پر ختم ہونے والے کرایہ(لیزlease) کا حکم
سوال: ملکیت پر ختم ہونے والے کرایہ(لیزlease) کےحکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ یہ ایک چیز پر دو عقد ہیں اور دونوں میں‌سے ایک جاری نہیں رہتا اور دونوں حکم میں مختلف اور ایک دوسرے کے منافی ہیں۔
ھئیہ کبار العلماء ،مجلتہ الدعوہ العدد 22 محرم 1421

تبصرہ:
کرائے کہ سرمایہ کاری ایسا معاملہ ہے جو کہ مختلف معاملات جیسے وکالہ ،کرایہ خرید وفروخت کا وعدہ اور پھر بیچنے یا شراکت وغیرہ کا مجموعہ ہے ۔ اور یہ سارے معاملات جائز ہیں تو جو ان سے مرکب ہو گا اگر اس میں عقد صحیح ہونے کی تمام شرائط پوری ہیں تو یہ بھی انہی کی مانند جائز ہوگا۔
علمی رد:
ملکیت پر ختم ہونے وا لا کرایہ(لیزlease) اور بیع دوعقدوں یا کرائے دار کی سرمایہ کاری کے نسبت وکالت کے اعتبار سے یہ تین عقد کا مجموعہ ہے اس طرح کہ عقد کے آغاز میں جو

[156] ڈاکٹر سامی بن ابراہیم باخث فی الاقتصادا لاسلامی ۔من کتاب فتاوی واشتسارات الاسلام الیوم الجز نمبر 8 ص 464 ۔تارخ 13/14 ۔1425ھ

سامان جو وہ خریدنا چاہتا ہے اسے خریدلے اور یہ مضاربت کی طرح شرعی عفود میں جائز ہے ،اور جمع کرانا ،وکالت شراکت اور کرایہ وغیرہ ہیں۔([157])

جب ہم نے کرائے کی سرمایہ کاری کو ، جو کہ مختلف معاملات جیسے وکالہ ،کرایہ خرید وفروخت کا وعدہ اور پھر بیچنے یا شراکت وغیرہ کا مجموعہ شمارکیا ہے ۔ اور یہ سارے معاملات جائز ہیں ، تو جو ان سے مرکب ہو گا اگر اس میں عقد صحیح ہونے کی تمام شرائط پوری ہیں تو یہ بھی انہی کی مانند جائز ہوگا۔

اور یہ مندرجہ ذیل امور سے واضح ہوتا ہے۔

(1) آ لات پر بینک کے قبضے کے بعد سرمایہ کار کی طرف سے انہیں گاہک کو کرائے پر دینے کا وعدہ کرنا شرعی طور پر جائز امر ہے۔

(2) سرمایہ دارے کا گاہک کو اس کی ضرورت کے مخصوص اوصاف کے آ لات و اشیاء اور ان جیسی چیزرں کی خریداری کےلئے اپنے حساب سے قیمت کی ادائیگی پر اس غرض سے وکیل بنانا کہ ان اشیاء کے حصول کے بعد وہ اسی کو کرائے پر دے ۔یہ شرعا جائز ہے۔

(3) افضل یہ ہے کہ آ لات اور اشیاء کی حقیقی ملکیت اور ان پر قبضے کے بعد کرائے کا معاھدہ مکمل ہو اور یہ کہ وکا لت اور وعدے سے الگ مستقل معاہدہ ہو، لیکن عموما ایسا نہیں ہوتا کیونکہ سرمایہ کار کرائے دار کے ساتھ سامان خریدنے سے پہلے ہی معاہدہ طے کر لیتا ہے۔

اور اس طرح وہ چیز کی ملکیت کے بغیر کرائے پر دیتا ہے (وہ چیز کرائے پر دیتا ہےجسکا وہ مالک نہیں) اور یہ ممنوع نہیں ہے کیونکہ حکیم بن حزام کے بارے میں حدیث میں ممانعت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ﴿إِذَا ابْتَعْتَ بَيْعًا فَلاَ تَبِعْهُ حَتّى تَسْتَوْفِيَهُ﴾ ([158])، ترجمہ: اگر تم کسی چیز کو بیچو تو اسکے مکمل وصول کرنے تک اسے نہ بیچو۔

یہ حدیث مبارکہ قبضے سے پہلے بیچنے کے بارے میں ہے اور کرائے پر دینے کا مفہوم نہیں کیونکہ کرائے دار پر کرائےدار پر لی جانے والی چیز کے وصول کرنے اور اس سے فائدہ اٹھائے بغیر کرایہ دینا لازم نہیں ہوتا، کرایہ منفعت کی ملکیت ہے نہ کہ عین کی ملکیت تو اس سے وہ دھوکا جسکی وجہ سے قبضے سے پہلے خریدنے یا بیچنے کی ممانعت ہے ختم ہوگئی۔([159])

(4) کرائے کی مدت ختم ہونے پر ان آ لات کو بیچنے کا وعدہ یا ان کو ھبہ کرنا ،یا ان میں شراکت وغیرہ، ایک الگ معاھدے کی صورت میں جائز ہے ۔

(5) شرعی طور پر اصل یہ ہے کہ کرائے کے آ لات و اشیاءکی ضمانت مالک پر ہے نہ کہ کرائے دار پر اور اگر اس نے اس کے خلاف شرط رکھی تو اس شرط کا اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ کرایہ دار تو فقط امین ہوتا ہے۔ اس لئے آ لات اور اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے انکے عیب دار اور ضائع ہونے کی ذمہ داری سرمایہ کار پر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ کرائے دار کی کوتاہی اور زیادتی کی وجہ سے نہ ہوئی ہو (اگر ایسا ہو) تو پھر کرائے دار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور کرائے کی

---

[157] تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق از زیلعی بحاشیہ الشلبی 53/5۔

[158] سنن الدارقطني 2859.

[159] ابن حزم نے المحلی میں کہا :جس نے ایسی چیز بیچی جسکا بیچنا حلال ہے سوائے گندم کے ،تو اسکے لئے جائز نہیں کہ وہ اس پر قبضے سے پہلے اسے بیچے۔

سرمایہ کاری میں بھی عموما ایسا نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ کار کرائے دار پر اسکی ضمانت کی شرط عائد کرتا ہے۔
اور مذہب حنبلی میں امام احمد کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ان سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا مؤمنین اپنی شروط پر (ہوتے) ہیں۔ اور یہ قول د لالت کرتا ہے کہ اگر معاھدے کے وقت یہ شرط رکھی تو ضمانت نہیں رکھی ہے ۔اللہ اعلم
(6) کرائے پر لئے آ لات کی حفاظت انکا اچھا استعمال ،انکی دیکھ بھال ،کام کرنے کی شرائط کا خیال اور مالک کی اجازت کے بغیر ان کی ھیئت تبدیل نہ کرنا۔اور اسی طرح دوسری چیزیں یہ سب کچھ فقہ اسلامی میں کرائے کے احکام کے مطابق ہے۔اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

82 - تحفہ دینے والے کا (دینے کے بعد) لینے والے سے تحفہ خریدنے کا حکم
سوال: تحفہ دینے والے کا لینے والے سے تحفہ خریدنےکے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ حدیث میں اسکی ممانعت کہ: "الْعَائِدَ فِي صَدَقَتِهِ كَالْعَائِدِ فِي قَيْئِهِ"، ترجمہ: "صدقہ کرنے کے بعد اسے لوٹا نے وا لا ایسے ہے جیسے قے چاٹنے وا لا ہے"۔
فتاوی اللجنہ الدائمہ 172/16

تبصرہ:
اگر باپ اپنی ملکیت یا اسکا کچھ حصہ کسی عوض کے بغیر تحفہ کے طور پر اپنے بیٹے کو دے تو جمہور علماء کے نزدیک اسے واپس لینے کا حق ہے ، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک اسے واپس لینے کا حق نہیں، جمہور کی رائے قوی ہے۔
علمی رد:
جمہور فقہاء کے نزدیک تحفہ (ھبہ) دے کر واپس لینا حرام ہے سوائے اسکے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کے لئے ہو تو باپ کو واپس لینے کا حق ہے.
اصحاب سنن ،ترمذی،ابوداؤد،نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس اور ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی کریم - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: (کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو عطیہ دے یا تحفہ دے اور پھر واپس لے ،سوائے والد کے کہ جو وہ اپنے بیٹے کو دیتا ہے)۔
اور والدہ کا بھی وہی حکم ہے جو والد کا ہے اور بیٹے کے چھوٹا یا بڑا ہونے میں کوئی فرق نہیں یہ ھبہ(تحفہ) کو واپس لینے کے حرام ہونے کے بارے میں جمہور فقہاء کی رائے ہے لیکن امام مالک نے کہا: اگر ھبہ (تحفہ) اسی حالت میں ہو تو اسے واپس لینا جائز ہے اور اگر اس کی حالت تبدیل ہو گئی ہو تو پھر رجوع(جائز)نہیں،اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک اسکو اپنے بیٹے اور قریبی رشتہ داروں کو تحفہ دینے کے بعد واپس لینے کا حق نہیں، اور غیروں کو دیئے گئے تحفے واپس لینے کا اسے حق ہے ، لیکن یہ رائے احادیث کی مخالفت کی وجہ سے قوی نہیں اور ھبہ کو واپس لینے کی ممانعت کے بارے میں حضور- صلی اللہ علیہ وسلم-کی حدیث مبارکہ ہے: " مَثَلُ الَّذِي يَعُودُ فِي عَطِيَّتِهِ كَمَثَلِ الْكَلْبِ يَأْكُلُ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فِي قَيْئِهِ فَأَكَلَهُ "، ترجمہ: "جو شخص تحفہ دیتا ہے پھر واپس لیتا ہے اسکی مثال اس کتے کے مانند ہے جس نے پیٹ بھر کر کھایا اور قے کردی پھر اس نے اپنی قے کو چاٹ لیا"۔ (اسے ترمذی نے روایت کیااور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے"۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک (تحفہ دینے کے بعد)اسے خریدنا جائز ہے ،کیونکہ یہ تحفہ واپس لینا نہیں بلکہ اسکا خریدنا ہے اور وہ نہی میں شامل نہیں۔([160])

ڈاکٹر انس ابو شادی

83 - سودی بینکوں میں صدقات و خیرات جمع کرنا حرام ہے
سوال: سودی بینکوں میں صدقات و خیرات جمع کرانے کے بارے میں در یافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ سودی بینکوں میں کام کے حرام اور انکے ساتھ معاملات کی حرمت کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔
فتاوی اللجنہ الدائمہ 259/16

تبصرہ:
صدقہ وخیرات جمع کرنے کے بعد فوائد کے بغیر کسی بینک بھی بینک میں رکھنا شرعا جائز ہے.
علمی رد:
شریعت میں سود کھا نا(منع ہے) یہ مما نعت نہ ہونے کی وجہ سے صدقہ وخیرات جمع کرنے کے بعد فوائد کے بغیر کسی بینک بھی بینک میں رکھنا شرعا جائز ہے.،مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس میں غیر شرعی تصرف نہ ہو([161]).
ڈاکٹر انس ابو شادی

84- علمی ،اخباری، میگزینز اور تجارتی مراکز کے مقابلوں میں شرکت کرنا
سوال: علمی، اخباروں، میگزینوں اور تجارتی مراکزکے مقابلوں میں شرکت کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز ہے بشرطیکہ یہ مقابلہ فقہ،توحید اور تفسیر جیسے دینی امور میں ہو اور یہ کہ اس میں میگزینز کیلئے پروپیگنڈہ اور وقت کا ضیاع نہ ہو۔
شیخ ابن جبرین اللولو المکین 213-214

تبصرہ:
وہ مقابلہ جائز ہوتا ہے جسکا مقصد تفریح کرنا، مشق کرنا ،عام ثقافت سیکھنا ، یا ایسی منفعت ہو جسکے حرام ہونے کی نص وارد نہ ہو اور وہ دینی اور دنیا وی فرائض و ذمہ داریوںسے غافل نہ کرے،اور نہ ہی اسمیں مخلوق کے لئے اذیت یا حرام کی آمیزش یا فساد کا باعث ہو۔
علمی رد:

[160] دارا لافتاء المصریہ موضوع 54 ،مفتی فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997-
[161] فتاوی دارا لافتاء المصریہ اہموضع 36 مفتی شیخ عبد المجید سلیم مئی 1358/9، 1939ء-

شرعی د لائل کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مقابلہ جائز ہوتا ہے جسکا مقصد تفریح کرنا، مشق کرنا ،عام ثقافت سیکھنا ، یا ایسی منفعت ہو جسکے حرام ہونے کی نص وارد نہ ہو اور وہ دینی اور دنیا وی فرائض و ذمہ داریوںسے غافل نہ کرے،اور نہ ہی اسمیں مخلوق کے لئے اذیت یا حرام کی آمیزش یا فساد کا باعث ہو۔
اسکی مشروعیت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب مقابلہ میں شریک ہونے وا لا جسمانی قوت،حصول علم اور خداداد صلاحیتوں کی نشو نماں جیسے فوائد حاصل کرے۔
اور اس بنیاد پر دوڑمیں،گھڑ سواری اور اونٹوں کا مقابلہ،یا جانوروں اور پرندوں کے درمیان گولی اور تیر پھینکنا،تمام اسلحہ جات،کشتیوں سے چھلانگ لگانے،وزن اٹھانے کشتی کرنے اور پتھر(گولہ)پھینکنے کے مقابلے شرعی قواعد وضوابط کے ساتھ جبکہ علمی اور معلوماتی مقابلے صرف دینی نہیں بلکہ علم کے تمام میدانوں میں جائز ہیں۔

اور خطرناک اور تشد د آ میز کھیل جن میں مد مقابل کو اذیت دی جاتی ہے جیسے باکسنگ کی بعض قسمیں یا ریسلنگ یا کونگفو کے مقابلے جائز نہیں،اور نہ ہی حماقت،سخت دلی بے رحمی اور جانوروں کو اذیت پہنچانا ۔ جیسے جانوروں کے درمیان لڑائی کرانا صحیح نہیں ہے۔
چنانچہ کتوں،مرغوں،مینڈھوں،اور بیلوں کی لڑائ کرانا بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ اسمیں اُنکے لئے ملامت ہے۔ اسے ابوداود نے روایت کیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ: "نهى ـ الرسول ـ عن التحريش بين البهائم" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے درمیان لڑائی کرانے سے منع فرمایا ہے۔
اسی طرح جانوروں کو نشانے بازی کے لئے استعمال کرنا بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے گزرےانہوں نے پرندے کو لٹکایا ہوا تھا اور وہ نشانہ چوکنے پر اسکے مالک کیلئے مخصوص معاوضہ طےکرنیکے بعد اس پر نشانہ بازی کر رہے تھے۔جب انہوں نےابن عمر کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔تو حضرت ابن عمر نے کہا کس نے ایسا کیا؟جس نے ایسا کیا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔
بے شک رسول کویم - صلی اللہ علیہ وسلم-نے ذی روح کو نشانہ بنانے والوں پر لعنت بھیجی ہے([162]) (اسےامام بخاری نے روایت کیا)۔
ڈاکٹر انس ابو شادی

[162] سلطان العلماء ڈاکٹر عبدالرحیم۔استاذ فقہ و اصولہ بجامعۃ لامارات العربیہ ڈاکٹر محمود احمد ابولیل، استاذ الفقہ المقارن بکلیۃ الشریعہ بجامعۃ العمارات المتحدہ مقالہ فی مجمع الفقہ ا لاسلا می۔

باب یازدهم مرد وعورت کے درمیان تعلقات ، شادی اور خاندان

85۔ مخلوط تعلیم کا حکم

سوال: مخلوط تعلیم کا حکم دریافت کیا گیا ہے۔

خلاصہ فتویٰ: مخلوط تعلیم جائز نہیں‌اور نہ ہی مخلوط اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنا جائز ہے۔

اللجنۃ الدائمہ فتاویٰ اسلامیہ۳/۱۰۳

تبصرہ:

اختلاط (مرد اور عورت کا ساتھ ہونا) میں تجاوزات ہونے کی وجہ سے تعلیم اور کام کر ترک کرنا درحقیقت دو نقصانات میں سے بڑے نقصان کا ارتکاب کرنا ہے۔ جبکہ شرعاً واجب یہ ہے کہ دو نقصانات میں سے کم نقصان کو قبول کیا جائے۔ اگر تجاوزات اور خلاف ورزیاں وقوع پذیر ہوں تو حکمت اور اچھی نصیحت سے انہیں سمجھایا جائے اور راہ راست پر لایا جائے ۔

علمی رد:

آغازِ اسلام کے وقت ہی سے بازاروں ، مساجد اور دوسری جگہوں پر مرد اور عورتوں کا اختلاط پایا جاتا رہا۔ لیکن یہ پابندی کے اندر اور شرعی آداب کے دائرے میں تھا۔ کسی بھی دانشگاہ اورکام کے ادارے میں مرد اور عورتیں اُسی طرح موجود ہوتی ہیں جس طرح کہ راستوں میں ، بازاروں میں ، اور عمومی اجلاسوں میں جاتے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر جنس کو چاہئے کہ وہ شرعی آداب کی پابندی کرے۔ جن میں سب سے اہم اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِہِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَہُمْ﴾ (النورر ۳۰)، ترجمہ: اے محبوب - صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

دوسری آیت کریمہ میں ہے: ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِہِنّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَہُنّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَہُنّ اِلّا مَا ظَہَرَ مِنْہَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِہِنّ عَلٰی جُيُوبِہِنّ﴾(النورر ۳۱)، (اسی طرح) مسلمان عورتوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی بھی حفاظت کریں اور اپنا بناؤں ظاہر نہ کریں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور اوڑھنیاں اپنی گریبانوں پر ڈالیں رہا کریں ۔ سورۃ النور: آیت نمبر ۳۰۔۳۱ سنت نبوی شریف میں مشکوک خلوت ابھارنے والے مس (چھونا) غیر مؤدب گفتگو ، تیز عطر اور انتہائی ازدحام، اسی طرح کے دیگر امور جن باتوں سے روکا گیا ہے ان کی پابندی کی جائے۔ ہر جنس اپنے مطلوبہ آداب کی پابندی کرے اور جو ان آداب کی خلاف ورزی کرے تو اللہ رب العزت کے فرمان ہے: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُہُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبۃ ۷۱) ترجمہ: "اورمسلمان مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مدد گار ہیں۔ حکم کرتے ہیں اچھے

کاموں کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے"۔ لیکن ایسا حکمت اور خوش اسلوبی سے کیا جائے۔ اور وہ اسے مان لے یا کم از کم اس کے بری الذمہ ہونے کی امید کی جائے۔

وعظ و نصیحت کے واجب ہونے کے سلسلے میں اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ہے: ﴿واذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْھُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰہُ مُھْلِکُھُمْ اَوْ مُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا قَالُوْا مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ﴾ (الأعراف ١٦٤)، ترجمہ: اور جب کہا ایک گروہ نے اس بستی والوں میں سے کیوں نصیحت کرتے ہو اُن لوگوں کو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب انہیں دینے والا ہے۔ بولے تمہارے رب کے سامنے عذر کرنے والوں کیلئے اور شاید کہ وہ ڈر بھی جائیں۔

اللہ رب العزت کے اس فرمان کے مطابق آداب اسلامی کی مخالفت پر خاموشی اختیار کرنا جائز نہیں۔ ا للہ رب العزت کا ارشاد ہے: .﴿عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ﴾ (المائدۃ ١٠٥)، تم اپنی حفاظت کرو ،تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا وہ شخص جو گمراہ ہوا جب کہ تم راہ راست پر ہو۔

چنانچہ ہدایت اور راہ راست پر اسی وقت آیا جاسکتا ہے جب کہ امر بالمعروف و النھی عن المنکر کے واجب کی ادائیگی کی جائے۔ جیسا کہ دوسری نصوص میں آیا ہے اور اگر نصیحت کرنے کے بعد بھی اس کا نتیجہ سامنے نہ آئے تو اس برائی کو دل سے برا جاننا اور اُس کا انکار کرنا واجب ہے۔ اور مخالفین سے ایسا سلوک کیا جائے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہم اُن سے خوش نہیں ہیں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے رویہ اور سلوک کو تبدیل کرنے کے بارے میں سوچیں۔ اس قسم کے مخلوط فضاؤں یا معاشروں میں تعلیم یا کام ترک کرنے میں مشقت اور پریشانی ہے۔ تقریباً تمام یا اکثر میدانوں میں خواہ وہ عالمی معاشرے ہو ں یا مقامی ، مرد اور عورت دونوں ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی بھی ایسی جگہوں پر ہو اسے چاہئے کہ وہ آداب اسلامی کی پابندی کرنے کے ساتھ ساتھ حکمت اور اچھی نصیحت کے فرض کی ادائیگی بھی کرتا رہے۔ اور یہی بات شرعاً واجب ہے۔ تمام جگہوں پر مردوں اور عورتوں کو مکمل طورایک دوسرے سے علیحدہ کرنا بالخصوص اس زمانہ میں ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ مرد اور عورت کے اختلاط یا حد سے تجاوز ہونے کی وجہ سے تعلیم یا کام کو ترک کرنا دو شر میں سے بڑے شر کا ارتکاب ہے۔ کیونکہ اس میں کام یا حصو ل علم کا ضیاع ہے جو انسان یا امت پر فرض ہے۔ اور اس کا عکس (الٹ) واجب ہے کہ ہم علم حاصل کریں اور کام کریںخواہ یہ مخلوط طریقے پر ہو اس طرح ہم دو شر میں سے ہلکے یا کم شر کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ حکمت اور موعظہ حسنہ سے نصیحت کرنے کے واجب کی ادائیگی بھی کرتے رہیں۔ جو ہم پر شرعاً واجب ہے۔ اور یہ واجب انسان کو گناہ اور پریشانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ واللہ اعلم ([163])۔

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

86 - مخلوط اور بناؤ سنگھار کی جگہوں میں کام کرنے کا حکم

سوال: مخلوط اور غیر شرعی لباس کی جگہوں میں کام کرنے کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا ہے۔

---

[163] فتاویٰ داردار الافتاء المصریہ : الموضوع (١٠٢) المفتی: فضیلۃ الشیخ عطیۃ صقر مئی ١٩٩٧ء ، فضیلۃ الشیخ عبدالمحسن العبیکان www.alwatanyh.com/forum.

خلاصۂ فتوی: جواب دیا گیا کہ جہاں فتنہ کا اندیشہ ہو وہاں (کام کرنا) جائز نہیں۔
فتاوی اللجنۃ الدائمہ161/15

تبصرہ:
شرعی اداب کی حفاظت کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے مابین مشترکہ طور پر کا م کرنا جائز ہے۔

علمی رد:
مردوں اور عورتوں کے مابین میل جول فی نفسہ حرام نہیں بلکہ جائز اور مطلوب ہے جب اس کا مقصد نیک ہو ، نفع بخش علم حاصل کرنا ہو یا نیک کام ہو یا فلاحی منصوبہ ہو یا جہاد و کوشش واجب ہو وغیرہ ۔ جو مرد و زن سے باہمی کوششوں کا متقاضی ہو نیز منصوبہ بندی ، جہت و تنفیذ کے لیے ان کے مابین مشترکہ تعاون کا تقاضا کرتا ہو ۔ اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ فریقین کے مابین ہر میل جول میں شرعی اصولوں کی قیود سے تجاوز کیا جائے بلکہ اس میں ضروری ہے کہ ہر اشتراک عمل بھلائی ، نیکی و تقوی اور باہمی تعاون اور اسلام کی طے کرہ حدود کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہو۔

مرد وزن کے مابین تعلقات کے لیے اسلام کی وضع کردہ حدود:

1۔ فریقین (مرد اور عورت) سے غض بصر (نظریں نیچی رکھنے) کی پابندی:
قابل پوشیدہ اعضاء جسم (ستر) کو نہ دیکھے اور نہ ہی شہوۃ سے، فرمان باری تعالی ہے :﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ﴾ (النور30)، ترجمہ: "آپ حکم دیجیے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی ۔یہ (طریقہ) بہت پاکیزہ ہے ان کے لیے ۔ بیشک اللہ تعالی خوب اگاہ ہے ان کاموں سے جو وہ کیا کرتے ہیں"۔

2۔ عورت کے لیے ایسے شرعی لباس کی پابندی جو اس کے بدن کو سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ڈھانپے رکھے ۔ نہ ان کو ظاہر کرے اور نہ ہی زبان سے جسمانی اعضاء کی کیفیت بیان کرے ۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: (وَلا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلاّ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنّ عَلَى جُيُوبِهِنّ) (النور31)، ترجمہ: "اور نہ ظاہر کیا کریں اپنی ارائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے اور ڈالے رہیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر"۔
اللہ رب العزت نے اس معاملے کی سنگینی یوں ظاہر کی ہے : (ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلا يُؤْذَيْنَ) (ا لاحزاب 59)، ترجمہ: " اس طرح وہ بآسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائیگا"۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا لباس آزاد و پاک طینت خاتون کو کھلنڈری اور فضول عورت سے ممتاز کرتا ہے ۔ کوئی شخص پاک باز عورت سے چھیڑ خانی کی جرات نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا لباس اور طور طریقہ ہر دیکھنے والے کو احترام پر مجبور کرتا ہے۔

3۔ ایک مسلمان عورت کے لیے ہر چیز میں حسن عمل کی پابندی ہونی چاہیے ، بالخصوص مردوں کے ساتھ معاملات اور بات چیت میں اس کا تعامل ، چلنے اور حرکات میں اشتعال انگیزی اور بھڑکانے کے اسباب سے دور ہو ، لچک یا مٹک مٹک کر نہ چلے ، اس سے کوئی ایسا فعل صادر نہ ہو جس سے دور جاہلیت کی خواتین کے اوصاف کا اظہار ہوتا ہو۔

4۔ ہر اس چیز سے اجتاب برتے جو برانگیختگی اور اشتعال انگیزی کا باعث بنے جیسا کہ خوشبو کا استعمال اور زیب و زینت جو گھروں مین کی جانی چاہیے نہ کہ راستوں میں اور مردوں کے ساتھ میل جول کے دوران ۔

5۔ اس بات سے بچا جائے کہ کوئی مرد بغیر محرم کے کسی عورت کے ساتھ تنہا ہو ، ایسی باتوں سے صحیح احادیث میں منع کیا گیا ہے ۔ حدیث شریف میں آتا ہے : " (نامحرم) مرد اور عورت کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے ۔ " جس طرح آگ اور لکڑی کو اکٹھا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا ، بالخصوص جب خاوند کے کسی قریبی رشتہ دار کے ساتھ خلوت ہو ۔ اس بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے ۔ " خبردار ! عورتوں کے پاس نہ جانا ، دریافت کیاگیا : اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تنہائی میں بیٹھنے کے بارے میں آپ ﷺ کا کیا حکم ہے ؟ فرمایا : علیحدگی میں بیٹھنا تو ہلاکت ہے یعنی وہ ہلاکت کا سبب ہے ، کیونکہ کبھی بیٹھک طویل بھی ہو سکتی ہے اور یہ خطرے سے خالی نہیں"۔

6۔ یہ میل جول ضرورت سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے ۔ مشترکہ کام سے میل ملاقات میں زیادتی عورت کو اس کے نسوانی پن سے دور کردیتی ہے یا پھر اسے طرح طرح کے ہیلے بہانوں میں ڈال کراسے گھر کی نگرانی یا دیکھ بھال اورنسلوں کی تربیت کے مقدس فرض سے معطل کر دیتی ہے ،اگر مرد و زن کے مابین مشترکہ کام ایسی حدود کے اندر ہو جو شرعا مقبول ہیں یا کم از کم ان کے قریب ہیں تو پھر مذکورہ شرعی اداب کی حفاظت کے ساتھ ایسا کام جائز ہے ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ([164])

قانونی مشیر اور سینٹ کے رکن شیخ ڈاکٹر عبدالمحسن عبیکان کی رائے میں کام کرنے کی جگہوں میں مرد و زن اور عورتوں کے مابین میل جول کی حرمت کے بارے میں کوئی شرعی نص نہیں پائی جاتی ۔ عبیکان نے بریدہ میں ساتویں قومی مکالمے کے پہلے اجلاس میں اپنے خطاب کے دوران کہا : صرف کسی فتنہ کے اندیشے کی حالت کے ؛ خدمات کے مواقع پر کسی خاتون کے خدمت انجام دینے کو خلوت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی یہ حرام ہے ۔ انھوں نے مزید کہا : مرد و زن کے مابین اختلاط طواف ، سعی اور بازاروں میں بھی پایا جاتا ہے ، ہر قسم کے گڈ مڈ ہونے کو حرام شمار نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ حرمت صرف اس اختلاط تک محدود رہے گی جو کسی گمراہی کا باعث بن سکتا ہو۔ ([165])

ڈاکٹر انس ابو شادی

[164] ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی ویپ سائٹ
[165] www.alwatanyh.com

87- نابالغ لڑکی کی شادی کا حکم

سوال: نابالغ (دوسال سےدس سال کی عمر کے) بچوں کی شادی کے بارے میں سوال کیا گیا؟

خلاصئہ فتوی: نابالغ بچوں کی شادی کرنا جائز ہے.

فتاوی اللجنۃ الدائمہ 123/18

تبصرہ:

اس زمانے میں شادی کی عمر کا تعین ایک انتظامی عمل ہے اور مصلحت کیلئے قوانین اسکی تعیین کرتے ہیں تاکہ دونوں (بیوی اور شوھر)ازدواجی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جائیں.

بعض حکومتوں نے جو شادی کی عمر کی تعیین کی ہے اس میں بہتری ہے بشرطیکہ عمرکےتعین میں تمام حالات کا خیال رکھا جائے، اور جبتك مصلحت ہو اس وقت تك قوانین اور فیصلوں پر عملدرآمد میں ولی الأمر کی اطاعت واجب ہے.

علمی رد:

اسلام نے شادی کیلئے کوئی خاص عمر متعین نہیں کی بلکہ عمومی طور پر مکلف ہونے کی ایک حد مقرر کی ہے اور وہ ہے بالغ ہونا خواہ یہ فطری علامت سے ہو یا کہ 15 قمری سال ہونے سے ہو ، فطری علامت حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں مگر اسلام نے اس عمر کو نکاح کے صحیح ہونے کی بنیاد(لازمی) قرار نہیں دیا بلکہ اس عمر سے پہلے بھی سرپرستوں کے ذریعے اس (شادی) کی اجازت دی ہے.شادی عمر متعین نہ ھونے کے باوجود بہتر یہ ہے کہ بلوغت کے اوائل سالوں میں ہی جلد شادی کر دی جائے جو کہ لڑکے اور لڑکی (دونوں) کیلئے صحیح وکت ہوتا ہے اور اسی میں دونوں کی عصمت و حفاظت ہے. مگر یہ کہ بہت جلد شادی کر نے سے (دونوں) پر ایسی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑتی ہیں جن میں عقل وفہم کی ضرورت ہوتی ہے.

چنانچہ نکاح کے صحیح ہونے کیلئے قانی عمر شرط نہیں ہے لیکن یہ جو اکثر اسلامی ممالک میں معینہ عمر سے پہلے کی شادی کی تصدیق کی ممانعت کا قانون وضع کیا گیا ہے، یہ شادی کی اھمیت کی زجہ سے ہے کیونکہ بلوغت کی عمر سے پہلے شوھر اور بیوی اس قابل نہیں ہوتے.

علاوہ ازیں لڑکی ، لڑ کے کی نسبت سمجھدار اور بالغ ہوجاتی ہے تو مناسب یہ ھے کہ شادی کیلئے لڑکے کی عمر 18 سال اور لڑکی کی عمر16 سال ہو.

جمہور علماء کے نزدیک جب لڑکا اور لڑکی جنسی میل جول کے قابل ہو جائیں تو ان کی شادی کرنا جائز ہے. اور انہوں نے نابالغ بچوں کے سرپرستوں کو انکی شادی کرانے کی بھی اجازت دی ہے ، اور اس حالت میں(نابالغ)کی شادی اسکے سرپرست کی معرفت سے کرنا واجب ہے. جمہور علماء اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے ارشاد باری ہے: ﴿وَاللاَّئِي يَئِسْنَ مِنْ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنْ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللاَّئِي لَمْ يَحِضْنَ ﴾ (الطلاق4)، اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے محروم ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو(کہ ان کی عدت کیا ہو گی) تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور وہ عورتیں جنہیں (ابھی) حیض نہیں آیا (کہ ان کی عدت بھی یہی ہے).

اسطرح آیت کریمہ نے اس عورت کی عدت جسکو حیض نہیں آیا تین مہینے مقرر کی ہے.اورعدت طلاق اور فسخ نکاح کے بغیر نہیں ہوسکتی اور اسکا تقاضا ہے کہ شادی ہو چکی ہے.
اس سے واضح ہوتاھے کہ اگر شوہر 18 سال اور بیوی 16 سال کی عمر کو نہ بھی پہنچی ہو مگر نکاح شرائط کے مطابق ہوتو صحیح ہے،یہ اس لئے کہ شادی کی کوئی معین عمر نہیں اس زمانے میں شادی کی عمر کا تعین ایک انتظامی عمل ہے اور قوانین، مصلحت کیلئے اسکی تعیین کرتے ہیں تاکہ دونوں (بیوی اور شوھر)ازدواجی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جائیں.
بعض حکومتوں نے جو شادی کی عمر کی تعیین کی ہے اس میں بہتری ہے بشرطیکہ عمرکےتعین میں تمام حا لات کا خیال رکھا جائے، اور جبتک مصلحت ہو اس وقت تک قوانین اور فیصلوں پر عملدرآمد میں ولی ا لأمر کی اطاعت واجب ہے. چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے:
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء 59).
اے ایمان والو: اللہ کی اطاعت کرو اور رسول- صلى الله عليه وسلم- کی اطاعت کو اور اپنے میں سے (اہل حق) صاحبان امر کی،[166]

ڈاکٹر انس ابو شادی

[166] فتاوى دار افتاء المصريہ. موضوع(1161) مفتى فضيلت شيخ جاد الحق على جاد الحق 18 ذوالحجہ 1400ھـ 27 اكتوبر 1980ء. موضوع(40) مفتى فضيلت شيخ عطيہ صقر مئى 1997ء.

88 - چھلا پہننے کا حکم

سوال: منسوب(منگیتر) یا شادی شدہ شخص کیلئے سونے کے علاوہ کوئی چھلا پہننے کے حکم کے بارے میںدریافت کیا گیا۔

خلاصئہ فتوی: جواب دیا گیا کہ چھلا پہننا من گھڑت امور میں سے ہے (بدعت ہے) اورشائد یہ حرام امور میں سے ہے۔

شیخ ابن عثیمین مجموع فتاوی 100/18

شیخ یاسر برهامي www.alsalafway.com

تبصرہ:

چھلا پہننے کا مقصد اگر کفار سے مشابہت نہ ہو تو حرام نہں۔اور اگر چھلا چاندی کا ہو تو مردوں أور عورتوں [دونوں] کے لے جا ئز ہے اور اگر سونے کا ہو تو اسکا پہننا مردوں کے لئے حرام اور عورتوں کے لئے جائز ہے۔

علمی رد:

منگنی یا شادی کی انگوٹھی (پہننے) کی تاریخ ہزارھا سال تک لوٹتی ہے چنانچہ یہ کہا گیا کہ سب سے پہلے اسے فرعون نے شروع کیا ۔ پھریہ انمریق کے ہاں ظاہر ہوئی پھر رسم ورواج کے طور پر پوری دنیا میں انگوٹھی عادت بن گئ ۔ اور اس انگوٹھی کو بائیں ہا تھ کی تیسری انگلی میں پہننے کی عادت اغریق کے اس عقیدے سے ماخوذ ہے کہ دل کی رگ اس انگلی سے گزرتی ہے اور لوگوں میں انگریز سب سے زیادہ اسکا اہتمام کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ منگنی کی انگوٹھی عیسائیوں کی رسم ہے ۔ اور مسلمانوں اسکے اسباب سے صرف نظر کرتے ہوئے اس عادت کو اختیارکرلیا اور خواتین و حضرات اسے پہننے کا اہتمام کرتے اور اسے نہ پہننےاوراتارنے کو بد شگونی سمجھتے ہیں۔

جبکہ أسلام ان تمام چیزوں کوتسلیم نہیں کرتا، الغرض اھم بات ی ہیکہ ہم اسکے پہننے کا حکم معلوم کریں۔

جہاںتک اسکے پہننے کا تعلق ہے تو فی نفسہ یہ حرام نہیں کیونکہ اسکے حرام ہونے کے بارے میں نص وارد ہیں ہوئی اور اسکا مقصد کفارکی مشابہت بھی نہیں۔ چنانچہ مشابہت بطور خاص اگر دینی مفھوم میں ہو تو ممنوع ہے اور اسلام اسے پسند نہیں کرتا ہے ۔ اگر چھلا چاندی کا ہو تو مردوں اور عورتوں (دونوں) کے لے جا ئز ہے اور اگر سونے کا ہو تو اسکا پہننا مردوں کے لئے حرام اور عورتوں کے لئے جائز ہے۔

اس بارے میں کئی احادیث مبارکہ آئی ہیں، ان میں سےایک یہ حدیث شریف ہے جسے امام ترمذی اسناد حسن سے روایت کیاہے کہ حضور- صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيرِ وَالذَّهَبِ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي وَأُحِلَّ لِإِنَاثِهِمْ"، ترجمہ: "میری امت کے مردوں پر ریشم اورسونا حرام ہے اورعورتوں کیلئےحلال ہے"۔

مسلم شریف کی حدیث مبارکہ ہے : "نهاناعن خواتم۔أوعن تختم- بالذهب "ہمیں سونے کی انگوٹھیوں سے منع کیا گیا۔اور مسل ہی کی ایک اور حدیث شریف ہے "يعمدأحدكم إلي جمرة نار فيجعلها في يده"؟، "تم میں سےکوئی دہکتی ہوئی آگ کاقصد کرتا اوراسے اپنے ہاتھ میںرکھتا ہے"۔

اور یہ آپ- صلی اللہ علیہ وسلم- نے اس وقت فرمایا: جب آپ- صلی اللہ علیہ وسلم- نےکسیکے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی ، تواس نےاسے اتار کر پھینک دیا۔ (167)

ڈاکٹر انس ابو شادی

89- شادیوں پر سیٹیاں اور تالیاں بجانے کا حکم

سوال: شادیو ں میں عورتو ں کی اپنے منہ سے مخصوص آواز (سیٹیاں)اور تالیاں بجانے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: عورتوں کا مخصوص آوازیں نکالنا جائز نہیں کیونکہ عورت کی آواز ستر یعنی پردے میں شامل ہے۔ اور ضروتاّ یعنی مردوں کو متنبہ کرنے کیلئے عورتوں کا تالیاں بجانا جائز ہے۔

فتوی شیخ ابن جبرین اور اس پر انکے دستخط ہیں

تبصرہ:

عورت کی آواز ستر نہیں ۔ اور عورتوں کی مخصوص آوازیں (سیٹیاں) عام آواز میں اگرفتنہ انگیز نہ ہوں تو ان میں بھی کوئی حرج نہیں بطورخاص جب عورتوں کے درمیان ہوں۔ اور تالیاں بجانا بھی عبادت نہیں اور نہ انکا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب ہے ،اور اس سے ممانعت بھی نہیں ہے۔

علمی رد:

شادیوں میں عورتوں کی جانب سے مخصوص آوازیں نکالنے(سیٹیاں بجانے) پر عورت کی آواز اوراسکے گانے کا حکم لگایا جائے گا۔ اور عورت کی آواز ستر نہیں اور اگر انکی مخصوص آوازیں (سیٹیاں) آونچی اور فتنہ انگیز نہ ہوں اور بطور خاص عورتوں کے درمیان ہوں اور اجنبی مردوں تک نہ پہنچتی ہوں تو جائز ہیں۔

جبکہ ان مخصوص آوازوں میں اگر فتنہ انگیزی اور شہوانی ہیجان (کاخطرہ) ہو تو پھر اس میں فتنے کی وجہ سے شریعت اسکی اجازت نہیں دیتی ہے۔

اور جہاں تک تالیاں بجانے کا تعلق ہے تو اللہ تعا لی کفار کے بارے میں فرماتا ہے کہ: ﴿وَمَا كَانَ صَلاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلاّ مُكَاءً وَتَصْدِيَةً﴾ (ا لانفال 35)، ترجمہ: "اور بیت اللہ (خانہ کعبہ)کے پاس انکی(نام نہاد) نماز سیٹیاں اور تالیاںبجانے سوا کچھ نہیں".

(اس آیت کریمہ میں)"ألمكاء" کا معنی سیٹی بجانا اور "التصدیہ" کا معنی تالی بجانا ہے قریش مکہ ننگی حالت میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے، تالیاں اور سیٹیاں بجاتے تھےاور انکے زعم باطل کے مطابق یہی عبادت تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ سیٹیاں اور تالیاں بجانے کو اللہ تعالی کے قرب کا ذریعہ اور عبادت سمجھتے ہیں وہ خطاکار ہیں ، جیسا کہ بعض جاہل (نام نہاد) صوفی جو رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہیں۔

لیکن اس فتوی میں جن تالیوں کا ذکرہے وہ نہ عبادت ہیں اور نہ ہی انکا مقصد قرب الہی کا حصول ہے، بلکہ یہ ایکتقلیدی رسم ہے جسے بعض لوگوںنے اپنی خوشی کےاظہار کیلئے اختیار کر رکھا ہے، اور اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

---

167 فتاوی دار ا لافتاء مصریہ، موضوع (72)فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997۔

ہے۔ لیکن افضل یہ ہے کہ مساجد میں منعقدکیجانے والی محا فل میں ایسانہ ہو تاکہ مشرکین کی اس صورت سے مشابھت نہ ہو جو قرب کیلئے مسجد میں ہوتی تھی ۔([168])

ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیرنگرانی فتوی مرکز کا فتوی ہے کہ:
عورت کی آواز کے ستر ہونے میں اختلاف کی بنا پر اھل علم کے درمیان عورتوں کی مخصوص آوازیں نکالنے (سیٹیوں) کےبارے میں‌اختلاف ہے۔
مختار قول یہ ہے کہ عورت کی آوازستر نہیں ہے، اور اس بنیاد پریہ (مخصوص آوازیں نکالنا) جائزہیں‌بشرطیکہ انکی وجہ سے، مردوں‌کے فتنے میں‌مبتلا ہونے، یا انکے سننے سے لذت کے حصول کا خوف نہ ہو([169]) ۔اللہ اعلم۔
ڈاکٹر انس ابو شادی

90- دلہن کی رخصتی کا حکم
سوال: عورتوں کے دف بجاتےہوئےدلھن کو شادی ہال کے دروازےسےسٹیج تک لانے، اللہ تعالی کے ذکر اور درود پاک پر مشتمل ترانے گانے، دولھا دولھن کیلئے دعاء کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ اور اس رخصتی اورسٹیج پر بیٹھنے کا کیا حکم ہے؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ اس طرح رخصتی کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ نئے من گھڑت امورمیں سے ہے اورہر نئی چیز بدعت ہے۔اوریہ کہ عورتوں کیلئے اصل حکم وقاراورشرم وحیاء ہے اوردلھن کا لوگوں کے سامنےآنااورسٹیج پر بیھٹنا اسکے اوچھےپن اورحیاء کی کمی دلیل ہے۔
فتوی شیخ ابن جبرین اور اس پر انکے دستخط ہیں

تبصرہ:
شادی کا اعلان اور اسکی تشھیر کرنا سنت ہےاور دلھن کی رخصتی مسنون تشھیرمیں سے ہے۔
علمی رد:
شادی کا اعلان اوراسکی تشھیر سنت ہےتاکہ لوگوں کو اس شادی کا علم ہو جائے، حضورصلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "أَعْلِنُوا هَذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ"(اسے امام ترمذی نے روایت کیااور حسن کہا ہے)، ترجمہ: "تم اس نکاح کا اعلان کرو ار اس مسجد میں‌منعقد کرو اس پر دف بجاؤ"۔
یہ حدیث مبارکہ میسر وسائل سے تشھیر کرنے کی دعوت دیتی ہے ،اورعورتوں کے دف بجاتےہوئےدلھن کو شادی ہال کے دروازےسےسٹیج تک لانا اور ترانے گانا، یہ سب شادی کی سنتیں ہیں۔

[168] فتاوی دار الافتاء مصریہ، موضوع (87)فضیلت شیخ عطیہ صقر مئی 1997۔

[169] ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیرنگرانی فتوی مرکز؛فتوی نمبر47172 ،23صفر 1425۔

امام بخاری- رحمۃ اللہ علیہ- نے حضرت عائشہ صدیقہ – رضی اللہ عنہا – سے روایت کی ہے آپ – رضی اللہ عنہا – نے ایک دلھن کو انصاری مرد (دولھے) کے پاس پاس بھیجا تو نبئ کریم- صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "ماکان معکم لھو فان ا لانصار یعجبھم اللھو"([170]).
"اے عائشہ تمہارےپاس تفریح کیلئے (دف وغیرہ) نہیں ہے، کیونکہ انصار کھیل اور تفریح پسند کرتے ھیں"۔
یہ جودلہن اسٹیج پربیٹھتی تاکہ عورتیں اسے دیکھیں اور مبارک دیں اس میں شرعا کوئی حرج نہیں، اور ایسے موقعوں پر عورتوں میں عورتوں کے رقص کرنیکے بارے میں ہم پہلے بیان کرچکےہیں کہ یہ جائزہے۔اوراگردولہا اور دلہن اسٹیج پر بیٹھتے اور بلائے گئے تمام خواتین و حضرات ان دونوں کو دیکھتے ہیں، تو ہم اسکے بارے پہلے بیان کرچکے ہیں([171]) کہ یہ تقریبات منعقد کرنے والوں کواگر معلوم ہو کہ ایک جگہ پر عورتوں اور مردوں کے شریک ہونے سے شرعی خلاف ورزی نہیں ہوگی تو شرعی قواعد کی حدود میں(عورتوں اور مردوں کی باہمی شرکت) جائز ہے۔ اگرچہ عموما ان سے تجاوز ہوتا ہے، جیسا کہ آج کل اکثر شہروں میں ہوتا ہے،تو ایسی صورت میں احتیاطا ضروری اوربہتر یہ ہیکہ ان مناسبات اور مواقع پر ایک ہال مردوں اوردوسرا ہال عورتوں کیلئے مخصوص کیا جائے، جہاں عورتیں ان قیوداورپابندیوں سے آزاد ہوں جو کہ عورتوں اور مردوں کے ایک جگہ پر شریک ہونے سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اللہ اعلم۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

91۔ بیمار بیوی کے علاج کا حکم

سوال: شوہر کا اپنی بیمار بیوی کا علاج کرانے کے بارے میں سوال کیا گیا.

خلاصہء فتوی: جواب دیا گیا کہ صحیح بات تو یہی ہے کہ بیمار بیوی کا علاج شوہر پر عائد نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر واجب ہے.

فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ۲۶۰/۱۹

تبصرہ:
بعض مالکی فقہائے کرام کی رائے یہ ہے کہ بیمار بیوی کا علاج شوہر پر واجب ہے اور یہ رائے نہایت معقول ہے ،اسے اختیارکرنا چاہئے اور اس پر فتویٰ دیا جانا چاہئے لہذا بیوی کے علاج کے اخراجات شوہر پر واجب ہیں اور حسن سلوک کا تقاضا بھی یہی ہے.

علمي رد:
اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَعَاشِرُوهُنّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ ([172])، ترجمہ: " اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے برتاؤ کرو"۔

---

[170] البخاری: 5162۔

[171] دیکھئے فتوی نمبر117۔

[172] ۔ سورہ النساء :۱۹۔

اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ"، ترجمہ: "اور عرف کے مطابق ان کا کھانا اور کپڑا دینا تم پر واجب ہے" امام مسلم نے اس کی روایت کی ہے.اور اس میں کوتاہی پر متنبہ فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا: "كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يُضِيعَ مَنْ يَقُوتُ"، ترجمہ: "آدمی کے گناہ کے لئے اتنا کافی ہے کہ اپنے عیال کو ضائع کردے"، ابو داوود نے اس کی روایت کی ہے اور اسی طرح امام مسلم نے بھی روایت کی ہے.

اور علمائے کرام نے مطلوبہ حسن سلوک اور واجبی نان ونفقہ کے اقسام کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے جیسے کھانا کپڑا رہائش نوکر چاکر اور چھوٹے موٹے اخراجات، اسی طرح عموماً عید وشادی وغیرہ جیسے موقعوں پر جو لئے دئے جاتے ہیں.

البتہ فقہائے کرام کی ایک جماعت نے اس کے علاج کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ بیوی کے علاج کے اخراجات شوہر پر واجب نہیں ہیں لیکن بعض مالکی حضرات کا مذہب علاج کے وجوب کے حق میں ہے اور یہ مذہب معقول علت پر مبنی ہے لہذا اس پر فتوی دیا جاسکتاہے، اور اسی بنیاد پر بیوی کے علاج کے اخراجات شوہر پر واجب ہےں اور شوہر اپنے جیب خاص سے خرچ کرے گا اگرچہ بیوی مالدار ہی کیوں نہ ہو اور حسن سلوک کا مطلب بھی یہی ہے ،مزید یہ کہ بیوی کی بیماری سے شوہر کا حق استمتاع بے مزہ بلکہ رک جاتاہے، اور اس کے عوض میں بیوی پر گھر کی ذمہ داریاں نبھانی ہے.

اسی طرح بیوی کے انتقال کے بعد اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات بھی شوہرہی پر واجب ہے، یہی امام ابویوسف کا قول ہے اور احناف کے نزدیک اسی پر فتویٰ ہے یہاں یہ بات یاد رہے کہ یہ اخراجات عرف عام کے مطابق ہونگے نہ فضول خرچی ہوگی نہ کنجوسی ہوگی، اسے شوہر اپنے مال سے ادا کرے گا اگرچہ بیوی مالدار ہو ،اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کے اخراجات زندگی میں واجب ہیں اس کی تجہیز وتکفین بھی واجب ہیں، اور اگر ان کی ادائیگی سے پہلے فوت ہوجائے تو اس کے ترکہ سے ادا کئے جائیں گے جیسے خود اس کی اپنی تجہیز وتکفین سے ترکہ کا معاملہ شروع ہوتا ہے. ـاللہ اعلم.

ڈاکٹر انس ابو شادی

92ـ کیا بے نمازی بیوی سے ہونیوالی اولاد شرعی ہے

سوال: سوال کیا گیا کیا بے نمازی بیوی سے ہونیوالی اولاد شرعی ہے؟

خلاصہء فتوی: جواب دیا گیا کہ بے نمازی بیوی سے ہونے والی اولاد جائز اولاد سمجھی جائے گی کیونکہ نکاح کا شبہہ قائم ہے.

فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ ۲۰/۳۴

تبصرہ:

بیوی شوہر میں سے کسی ایک یا دونوں کے نماز چھوڑنے سے ازدواجی رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اگر وہ نماز کی فرضیت پر ایمان رکھتے ہیں لہذا اولاد کا نسب زوجین سے قائم ودائم ہے.

علمی رد:

بے نمازی شوہر اکثر اہل علم کے نزدیک اسی طرح چارون اماموں میں سے کسی امام کے نزدیک بھی کافر نہیں ہے بشرطیکہ اس کی فرضیت پر ایمان رکھتا ہو اور یہی حکم بے نمازی بیوی کا بھی ہے، ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ تاریخ اسلام میںکوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے کہ کسی قاضی نے ترک نماز کی وجہ سے بیوی کو شوہر سے جدا کیا ہو جبکہ ہر ہر زمانے میںتا رکین نماز کی کثرت رہی ہے.

ابن قدامہ کہتے ہیں: ہمیں پوری تاریخ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے کہ کسی بے نمازی کی تجہیز وتکفین کو روکا گیا ہو یا اس کی نماز جنازہ پر ملامت کی گئی ہو یا مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانے پر پابندی عائد کی گئی ہو یا اس کے وارثین کو اس کی وراثت سے محروم رکھا گیا ہو یا خود اسے دوسروں کی وراثت سے بے بہرہ کیا گیا ہو یا نماز ترک کئے جانے کی بنیاد پر بیوی اورشوہر کے درمیان جدائی کی گئی ہو جبکہ ہر ہر زمانے میں تارکین نماز کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے اگر تارک نماز واقعتاکافر ہوجاتا تو یہ سارے کے سارے احکام مرتب ہوئے ہوتے.([173])

لہذا دونوں کے درمیان ازداجی رشتے کی درستگی میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور اس نکاح کو شبہے کا نکاح قرار دینا درست نہیں بلکہ ان کا نکاح جائز ودرست ہے اور اولاد کا نسب ان سے ثابت ہے.

اس کے باوجودبے نمازی کو مسلسل نصیحت کی جائے گی، اور ناامید ہوئے بغیر اسے نماز کی ترغیب دی جائے گی اور ترک نماز کے برے انجام سے روشناس کرایاجائے گا ، اس سلسلے میں نیک صحبت کا بھی سہارا لیا جائے گا جس سے راہ راست کی طرف ان کی دستگیری ہوسکے کیونکہ ایسے وقتوں میں صحبت کی جادو جیسی تاثیر ہوتی ہے ۔اللہ اعلم.

ڈاکٹر انس ابو شادی

93 ۔ اولاد کا نسب باپ سے کب ثابت ہوتا ہے

سوال: ناجائز اولاد کی وراثت کے متعلق سوال کیا گیا کہ اگرناجائز اولاد کا نسب والد سے ثابت ہوجائے تو کیا وہ اس کا وارث ہوگا؟

خلاصہء فتوی: اولاد کا نسب صرف اس صورت میںہی ثابت ہوتاہے جبکہ جماع کا عمل درست یا فاسدنکاح یا کم از کم شبہہء نکاح کے تحت ہوا ہو اگر زنا کے ذریعہ مباشرت واقع ہوئی ہو تو زانی سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوگا.

فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ ۳۸۷/۲۰

تبصرہ:

[173] ۔المغنی لابن قدامہ ۱۵۸/۲.

جمہور فقہائے کرام کے نزدیک ناجائز اولاد زانی کی طرف منسوب نہیں ہوگی، لیکن اسحاق بن راہویہ اور ابن تیمیۃ وغیرہ کی رائے میں زانی کی طرف بھی نسب کا سلسلہ ہوسکتاہے.

علمی رد:

ناجائز اولاد کی تعریف: ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کی غلط کاری کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہو، اس صورت میں اس کا نسب اس کی ماں سے ثابت ہوگا اور اسی کی طرف وراثت بھی چلے گی ،کیونکہ اس سے اس کا رشتہ ایک جسمانی نوعیت کا ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں ہے البتہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک زانی کی طرف نسبت درست نہیں ہے اگرچہ زانی اس رشتے کا اعتراف بھی کرلے کیونکہ نسب ایک قسم کی نعمت ہے جبکہ زنا ایک جرم ہے اور نعمت کا حصول جرم کے ذریعے نہیں ہوسکتاہے، لیکن اگر کوئی شخص صرف ولدیت کا اقرارکرے اور یہ ظاہر نہ کرے کہ یہ ولدیت زنا کا نتیجہ ہے اور اقرار کے شرائط بھی تکمیل کو پہونچ جائیں تو اس صورت میں عمومی حسن ظن اور ظاہر پر عمل کرتے ہوئے اس کا نسب اس سے ثابت ہوجائے گا،چنانچہ اگر دونوں میں سے کوئی ایک فوت ہوجائے تو دوسرا اس کا وارث ٹھہرے گا.([174])

لیکن اسحاق بن راہویہ اور ابن تیمیہ وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ ناجائز اولاد کانسب زانی کی طرف ہوگا ،بشرطیکہ عورت کسی اور کے ساتھ رشتہء زوجیت میں منسلک نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی غلط کاری ایک واقع حقیقت ہے اور اس کے باوجود جب ماں سے اس کا نسب ثابت ہورہا ہے تو زانی سے بھی اس کا رشتہ ثابت ہوگا تاکہ اس اولاد کا نسب ضائع نہ ہونے پائے اور بدنامی اور رسوائی کا نشانہ نہ بنے خصوصاً جبکہ اس جرم میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ (الانعام ۱٦۴)، ترجمہ: "اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا".

بہرحال اس رائے کی روشنی میں زنا پر بھی باہم وراثت ہوسکتی ہے، کیونکہ وراثت کا مسئلہ ثبوت نسب کا نتیجہ ہے اور مذکورہ بالا علمائے کرام اس صورت میں بھی ثبوت نسب کے قائل ہیں.([175]) ۔اللہ اعلم.

ڈاکٹر انس ابو شادی

94۔ بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کے نام اضافہ

سوال: بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا نام یا لقب لگانے کا حکم دریافت کیا گیا۔

خلاصہء فتوی: اس پرعدم جواز کا فتویٰ دیا گیا کیونکہ اس صورت میںباپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب ہونے کا عمل پایا جاتاہے اور یہ عمل حرام ہے.

فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ ۳۸۷/۲۰

تبصرہ:

اگر نام کی تبدیلی سے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسب کا ثبوت پایا جائے تو البتہ یہ عمل ناجائز ہوگا اور اس پر بڑی سخت وعید وارد ہے لیکن بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کے نام کے اضافے سے والد سے یا خاندان سے رشتہ منقطع نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے صرف رشتہء زوجیت کا اضافہ مقصود ہے نہ کہ رشتہء نسب کی تبدیلی.

---

[174] فتاوی دار الافتاء المصریۃ: مضمون نمبر(۹۲۴) المفتی:فضیلۃ الشیخ عبدالرحمن قراعۃ ٦ذوالحج ۱۳۴۲ھ ۸ جولائی ۱۹۲۴م، مضمون نمبر (۹۹۵) المفتی: فضیلۃ الشیخ حسن مامون۲۴۰ شعبان ۱۳۷٦ھ ۲٦ مارچ ۱۹۵۷م.

[175] ۔الموسوعۃ الفقھیۃ ۴۰/۳.

علمی رد:
دراصل نام کی تبدیلی ایک جائز امر ہے بشرطیکہ بہتر نام کی جستجو میں ہو لیکن اگر نام کی تبدیلی سے نسب کی تبدیلی لازم آئے یا باپ کے نسب کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف نسب جوڑا جائے تو البتہ یہ عمل ناجائز ہے.
چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن من أعظم الفرى أن يدعي الرجل إلى غير أبيه"، "بدترین جھوٹ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف نسب جوڑے"واضح رہے کہ بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا یا اس کے خاندان کے نام کا اضافہ کرنا اور باپ کے نام کوسرے سے چھوڑدینا اسلامی عادتوں میں سے نہیں ہے بلکہ غیر مسلموں کے طور و طریقے کا ایک جز ہے جو باہمی بودوباش اور اختلاط سے مسلمانوں میں بھی منتقل ہوگئے. اللہ تعالیٰ رشاد فرماتاہے: ﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ﴾([176])، ترجمہ: "تم اُن (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے باپ (ہی کے نام) سے پکارا کرو، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ عدل ہے، پھر اگر تمہیں ان کے باپ معلوم نہ ہوں تو (وہ) دین میں تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ ([177])، ترجمہ: "اور (دوسری مثال) عمران کی بیٹی مریم کی (بیان فرمائی ہے) جس نے اپنی عصمت و عفّت کی خوب حفاظت کی".
قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دین و دنیا میں عظیم ترین قدرومنزلت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اپنے نسب کو چھوڑ کر آپ کی طرف منسوب نہ ہوئیں چنانچہ عائشہ بنت ابو بکر، اور حفصہ بنت عمر ، اور زینب بنت جحش ہی کہا جاتا رہااور اسی پر بقیہ ازواج مطہرات کو بھی قیاس کرلیجئے.
لیکن اب اس زمانے میں جو معروف ہے کہ بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کا نام جوڑدیا جاتا ہے تو واضح رہے کہ اس سے باپ کی یا ان کے خاندانی نسبت کا انکار لازم نہیں آتا ہے، اور بیوی کے نام کے ساتھ شوہر کے نام کے اضافے کی یوں بھی تشریح ہوسکتی ہے کہ یہ نسبت ازدواجی ہے نہ کہ نسبی جیساکہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلاً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَةَ نُوحٍ وَامْرَأَةَ لُوطٍ﴾ ([178])،ترجمہ: "اللہ نے اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا ہے نوح (علیہ السلام) کی عورت اور لوط (علیہ السلام) کی عورت (واہلہ اور واعلہ) کی مثال بیان فرمائی ہے".
اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلانی عورت فلاں کی بیوی یا فلاں کی عورت ہے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوگا کہ باپ کو چھوڑکر کسی اور سے نسب جوڑا گیا ہے لہذا اگر لوگوں کے درمیان اُس طرح کا کوئی رواج جڑپکڑجائے تو ممانعت کی کوئی بات نہیں ہے لیکن نسب اور دفتری کاغذات میں باپ کی طرف ہی نسبت کی جانی چاہئے اور فلانی بنت فلان جیسے الفاظ باپ کے نام کے ساتھ اندراج ہونا چاہئے.

لیکن یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ شوہر کے نام کو شامل کرنے کے ا س عمل میں غیر مسلموں سے ایک قسم کی مشابہت لازم آتی ہے لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ صرف مشابہت

---

[176] الاحزاب : ۵.
177 التحریم :۱۲.
178 التحریم:۱۰.

سے کوئی عمل حرام نہیں ہوتا ہے بلکہ حرام تو اس وقت ہوگا جبکہ بالقصد مشابہت کا ارادہ کیا گیا ہو لہذا اگر غیر مسلموں سے مشابہت کا ارادہ کیا گیا ہو تو البتہ یہ عمل حرام ہوگا ورنہ نہیں. ۔اللہ اعلم.

ڈاکٹر انس ابو شادی

95-ہبہ یا تحفہ دینے میں اولاد کے درمیان عدل واجب

سوال: تحفہ دینے میں اولاد کے درمیان عدل کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ یہ (عدل) واجب ہے اور اولاد میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دینا، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی وجہ سے حرام ہے ۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (لا تشہدنی علی جور ان لبنیک علیک من الحق ان تعدل بینہم) تم مجھے ظلم و جور پر گواہ مت بناؤ تم پر تمہاری اولاد کے حقوق میں سے ہے کہ تم انکے درمیان عدل کرو۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ 16 /192 -194

تبصرہ:

جمہور علماء کے نزدیک پورا مال یا کچھ مال دینے میں اولاد میں سے کسی کو فضیلت دینا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے اور اگر اس تخصیص کا کوئی سبب ہو تو مکروہ بھی نہیں ہے ۔

علمی رد:

چاروں مذاہب کے فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام مال یا اس کا کچھ حصہ دینے میں اولاد کو ایک دوسرے پر فضیلت یا ترجیح دینا یا خاص کرنا مکروہ ہے۔

جبکہ اس تخصیص یا ترجیح کے حرام ہونے میں ان کا ا ختلاف ہے ۔

پھر اس میں ان کا اختلاف ہے کہ کیا تخصیص کرنا یا ترجیح دینا حرام ہے؟

تو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی رائے کے مطابق یہ حرام نہیں ہے اور امام مالک کے نزدیک آدمی کا اپنے مال میں کچھ مال اپنی بعض اولاد کو دینا جائز ہے۔

اور امام احمد بن حنبل کی رائے میں اولاد میں کسی کو دوسرے پر فضیلت یا ترجیح دینا یا اسکی تخصیص کرنا جائز نہیں اور جس نے ایسا کیا تو اس نے برا کیا۔

اور عمل فتوی کس لئے جمہور علماء قول مختار ہے/پسندیدہ ہے بشرطیکہ مال کے لئے اولاد میں سے بعض کو خاص کرنے کا کوئی سبب ہو اور حنبلی فقہاء نے بھی یہی کہا ہے جیسا ابن قدامہ کی کتاب المغنی میں ہبہ کے باب میں آیا ہے ۔

اگر اس نے ان (انہی اولاد)سے بعض کو کسی ضرورت اور اجازت یا حاجت یا دائمی مرض یک اندھا ہونے یا اسکی اولاد زیادہ ہونے یاعلم وغینہ میں مصروف ہونے یا ایسے ہی فضائل کی وجہ سے خاص کیا تو جائز ہے اسی طرح اگر اسنے انہی بعض اولاد کو عطیہ دیا اور کسی کو اسکی نا فرمانی یا بدعت یا یہ کہ جو چیز وہ اس سے لیتا ہے یہ اللہ تعالی کی نافرمانی میڑ معاونت ہونے یا اسے والدین کی نافرمانی کی وجہ سے نہ دیا/محروم رکھا تو اس لئے جائز ہے۔اللہ اعلم([179])۔

---

179 فتاوی دارا لافتاء المصریہ ۔موضوع(1063)مفتی فضیلت الشیخ حسن مامون 14 ذوالقعدہ1377 ھ۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

96۔ بیٹوں میں کسی ایک کو اس کے دوسرے بھائیوں پر فوقیت دینے کا حکم
سوال: عطیہ کرنے میں بعض بیٹوں کودوسروں پر فوقیت دینے کے متعلق سوال کیا گیا.

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہ جائز نہیں، سوائے اسکے کہ باقی سب اس سے راضی ہوں،یا پھر جن کو دیا جارہاہے وہ کمانے سے لأچار ہو.

الشیخ ابن باز فتاوی المرأة ص۲۰۵

الشيخ ياسر برهامي www.alsalafway.com

تبصرہ:
عطیہ میں اولاد کے درمیان امتیاز برتنا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی معقول سبب کے پیش نظر ہو تو بلا کراہت جائز ہے.
علمی رد:
امام مسلم ،ابو داود اور امام احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے بشیر نامی صحابی کی اهلیہ نے اپنے شوہر سے کہا میرے بیٹے کو ایک غلام دیجئے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ بنا لیجئے، چنانچہ وہ حضرت رسول اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میںحاضر ہوئے اور عرض کی فلاں کی دختر نے(یعنی میری اہلیہ نے اور ان کا نام بھی ذکر کیا) اپنے بیٹے کو غلام دینے کا مطالبہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا ان کے بھائی بھی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تو کیا ان میں سے ہر ایک کو ان کے برابر دیا؟ انہوں نے عرض کیا جی نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فليس يصلح هذا،لا أشهد إلا على حق"، "تو ایسا تو مناسب نہیں ہے، اور میں تو صرف حق بات پر ہی گواہ بن سکتاہوں.
جب یہ بات واضح ہوگئی تو اب یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہے کہ چاروں مذاہب کے فقہائے کرام کا امتیاز برتنے،یا فوقیت دینے اور لین دین میں کمی بیشی کرنے کے عمل کی کراہیت پر اتفاق ہے لیکن اس بارے میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ کمی بیشی یا امتیاز برتنے کا یہ عمل حرام بھی ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفة اور امام شافعی کی رائے میں یہ عمل حرام نہیں ہے، جبکہ امام مالک فرماتے ہیں اپنی اولاد میں ایک کو دینا اور دوسرے کو نہ دینا درست ہے، اور امام احمد ابن حنبل فرماتے ہیں اپنی اولاد میں ایک کو دینا اور دوسرے کو مطلقاًنہ دینا،یاکمی بیشی کرنایاامتیاز برتنا درست نہیں ہے، اور جس نے ایسا عمل کیا اس نے حقیقت میں ناانصافی کی.
ان میں امام ابو حنیفة اور امام شافعی کا ہی قول راجح ہے بشرطیکہ کمی بیشی یا دینے اور نہ دینے کے لئے معقول وجہ ہو.

واضح رہے کہ حنبلی مذہب کے بعض فقہائے کرام سے بھی ایسا قول وارد ہے. چنانچہ ابن قدامہ کی"المغنی " نامی کتاب میں ھبہ کی بحث کے ضمن میں آیا ہے وہ فرماتے ہیں اگر کسی اولاد کو کسی معقول سبب کے پیش نظر دیتا ہوجیسے شدید ضرورت مند ہے یا لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے یا نابینا ہے یا زیادہ اہل وعیال والا ہے یا تحصیل علم وغیرہ جیسے نیک کاموں میں مشغول ہے تو ایسا عمل جائز ہے،اسی طرح اگر کسی اولادکو دیتا ہے اور کسی کو محروم رکھتا ہے لیکن محروم رکھنے کے پیچھے معقول حکمت ہو جیسے حکم الہٰی سے روگرداں ہو یا بد دین ہو یا اس مال کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں بہاتا ہو توبھی ایسا عمل جائز ہے. اور اللہ سبحانہ وتعالی بہتر جاننے والا ہے([180]).

اور ڈاکٹر عبد اللہ الفقیہ کی زیر نگرانی چلنے والا فتویٰ سینٹر کے فتاویٰ میں آیا ہے:
بعض اہل علم نے اس حدیث (یعنی نعمان بن بشیر کی روایت)سے اولاد کے درمیان انصاف و برابری کے وجوب پر استدلال کیا ہے، اور اگر کوئی عمل اس کے خلاف واقع ہو تو وہ عمل باطل ہےاور یہی قول علامہ اسحاق اور امام ثوری کا بھی ہے اور امام بخاری نے بھی اسی کی صراحت کی ہے اوریہی رائے امام احمد ابن حنبل کی بھی ہے. لیکن دیگر حضرات کا مذہب یہ ہے کہ اولاد کے درمیان برابری کرنا ایک مستحب امر ہے اور اس بارے میں واردِاحادیث کو استحباب پر محمول کیا ہے اسی طرح امام مسلم کی روایت میں وارد ممانعت کو بھی مکروہ تنزیہی پر محمول کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "کیا تمہاری خواہش یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ حسن سلوک میں یکساں رہیں اس نے عرض کیا جی ہاں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تب تو نہیں".

لہذا جمہور کے مذہب کے مطابق جس نے ہوش و حواس اور صحت کی حالت میں اپنی خواہش ومرضی سے اپنی اولاد میں سے کسی کو کچھ دیا یا دینے میں کمی یا بیشی کا معاملہ کیا تو اس کا تصرف نافذ ہے اور باقی وارثین کو اعتراض کا کوئی حق نہیں، اورمحمد بن الحکم اور میمونی کی روایت کے مطابق امام احمد کا بھی یہی موقف ہے اور یہی امام مالک اور امام شافعی اور اصحاب قیاس اور اکثر اہل علم کا مذہب ہے. واللہ أعلم.([181])

ڈاکٹرانس ابو شادی

97 ۔ عورت کے حق میں عورت کا ستر

سوال: عورت کے حق میں عورت کے سترسے متعلق سوال کیا گیا،کیا ناف سے لیکر گھٹنے تک کا حصہ ہے؟

خلا صہ فتوی: عورت کے حق میں عورت کے ناف سے لیکر گھٹنے تک کے ستر ہونے کی نفی کرتے ہوئے بیان کیا کہ عورت کو عورت کے ساتھ کف دست سے لیکر ٹخنے تک چھپاناچاہئے اور اگر ضرورت پڑے تو گھٹنے تک کپڑا اٹھا سکتی ہے اسی طرح ہاتھ کوصرف بازو تک بقدر ضرورت کھول سکتی ہے.

---

180 فتاوی دار الافتاء المصرية: مضمون نمبر(١٠٦٣)،(١٢٨٥)المفتی: فضيلة الشيخ حسن مامون، فضيلةالشيخ جاد الحق علی جاد الحق.

181 فتوی سینٹر زیر نگرانی د/ عبد اللہ الفقیہ،فتوی نمبر ٥٣٤٨ مؤرخہ ٢٦ شعبان ١٤٢٢ھ.

فتوی مصدقہ از الشیخ ابن عثیمین مؤرخہ ۱۴۱۴/۱۱/۲۰ھ

تبصرہ:
مسلمان عورت کے حق میں عورت کی ناف سے لیکر گھٹنے تک کے ستر ہونے پر مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کا اتفاق ہے، اس حد تک ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے، لہذا مذکورہ بالا فتوی میں ذکر کردہ مسئلہ ان کے اجماع واتفاق کے منافی ہے.

علمی رد:
مسلمان عورت کے حق میں عورت کا ستر ایسے ہی ہے جیسا کہ مرد کا ستر مرد کے حق میں یعنی ناف سے لیکر گھٹنے تک، لہذا ایک عورت دوسری عورت کواس کے ناف سے گھٹنے تک کو چھوڑ کرباقی جسم کو دیکھ سکتی ہے،کیونکہ دونوں کا تعلق ایک ہی جنس سے ہے اور شہوت کا پہلو مفقود ہے،لیکن اگر شہوت کا پہلو ہویا فتنے کا اندیشہ ہو تو حرام ہے. اس بارے میں فقہائے کرام کا اتفاق ہے ،دور دور تک اختلاف کا کوئی نا م ونشان نہیں ہے لہذا مذکورہ با لا فتوی ان کے اجماع واتفاق کے بالکل منافی ہے۔

چنانچہ فقہ حنفی کی کتاب "بدائع صنائع" کے ۱۲۴/۵میں ہے:عورت کے لئے عورت کے ناف سے گھٹنے تک کو چھوڑ کر باقی اس کے پورے جسم کو دیکھنا جائز ہے. اور فقہ مالکی کی کتاب "شرح مختصر خلیل " تالیف خرشی کے ۲۴۷/۱ میں ہے:دیکھنے کے مسئلے میںآزاد عورت کا ستر آزاد یا باندی عورت کے ساتھ اگرچہ کافر ہو ناف سے لیکر گھٹنے تک ہے.

اور فقہ شافعی کی کتاب "اسنی المطالب" کے ۱۱/۳ میں مذکور ہے:عورتوں کا آپس میں ایک دوسرے کا ناف سے گھٹنے تک کو چھوڑ کر بقیہ جسم کودیکھنا جائز ہے کیونکہ آپس میں عورتوں کے حق میں یہ ستر میںشامل نہیں ہیں.

اور فقہ حنبلی کی کتاب "شرح منتھی ا لارادات" کے ۶۲۶/۲میںذکر کیا گیا ہے:عورت کا عورت کے لئے ، اگرچہ کافر عورت اور مسلمان عورت کے درمیان ہی کیوں نہ ہو،اور مرد کا مرد کے لئے اگرچہ بے ریش لڑکا ہی کیوں نہ ہو ستر کے سوا جسم کا دیکھنا جائز ہے،اور عورت کا سترناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے .

مذکورہ با لافقہائے کرام کی تصریحات سے دیکھنے کا جواز ثابت وروشن ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ شہوت وفتنہ نہ ہو ورنہ ممنوع ہے. واللہ أعلم.

ڈاکٹر یاسرعبدالعظیم

98۔ اجنبی عورت سے مصافحہ کا حکم

سوال: اجنبی عورت سے ہاتھ ملانے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: خواہ عورت جوان ہو یا عمر رسیدہ ہاتھ پر پردہ ہو یا نہ ہو بہر صورت ناجائز ہونے کا حکم دیا گیا.

الشیخ ابن باز ۔مجلۃ الدعوۃ، شمارہ نمبر**۸۸۵**

تبصرہ:
اجنبی عورت سے مصافحہ کے بارے میں علمائے کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا کچھ حضرات جواز کے قائل ہیں اورکچھ حضرات حرمت کے قائل ہیں ،لیکن اگر مصافحے میں شہوت و فتنہ کا پہلو مفقود ہو تو جواز کے قائلین کی تقلید کی گنجا ئش ہے.
علمی رد:
جمہور علمائے کرام کا مذہب یہ ہے کہ ، مرد کا بے شہوت ،عمر رسیدہ اجنبی عورت سے مصافحہ کرنا جائزہے، لیکن اگر دونوں جوان ہوں تو ناجائز ہے، اور شافعی حضرات بوقت ضرورت اور فتنہ نہ ہونے کی صورت میں پردہ کے اوپر سے مصا فحہ کو جائز قرار دیتے ہیں.اور امام احمد بن حنبل ایک روایت کے مطابق صرف کراہت کے قائل ہیں حرمت کے نہیں. اور عصر حاضر کے بعض علماء بہرصورت جواز کے قائل ہیں،اگر شہوت کا اندیشہ نہ ہو،ان میں سے ہرہر فریق اپنے اپنے شرعی د لائل رکھتے ہیں.مصافحہ کے جواز کے قائلین نے مندرجہ ذیل د لائل دئیے ہیں: پہلی دلیل: یہ بات طے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک فرمانا اس کی حرمت کی دلیل نہیں ہے،کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کوکبھی اس لئے ترک فرماتے تھے کہ وہ حرام ہے اور کبھی اس لئے ترک فرماتے تھے کہ وہ مکروہ ہے اور کبھی اس لئے کہ خلاف اولی ہے اور کبھی اس لئے ترک فرماتے تھے کہ اس کی طرف رغبت نہیں ہوتی تھی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گوہ کوتناول نہ فرمانے کے واقعے میں ہے باوجود اس کے کہ ضب جائز ہے، اور کبھی کسی خاص وجہ سے ترک فرماتے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إني لا أقبل هدية مشرك" میں کسی مشرک کا تحفہ قبول نہیں کرتا ہوں" لیکن کسی اور موقعے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول بھی فرمالیا اور اسی کی روشنی میں "لا اصافح النساء" یعنی میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں" اس حدیث کو سمجھا جاسکتا ہے.
دوسری دلیل : آپ صلی اللہ علیہ وسلم کابیعت میں عورتوں سے مصافحے سے گریز فرمانا متفق علیہ بات نہیں ہے،کیونکہ حضرت ام عطیۃ رضیاللہ عنہاکی روایت سے بیعت میں مصافحے کا ثبوت ملتا ہے بر خلاف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے جس میں انہوں نے اس کا انکار کیا اور مصافحہ نہ ہونے پر قسم کھائیں.([182])
تیسری دلیل:"لأن يطعن في رأس أحدكم بِمخْيَط من حديد خير من أن يمس امرأة لا تحل لہ" تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی سوئی کا چبھایا جانا زیادہ بہتر ہے اس سے کے کسی

---

[182] اس کی مزید تفصیل شیخ قرضاوی اوردار الافتاء المصریۃ کے شرعی تحقیقات سینٹر کے ویب سائٹ پر ملاحظہ فرمائے.

ایسی عورت کو ہاتھ لگائے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے"والی حدیث سے استد لال متن وسند دونوں لحاظ سے قابل تسلیم نہیں ہے.([183])

چوتھی دلیل: حدیث صحیح میں ایسے شواہد وارد ہیں کہ شہوت اور فتنے سے ہٹ کرباہم عورت ومردکا ایک دوسرے کا ہاتھ چھونااپنی جگہ جائز ہے،بلکہ ایسا بھی احتمال قائم ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصافحہ فرمایا، اور اصل تو یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل تشریع کے لئے ہے اور قابل اقتدا ہے. اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب۲۱)، ترجمہ: "فی الحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونۂ (حیات) ہے"۔

چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے ، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیان کرتے ہیں " أهل مدینہ منورہ کی بچیوںمیں سے کوئی بھی بچی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کوپکڑ کر جہاں چاہتی تھیں لے جاتی تھیں" اور امام احمد کی ایک روایت میں ہے۔

"تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کووہ پکڑتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک نہ کھینچتے تھے یہاں تک کہ وہ جہاں چاہتی تھیں لے جاتی تھیں" مزید صحیحین اور سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خالہ (یعنی حضرت انس کی خالہ) ام حرام بنت ملحان حضرت عبادہ بن ثابت کی اہلیہ کے یہاں قیلولہ فرمائے،اور اپنا سر مبارک ان کی آغوش میں رکھ کر استراحت فرمائی اور وہ ان کے سر مبارک میں جوں تلاش کرنے لگیں " الحدیث. اگرچہ بعض حضرات نے یہ دعوی کیا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محارم میں سے تھیں،لیکن حافظ دمیاطی نے اسے رد کردیا ، یا یہ کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، لیکن قاضی عیاض نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے. ان تمام روایتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ صرف چھونا حرام نہیں ہے، اور اگر اختلاط کے اسبا ب پائے گئے جیساکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اورأم حرام اور ام سلیم رضی اللہ عنہما کے درمیان تھا اور طرفین سے فتنے کا اندیشہ نہ رہے تو وقت ضرورت جیسےسفر سے واپسی یا ملاقات وغیرہ کے وقت مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے. اور یہاں اس بات کی وضاحت مناسب ہے کہ اگر مصافحے سے فتنے کا اندیشہ ہو تو بلاشک وشبہ حرام ہے، بہرحال یہ اجازت ضرورت کی حد تک ہی محدود رہے،اور ایک مسلمان کے لئے بہتر یہی ہے کہ مصافحے میں پہل نہ کرے لیکن اگر ہاتھ بڑھادیا جائے تو کرلے. یاد رہے کہ مذکورہ با لا حکم کو ہم نے اس لئے قطعیت دی ہے تاکہ ضرورت مند آدمی اس پر عمل کرسکے ،اور اس عمل کی وجہ دین کے حق میں کوتاہی کے احساس کی زد میں نہ رہے، نیز دیکھنے والے کی طرف سے نشانۂ ملامت نہ بنے کیونکہ مسئلہ اجتہادی نوعیت کا ہے.([184])

---

[183] طبرانی اور بیہقی نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، اس حدیث شریف میں جو "مخیط" کالفظ واقع ہوا ہے اس کامعنی سلائی کا آلہ جیسے سوئی وغیرہ مرادہے، اس حدیث سے استد لال پر ردوقدح مذکورہ با لا مصادر میں ملاحظہ فرمائے۔

[184] الشیخ قرضاوی کی تحقیق کا خلاصہ،اوردار الافتاء المصرية کے شرعی تحقیقات سینٹر کے ویب سائٹ ملاحظہ فرمائے.

99 ۔ خواتین کے پتلون پہننے کا حکم
سوال: خواتین کے پتلون پہننے کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا ہے۔

خلاصۂ فتوی : خواتین کا پتلون (پینٹ) پہننا جائز نہیں اگرچہ کشادہ اور ڈھیلی ڈھالی ہی کیوں نہ ہو ۔
الشیخ ابن عثیمین ۔ کتاب الدعوہ 1476/1

تبصرہ:
مرد یا عورت کا لباس عام طور پر ان امور میں سے ہے جو عرف ، زمان ، مکان اور اس کا استعمال کسی مصلحت کے حصول یا ضرر سے بچنے کے تابع ہوتا ہے ۔یہ اصل میں مباح ہے جب تک شریعت کے اعتبار سے ممنوع نہ ہو ۔

علمی رد:
مرد یا عورت کا لباس عام طور پر ان امور میں سے ہے جو ہر قوم اور خاندان میں وقت اور جگہ کے اعتبار سے متعارف، نیز اس کے استعمال سے کسی مصلحت کا حصول یا ضرر سے بچنا مقصود ہوتا ہے ۔ یہ ان امور میں سے نہیں جو عبادت کے لیے ضروری ہوتے ہیں حتی کہ ان کو پہننے وا لا کسی خاص بھیس کا پابند ہو (جیسا کہ حج اور عمرہ کے لیے احرام) ۔ لباس اصل میں مباح چیزوں میں سے ہے اس کے لیے کوئی ممانعت نہیں اور نص شرعی سے (کوئی خاص فیشن) ممنوع نہیں ہے ۔ اور نہ ہی اخلاقی طور پر شرعاًاس سے دور رہنے کا کوئی قریبی تعلق ہو یا شرعاً حرمت کا تعلق ہو۔ اگر حرمت کے لیے شرعی نص پائی جاتی ہو تو حرام ہو گا ، جیسا مردوں کے لیے ریشم اور سونا پہننے کی حرمت ۔ اور اگر لباس کسی ایسی چیز کے ساتھ ملا ہوا ہو جو شرعاً حرام ہو مثلاً ایسا لباس پہننا جس سے تفاخر اور اتراہٹ کا اظہار ہوتا ہو یا عورت کا ایسا لباس زیب تن کر نا جس سے نسوانیت ظاہر ہوتی ہو یا ایسافیشن جس سے کسی سے مشابہت کا اظہار کیا جائے ۔ مثال کے طور پر کافروں کے کسی خاص روپ کا انداز اختیار کرنا ، تو یہ شرعاً جائز نہیں ۔لباس کی نوعیت کی وجہ سے نہیں بلکہ جب یہ ممنوعہ معانی کا اظہار کرتا ہو ۔ کبھی یہ انداز حرام اور کبھی مکروہ ہوتا ہے ۔یہ ممانعت معانی سے تعلق کی مقدار سے ہوگی ۔ اس اعتبار سے :
1 ۔ مردوں یا عورتوں کا برطانوی یا لایبریا کا لباس پہننا اس سے اپنی قوم میں رائج عادت کے سوا کوئی ارادہ نہ ہو یا مقصد اپنے جسم کو راحت پہنچانا ہو ، جیسے کڑی دھوپ سے بچاؤ یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا نیک مقصد ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ کسی مصلحت کے حصول اور ضرر سے بچنے کی نیت سے ایسا کرنا اچھا ہوگا ۔
2 ۔ جہاں تک کوٹ ، پتلون ، پجامہ ، ویسٹ کوٹ اور ترکی ٹوپی کا تعلق ہے تو یہ قومی لباس بن چکا ہے ۔ خواتین و حضرات کے اس کو پہننے میں کوئی حرج نہیں جب تک یہ مذکورہ بنیاد کے لحاظ سے شرعاً ممنوع نہ ہو ۔ [185] واللہ تعالی اعلم بالصواب ۔

---

[185] زیر موضوع ، فتاوی مصری دارا لافتاء (1057) ، مفتی شیخ علام نصار ، 5 ذیقعدہ 1369 ھ ، 19 اگست 1950 ء۔

باب دوازدھم حلال و حرام

100۔ فوٹو گرافی تصویروں ، مجسموں اور بچوں کے کھلونوں کا حکم

سوال: فوٹو گرافی ، تصویروں ،مجسموں اور بچوں کے کھلونوں کے حکم کے بارے میں بارے دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: ذی روح (جاندار) کی تصویر بنانا حرام ہے۔ خواہ یہ مجسم ہو یا کاغذ یا کسی اور چیز پر ہاتھ یا آلے سے بنائی گئی ہو۔ اور تصویر کی کمائی حرام ہے۔ اور اسے دیواروں پر لٹکانا یا یادگار کے طور پر انہیں رکھنا حرام ہے۔ جس جگہ تصویریں ہو وہاں یا جن کپڑوں پر تصویریں ہو انہیں پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں سوائے ضرورت کے۔ بچوں کی گڑیا حرام ہیں۔ ضرورت کیلئے مثال کے طور پر پاسپورٹ اسی طرح ویزا کے امور کے لئے تصویر کھنچوانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

اللجنۃ ادائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۴۵۵/۱۔ ۴۵۷

تبصرہ:
انسان اور جانوروں کی فوٹو گرافی تصویروں یا ہاتھ سے تصویریں یا تصویر بنانے میں کوئی حرج نہیں بہ شرطیکہ لوگوں کیلئے مفید علمی مقاصد کیلئے کی گئی ہوں۔ تصویریں اور رسوم تعظیم کے مظاہر اور تکریم و عزت کے خیالات یا فواحش اور ممنوعہ امور کے ارتکاب کے خاطر خواہشات کو ابھارنے سے خالی ہوں۔ اور جاندار کا پورا مجسمہ جائز نہیں ۔ بچوں کی تعلیم اور ان کی تفریح کیلئے بچوں کے کھلونوں خواہ یہ مجسموں کی صورت میں ہو استعمال کرنا جائز ہے۔

علمی رد:
ایک بت پرست قوم اور معاشرے میںرسول اللہ ۔صلی اللہ علیہ وسلم۔ پر قرآن کریم نازل ہوا۔ یہ قوم اپنے بت تراش کر خانہ کعبہ کے اطراف رکھتی تھی وہ تصویریں بناتے اور اُن کی عبادت کرتے تھے۔ رسول اللہ ۔صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے اپنی بہت سی احادیث میں تصویروں اور انہیں بنانے کی مذمت کی ہے۔ غالباً یہ اللہ رب العزت کی تخلیق سے مشابہت اور اسے چھوڑ کر اِن تصویروں اور بتوں کی عبادت کرنے کی وجہ سے ۔ امام بخاری اور حدیث شریف کی کتابوں کے دیگر مؤلفین کی روایت کردہ احادیث شریف اسی مفہوم پر د لالت کرتی ہیں ۔ فقہاء کی کتابوں

میں بار بار آیا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کی اس وقت معروف ضوئی تصویر اور ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر اگر لوگوں کیلئے مفید علمی مقاصد کیلئے ہوں تو ان میں کوئی حرج نہیں۔اور یہ تصویریں اور خاکے تعظیم کے مظاہر ، عزت و تکریم کے خیا لات اور عبادت سے خالی ہوں اسی طرح یہ تصویریں ممنوعہ جنسی خواہشات کو ابھارنے ، فحاشی کو پھیلانے ، ممنوعہ باتوں کے (حرام افعال) کے ارتکاب پر آمادہ کرنے والے عوامل سے پاک ہوں۔ جہاں تک سنگ تراشی اور کھدائی کے کام جن سے جاندار کا پورا مجسمہ تیار ہوتا ہے کا تعلق ہے تو یہ حرام ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے (حضرت) مسروق سے روایت کی ہے: انہوں نے کہا: ہم عبداللہ کے ساتھ ایک گھر میں داخل ہوئے جس میں مجسمے تھے انہوں نے ان میں سے ایک مجسمہ کے بارے میں کہا : یہ کس کا مجسمہ ہے ؟ انہوں نے کہا: یہ (حضرت) مریم کا مجسمہ ہے، (حضرت) عبداللہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "إن أشد الناس عذابا يوم القيامة المصورون، وفي رواية الذين يصنعون هذه الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم أحيوا ما خلقتم"، "روز قیامت مصوروں کو شدید ترین عذاب دیا جائے گا"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ: "ان تصویروں کو بنانے والوں کو روز قیامت عذاب دیا جائے گا۔اور ان سے کہا جائے گا ، تم نے جو بنایا ہے اسے زندہ کرو۔ (ان میں جان ڈالو)۔
یہ نص واضح ہے کہ مجسموں کا بنانا گناہ ہے اور اس کی حکمت بت پرستی اور انہیں اللہ رب العزت سے تقرب کا وسیلہ بنانے کا دروازہ بند کرنا ہے۔ امام قرطبی نے اپنی کتاب الجامع لاحکام القرآن میں اللہ رب العزت کے اس فرمان: ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ﴾ (سورۃ سبأ آیت نمبر ۱۳)، (وہ جنات) اُس کیلئے وہ چیزیں بناتے جو کچھ وہ چاہتا ، اونچے اونچے محل اور تصویریں۔

اسکی تفسیر میں لڑکیوں کے مجسم کھلونوں (گڑ یوں) کو بت تراشی کی حرمت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ثابت ہے کہ(اُم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جب دلھن بن کر رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کے پاس آئیں اور ان کا کھلونا اُن کے پاس تھا ، وہ رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- کے سامنے اس کھلونے سے کھیلا کرتی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ان کی سہیلیاں بھی ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ اور جب رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- تشریف لاتے تو وہ حیاء کرتی ہوئی آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- سے چھپ جاتی تھیں۔ ([186])

ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی فتویٰ مرکز کے مطابق تصویریں ۳ قسم کی ہوتی ہیں:
(۱) **جاندار کی مجسم تصویر** : یہ شرعی طور پر ممنوع ہے اور اس میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔
(۲)**ہاتھ سے بنائی ہوئی جاندار کی غیر مجسم تصویر** : یہ تصویر اللہ رب العزت کی تخلیق کے مشابہہ ہونے کے ضمن میں آتی ہے اس وجہ سے اکثر اہل علم نے اس سے منع کیا۔ اور بعض علماءً نے اس کی اجازت دی ہے۔

[186] اسے امام مسلم نے روایت کیاہے۔

(۳) عکسی تصویر: یہ کیمرے اور ویڈیوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اسے جائز قرار دیتے ہیں اور بعض اس سے روکتے ہیں۔ ہم اس کے جائز ہونے کی طرف مائل ہیں ۔ ([187]) واللہ اعلم۔
ڈاکٹر/ یاسر عبدالعظیم

101- ٹیلی ویژن دیکھنے کا حکم
سوال: ٹیلی ویژن کا مشاہدہ کرنے کا حکم دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: عقیدے اور اخلاق پر ٹیلی ویژن کے نقصانات پر ، ان میں گانے، موسیقی اور تصویریں ہونے نیز اسی طرح کے دیگر منکر امور دکھائے جانے کی وجہ سے اسے دیکھنا جائز نہیں ہے۔
الشیخ ابن باز: مجموعہ فتویٰ ۲۲۷/۳

تبصرہ:
اگر ٹیلی ویژن مفاسد سے محفوظ ہو تو مفید پروگرام کا مشاہدہ کرنا اور ا سے رکھنا جائز ہے۔ اور اگر ٹیلی ویژن کے مفاسد سے محفوظ نہ رہا جائے تو اسے اپنے یہاں رکھنا اور اسکا مشاہدہ کرنا جائز نہیں۔
علمی رد:
ٹیلی ویژن پر ایسی متعدد معلومات پیش کی جاتی ہیں کہ ان آ لات کے نہ ہونے کی صورت میں ان معلومات کا حصول بہت سے لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے یہ معلومات اور پروگرام اصلاً جائز ہوتے ہیں۔ اور انسانی عقیدے اور اخلاق پر ان کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اور اگر یہ نقصان دہ نہ ہو تو ان کا سننا اور مشاہدہ کرنا جائز ہے۔ اور اگر ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے و لاے پروگرام اس کے برعکس ہو ںتو یہ ممنوع ہیں اور اس کی ذمہ داری مشاہدہ کرنے والے اور پروگرام پیش کرنے والے دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ اس میں ناچنے والی عورتوں ، اداکاراؤں اور دوسری عورتوں کو دکھایا جاتا ہے۔ جو اپنی زیب و زینت اور سنگھار کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور جسم کے اُن حصوں کو کھلا رکھتی ہیں

---

[187] فتاویٰ دارا لافتاء المصریہ : موضوع (۱۲۷۹) المفتی: فضیلۃ الشیخ جاد الحق علی جاد الحق جمادی الآخر ۱۴۰۰ھ، ۱۱ مئی ۱۹۸۰ء. ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی فتویٰ مرکز : فتویٰ نمبر ۶۸۰ تاریخ فتویٰ ۱۶ صفر ۱۴۲۰ھ ۔ اور شیخ عثیمین کے فتووں میں ہے (۳۱۸/۲)فوٹو گرافی تصویریں جو آج ہم دیکھتے ہیں فوری طور پر آلہ تیار کرتا ہے اور اس تصویر کی تیاری میں انسان کا کوئی عمل نہیں ہوتا ہمارے خیال میں یہ تصویر بنانے کے ضمن میں نہیں آتی اور احادیث شریف میں جن تصاویر کا ذکر ہے وہ وہ تصویریں ہیں جو بندے کے فعل سے ہوں۔ اور وہ اس سے تخلیق خدا سے مشابہہ ہوتا ہو۔ اور یہ بات آپ کے سامنے اس طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو خط لکھے اور فوٹو گرافی کے آلے سے اس کی تصویر لے لی جائے تو اس خط کی تصویر سامنے آتی ہے تو یہ خط جو تصویر ہے اس شخص کا عمل نہیں جس نے آلہ استعمال کیا اور اس آلہ کو حرکت دی۔ کیونکہ یہ شخص جس نے آلے کو حرکت دی ممکن ہے کہ وہ بنیادی طور پر لکھنا ہی نہ جانتا ہو۔ اور لوگ یہی جانتے ہیں کہ یہ پہلی تحریر ہے۔ اور دوسری تحری میں آلہ کو حرکت دینے والے کا کوئی عمل نہیں۔ لیکن یہی آلہ ممنوعہ مقاصد کیلئے تصویر بنائے تو وسائل کے حرام ہونے کی وجہ سے تصویر حرام ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جدید ذرائع سے تصویر بنانے کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کی تصویر کشی میں کوئی منظر ، مشہداور مظہر نہیں ہوتا جیسا کہ ویڈیوں تصویر کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ تو یہ مطلق حرام کے دائرے میں نہیں آتی۔ اس وجہ سے کیمرے سے کاغذ پر تصویر لینے والے کو منع کرنے والے علماء نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور انہوں نے کہا : اس میں کوئی حرج نہیں۔ الشرح الممتع ۱۹۷/۱۔۱۹۹.

جنہیں ڈھاپنے کا اللہ رب العزت نے حکم دیا ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ مشاہدہ کرنے والا عورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ ان کی تصویروں کو دیکھتا ہے ۔ ٹیلی ویژن کے آنے سے پہلے فقہاء کرام نے آئینہ میں عورت کی صورت کو دیکھنے کے حکم کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا تھا آیا آئینہ میں عورت کی شبیہہ دیکھنا عورت کو دیکھنے کے حکم میں آتا ہے یا نہیں؟اس کے بارے میں اُن کی آراء مختلف ہیں۔ راجح رائے یہ کہ اگر یہ شہوت کے ارادے سے ہو تو یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ ممنوعہ امر اور بڑی معصیت اور گناہ میں مبتلا ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس طرح کا ہر مشاہدہ اور فعل دونوں حرام ہیں۔ خواہ یہ براہ راست ہو یا آئینہ کے واسطہ سے ہو۔ اور اگر معیار اور وجہ فتنہ ہو تو لوگوں میں اس امر میں اختلاف ہے کہ کس میں فتنہ ہے اور کس میں فتنہ نہیں۔ ہر شخص اپنے آپ سے زیادہ واقف ہے۔ بے ضرر اور اچھے کھیلوں نیز ڈراموں کے مشاہدہ کے جائز ہونے کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جو امام بخاری اور امام مسلم نے (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا : میں نے نبی اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- کو دیکھا کہ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- مجھے اپنی چادر مبارک میں چھپائے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی جو کھیل رہے تھے اور میں نو عمر تھی۔ تم بھی (اے مسلمانوں) نو عمر لڑکی جو کھیلنے پر مفتون ہو، کی قدر کیا کرو۔ ایک دوسری روایت کا مفہوم ہے :حبشی عید کی خوشی میں نیزے ہلا ہلا کر پہلوانی کے کرتب دکھا رہے تھے۔ (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے یہ کرتب دیکھنا چاہا تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- آگے اور وہ پیچھے کھڑی ہوگئیں۔ اور جب تک وہ خود تھک کر نہ ہٹ گئیں آپ- صلی اللہ علیہ وسلم- برابر اوٹ کئے کھڑے رہے۔

کتاب المطالب العالیہ از ابن حجر ([188])میں ہے کہ (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) در گلہ نامی کھیل دیکھتی تھیں یہ بچوں کے مارنے کے کھیلوں میں سے ایک ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ رقص ہے ۔ اسلام نے بے ضرر لطف اندوزی کی اجازت دی ہے۔ اور اس کی تاکید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے (حضرت)ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے اس وقت جب کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اُن بچیوں کو گانے سے منع کیا جو (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے لئے عید کے دن گارہی تھیں ، یہ فرمایا کہ: "دعهن يا أبا بكر فإنها أيام عيد، لتعلم اليهود أن في ديننا فسحة، وإني أرسلت بالحنيفية السمحة" اے ابو بکر انہیں گانے دو یہ عید کے ایام ہیں تاکہ یہودی جان لیں کہ ہمارے مذہب میں خوشی ہے اور میں رواداری والے دینِ حنیف کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ یہ حدیث امام احمد نے (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت کی ہے۔

یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے (أم المومنین حضرت) عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کو حبشہ کھیل دیکھنے اور گیت سننے کی اجازت اس وجہ سے دے دی تھی کہ وہ ابھی کم سن اور بالغ نہیں تھیں۔ یا ان پر حجاب (پردہ)

---

[188] المطالب العا لیۃ از ابن حجر جلد ۴ صفحہ نمبر ۱۲۸.

فرض اور کھیل ممنوع ہونے سے پہلے تھا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو اس حکم کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف نہیں ہوتا۔ ([189])

ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ کی زیر نگرانی مرکز فتویٰ کی رائے:
ٹیلی ویژن رکھنے اور اس کا مشاہدہ کرنے کا بیان اس سے پہلے ہوچکا ہے۔ سابق جواب نمبر ۱۸۸٦۔ ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اگر ٹیلی ویژن کے مفاسد سے محفوظ رہا جائے تو مفید پروگرام دیکھنا اورٹیلی ویژن رکھنا جائز ہے اور اگر اس کے فساد اور خرابیوں سے بچا نہ جاسکے تو اسے رکھنا اور اسکا مشاہدہ کرنا جائز نہیں۔ ([190])

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

102 - انبیاء اور صحابہ کرام کی شخصیت کی اداکاری
سوال: انبیاء اور صحابہ کرام کی شخصیت کی اداکاری کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا۔

خلاصہ فتویٰ: مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئے واقعات کی اداکاری میں برائی اس کی اچھائی پر غالب رہتی ہے۔ اس کے فساد (نقصانات) فوائد سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو اسے روکنا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوچ و فکر کو بھی ختم کردینا چاہئے۔

اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۱۹۷/۳۔۱۹۸

تبصرہ:
مذہبی قرآنی قصوں اور کہانیوں کو جدید انداز اور زبان میں پیش کرنا اورا نہیں ہماری او لاد کے ذہنوں کے قریب لانا اچھا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسری اقوام کی کہانیاں اور قصہ دیکھیں جن سے ان کے ذہن خراب اور وہ خود انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ انبیاء /رسل اور اولیاء اس سے کہیں با لا اور اکرم اور اشرف ہیں کہ کوئی انسان ان کی اداکاری کرے یا شیطان ان کے روپ میں ظاہر ہو۔
علمی رد:
اللہ رب العزت کے انبیاء اور رسل انسانوں میں اس کے بہترین چنیدہ بندے ہیں، وہ اس اعلیٰ مقام و مرتبہ کے باعث اس سے کہیں زیادہ معزز و مکرم ہیں کہ ان کی نقل اتاری جائے (اداکاری کی جائے)۔ یا کوئی یا شیطان ان کا روپ یا بھیس اختیار کرے۔ اللہ رب العزت نے رسالت سے قبل اور بعد میں ہر ہر صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے انہیں دور رکھا اور ان کی حفاظت فرمائی۔ اور اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے رسول اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- سے روایت کی ہے :آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لاَ يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي"، ترجمہ: "جس نے خواب میں میری زیارت کی اس

189 فتاویٰ دار لافتاء المصریہ : الموضوع (٤٢) المفتی فضیلۃ الشیخ عطیۃ صقر مئی ١٩٩٧ء.

190 د عبداللہ الفقیہہ کی زیر نگرانی فتویٰ مرکز: فتویٰ نمبر ١٥٧٠٢ تاریخ فتویٰ ٩ صفر ١٤٢٣ھ.

نے میری زیارت کی اور شیطان میری ہم شکل نہیں بنتا "([191]) یہ حدیث شریف اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیطان سرور کونین رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا جاگتے ہوئے یا سوتے ہوئے اللہ رب العزت نے اپنے رسولوں کی شخصیت ، ذات اور نفوس کی حفاظت کے بعد ان کی سیرت کی حفاظت بھی فرمائی۔ اگرچہ یہ حدیث شریف ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ رب العزت نے خاتم الرسول حضرت محمد مصطفی - صلی اللہ علیہ وسلم- کی حفاظت فرمائی کہ شیطان آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی صورت نہیں بنا سکتا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہر انسان کےلئے حرام ہے کہ وہ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی شکل بنائے اور آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کا کردار ادا کرے۔ اگرچہ یہ حکم اور فقہ خاتم النبین حضرت محمد مصطفی - صلی اللہ علیہ وسلم- کے حق میں ہے تو آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- سے پہلے مبعوث ہوئے تمام رسولوں کےلئے بھی یہی حکم ہے کیونکہ قرآن کریم اعزاز و تکریم ،عصمت اور حفاظت کےاعتبار سے تمام انبیاء اور رسولوں کو ایک ہی درجہ دیتا ہے۔ اور جب اللہ رب العزت کی جانب سے ان کی عصمت اور ان کا تحفظ ہے کہ شیطان ان کی شکل اختیار نہیں کرسکتا تو یہی تحفظ اور عصمت صرف شیطان ہی سے نہیں بلکہ اس کا دائرہ تمام بنی نوع انسان تک وسیع ہے ۔ اور کسی بھی انسان کےلئے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ وہ رسولوں کی نقل اتارے یاان کی اداکاری کرے۔ کیونکہ انسان کا بھی صفحہ اعمال اور اس کا باطن پاک نہیں(غلطیوں اور گناہوں سے پاک نہیں) اور اللہ رب العزت نے کسی کو غلطیوں ،پست باتوں سے اس طرح محفوظ نہیں رکھا جس طرح کہ اس نے اپنے انبیاء کرام اور مرسلین کی حفاظت فرمائی ہے۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے :﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ (البقرة 285)، ترجمہ: "یقین لایا پیغمبر اُس پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کے پروردگار کی طرف سے اور مومن بھی تمام ایمان لائے اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں پر ، اس کے سب کتابوں پر اور اس کے سب پیغمبروں پر".

اسی پر د لالت کرتا ہے . اور اگر ان کے قصوں میں عقلمندوں کیلئے عبرت ہے جیسا کہ قرآن کریم کی سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۱۱۱: "لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ"، "البتہ عقلمندوں کیلئے پیغمبروں کے قصوں میں بڑی نصیحت ہے۔ (یہ قرآن)ایسا کلام نہیں کہ بنالیا جاوے "۔ تو انہی شخصیتوں کے قصوں اور واقعات سے عبرت حاصل کی جاتی ہے جنہیں اللہ رب العزت نے اپنا پیغام پہنچانے اور امت کو بچانے کیلئے چن لیا ہو۔ اللہ رب العزت کے برگزیدہ نبی کے اعمال کی اداکاری ایسا شخص کرے جو اس سے پہلے کسی جواری ، شرابی، شراب خانوں کے دلداؤں ، قحبہ گر مرد و خواتین کی اداکاری کرچکا ہو تو ایسی شخص کی اداکاری سے کس طرح استفادہ کرسکتے ہیں۔ مذہبی قرآنی حکایات ، اُس کی زبان اور مضامین کو عصر حاضر کے طریقوں سے پیش کرنا اور اپنے بچوں کے ذہنوں کے قریب لانا اچھی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسری اقوام کے قصوں کا مشاہدہ کریں جو انہیں مذہب سے دور اور انتشار کی طرف آمادہ کرتی ہیں۔ قرآنی مذہبی حکایتوں کو جدید انداز میں پیش کرنا بلا شبہ اچھی بات ہے لیکن اس میں اسلامی آداب اور آیات قرآنی کے احترام کی پابندی کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اور واقعات کی عکس بندی ویسے ہی ہو جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اُس نبی کی شخصیت کو ظاہر نہ کیا جائے جس کے ، اُن کی اقوام کے ساتھ پیش آئے واقعات کو ہم پیش کررہے ہیں اور کوئی شخص بھی اُن کی اداکاری نہ کرے بلکہ ہم اُن کے پیغام کو قوم کو دیئے د لائل ، حجت اور اُن کے معجزات کو صرف سنے جیسا کہ قرآن کریم میں

---

[191] البخاری ۱۱۰.

وارد ہوا ہے۔ اللہ رب العزت ہی صحیح راہ کی طرف ہدایت دینے والا اور وہی توفیق دینے والا ہے۔([192])

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

103۔ استاد کیلئے تالیاں بجانے اور کھڑے ہونے کا حکم

سوال: استاد کیلئے تالیاں بجانے اور کھڑے ہونے کا حکم دریافت کیا گیا ہے۔

خلاصہ فتویٰ: تالیاں بجانا شدید مکروہ ہے اسی طرح استاد کیلئے کھڑا ہونا۔
الشیخ ابن باز مجلۃ الدعوۃ نمبر **۱۳۲۵**

تبصرہ:
ان دنوں معروف تالیاں بجانا عبادت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے تقرب الی اللہ مقصود ہے۔ بلکہ یہ پسندیدگی کے اظہار کا عرف اور طریقہ ہے اور اسے شرعاً ممنوع کرنے والی کوئی بات نہیں۔ اگر آنے والا تعظیم اور احترام کا مستحق ہے تو اس کے لئے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ مثال کے طور پرعادل امام ،والدین اور علماء۔

علمی رد:
قریش تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہوئے خانہ کعبہ کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے اور اُن کے خیال کے مطابق یہ عبادت تھی۔ اسلام میں اُن کے اس عمل کو قبول نہیں کیا چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَالْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً﴾، ترجمہ: اور کعبہ کے پاس اُن کی نماز نہیں مگر سیٹیاں اور تالیاں بجانا (الأنفال **۳۵**)، مکاء سیٹی اور تصدیۃ تالیاں بجانا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ سیٹیاں اور تالیاں بجا کر اللہ رب العزت کی قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کی عبادت پر ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور اُن جاہل صوفیوں کی مذمت کی جو رقص کرتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اس کی مذمت کی گئی ہے اور انہیں جیسے دوسرے عقلمند صوفی اس سے پاک ہیں۔ تالیاں اورسیٹیاں بجا کر عبادت کرنے والا اُن مشرکوں سے مشابہت رکھتا ہے جو خانہ کعبہ کے پاس کیا کرتے تھے۔ ختم: لیکن آج کل معروف تالیاں بجانا عبادت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مقصود اللہ رب العزت سے قربت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ عرف عام اور طریقہ و اسلوب ہے جسے لوگ بعض اعمال کی پسندیدگی کے اظہار کیلئے اپناتے ہیں۔ اورا س میں ایسی کوئی بات نہیں کہ اسے شرعاً منع کیا جائے۔ افضل یہ ہے کہ مساجد میں منعقد کی جانے والی تقریبات میں ایسا نہ کیا جائے۔ تاکہ ظاہری طور پر مشرکین کے ساتھ شرکت اور مشابہت سے بچا جائے جو ان سے اللہ رب العزت کی قربت حاصل کرنے کیلئے مسجد میں واقع ہوتا ہے۔ جہاں تک آنے والے کی تعظیم اور احترام کیلئے کھڑے ہونے کا مسئلہ ہے تو اگر آنے والا شخص اس احترام کا مستحق ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔ جیسے عادل امام ، والدین

---

[192] فتاویٰ دارا لافتاء المصریۃ : الموضوع (۱۲۹۲) المفتی : الشیخ جاد الحق علی جاد الحق ۷ شوال ۱۴۰۰ ھ ۔ ۱۷, گست۱۹۸۰ء۔

اور علماء ۔ اسی طرح سفر سے آنے والوں ، سن رسیدہ افراد اور استاد وغیرہ جن کا کہ احترام کیا جانا چاہئے۔ احترام کے طور پر ان کے لئے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ بخاری اور مسلم شریف میں حدیث شریف ہے کہ نبی اکرم - صلی اللہ علیہ وسلم- نے اُس وقت انصار سے فرمایا: جبکہ (حضرت) سعد بن معاذ گدھے پر سوار تشریف لائے اور زخمی تھے ."قوموا لسیدکم" اپنے سردار کیلئے کھڑے ہوجاؤ'۔

یہ کھڑا ہونا محض ان کی اعانت کیلئے نہیں تھا بلکہ بنی ا لاشھل کے مرد کہا کرتے تھے کہ ہم دو صفوں میں اپنے پیروں پر ان کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہم میں سے ہر شخص نے انہیں سلام کیا یہاں تک کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- تک یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اور (حضرت) طلحہ (رضیٰ اللہ تعالیٰ عنہ) (حضرت) کعب بن مالک (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کیلئے کھڑے ہوئے جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے انہیں اس سے منع نہیں فرمایا جیسا کہ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کی ہے۔ امام ترمذی نے سند صحیح سے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- کی یہ حدیث شریف روایت کی ہے: "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویعرف شرف کبیرنا"، ترجمہ: "جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں سے عزت و شرف سے واقف نہیں ہوتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

امام احمد نے بھی یہ حدیث شریف روایت کی ہے : "وہ شخص میری امت میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کی بزرگی کا احترام نہیں کرتا اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے عالموں کے حق کو نہیں جانتا"۔

امام ابو داؤد نے جید سند سے حدیث شریف روایت کی ہے کہ اللہ رب العزت کی عظمت میں سے یہ ہے کہ سن رسیدہ مسلمان اور قرآن کریم پر عمل کرنے،اس میں غلو نہ کرنے اور اس سے دور نہ رہنے والے اور انصاف کرنے والے حاکم کی عزت و تکریم کی جائے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ چار اسباب کی بناء پر کھڑا ہوا جاتا ہے :

اول ۔ ممنوع :ایسے شخص کیلئے کھڑا ہونا جو یہ چاہے کہ لوگ اُس کی تعظیم اور بڑائی کیلئے کھڑے ہوں۔

دوم۔ مکروہ: یہ اُس شخص کیلئے کھڑا ہونا ہے جو یہ تو نہیں چاہتا کہ کھڑے ہونے والے لوگ اُس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوں لیکن یہ اس بات کا خدشہ ہو کہ کہیں ممنوعہ باتوں کا سبب نہ بن جائے۔ اور جن میں جابروں سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

سوم۔ جائز:یہ کسی ایسے شخص کی تعظیم و اکرام کیلئے کھڑا ہونا جسے اس کی خواہش نہ ہو اور وہ جابروں کی مشابہت سے بھی بچ سکتا ہو۔

چہارم۔ سنت:یہ کسی سفر سے آنے والے کیلئے خوشی کے طور پر اسے سلام کرنے ، اس کا خیر مقدم کرنے ، کسی کو دوبارہ نعمت حاصل ہونے پر مبارک بادی دینے یا مصیبت آنے پر تعزیت کیلئے کھڑا ہونا۔ ([193])

اس سے اُن احادیث کی وضاحت ہوتی ہے جن میں کھڑے ہونے کو منع کیا گیا ہے۔ جیسے ابی داؤد اور ترمذی کی وہ حدیث حسن جس میں کہا گیا ہے کہ: "من أحب أن يتمثل له الرجال قياما فليتبوأ مقعده من النار"، ترجمہ: "جس شخص نے اس بات کو پسند فرمایا کہ مرد اُس کیلئے کھڑے ہوں تو اُس نے آگ میں اپنا ٹھکانا بنالیا۔

اسناد حسن سے ابی داؤد اور ابن ماجہ کی ابی امامہ الباہلی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کردہ وہ حدیث شریف ہے جس میں انہوں نے کہا : رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- عصا

---

[193] غذا ا الالباب از سفارینی ج ۱ ص ۲۷۵ اور اس کے بعد۔

ٹیکتےہوئے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- کیلئے کھڑے ہوگئے ۔ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "لا تقوموا کما تقوم الأعاجم -یعظم بعضهم بعضا "، ترجمہ: "کھڑے نہ ہو جس طرح کہ اعجمی ایک دوسرے کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوتے یں"([194])۔
واللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

104۔ تعلیم میں موسیقی اور آ لات موسیقی استعمال کرنے کا حکم

سوال: تعلیم میں موسیقی اور آ لات موسیقی استعمال کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیاگیا۔

خلاصہ فتویٰ: تعلیم اور اسلامی نغموں وغیرہ میں موسیقی اور ان کے علاوہ دوسرے مقاصد کیلئے لھوو لعب کے آ لات استعمال کرنا جائز نہیں۔

اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ وا لافتاء ۱۲/۱۸۳۔۱۸۶

تبصرہ:
موسیقی کے ساتھ نغمے گانے کے حکم کے بارے میں فقہاء کی آرا ء مختلف ہیں جو حرام اور مباح کے درمیان ہیں۔ جنہوں نے اس کی اجازت دی ہے انہوں نے حسن کلام کی موجودگی اور نسواں سے ہم کلامی اور فضولیات سے پاک ہونے کی شرط لگائی ہے۔
علمی رد:
موسیقی کے ساتھ نغمے اور گانوں کے بارے میں فقہا کی آراء مختلف ہیں جو جائز اور ناجائز ہونے کے درمیان ہیں۔ ناجائز ہونے کی آرا ء زیادہ ہیں۔ تحقیق کار علماء کی جماعت کا خیال ہے کہ گانے کے بارے میں جتنی بھی احادیث وارد ہوئی ہیں وہ یا تو صحیح نہیں ہیں اور جو صحیح ہیں ان سے استد لال صحیح طور پر نہیں کیا گیا۔ یعنی اُن سے صحیح مفہوم اخذ نہیں کیا گیا۔ یا پھر موسیقی کو حرام یا ناجائز قرار دینے والی کوئی قرآنی آیات نہیں ہیں۔ ابن العربی المالکی کا کہنا ہے کہ یہ احادیث جو گائیکی کے بارے میں ہم پیش کرتے ہیں ان میں کوئی چیز صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو بیان اور منتقل کرنے والے اہل ثقہ نہیں ہیں جہاں تک کھیل کے طبلہ کا تعلق ہے جو دف کے مانند ہوتا ہے ،اسی طرح نکاح کی شہرت اور اسکا اعلان کرنے والے آ لات ہیں۔ ان آ لات کا استعمال شادی بیاہ میں جائز ہے بشرطیکہ کلام اچھا ہو اور یہ نسوانی گفت و شنید سے پاک ہو ۔ انہوں نے شادی میں بعینہ دف بجانے کی

---

[194] ابو داؤد فی الادب ۵۲۳۲ ، عراقی نے احادیث احیاء کی تخریج میں ابو العدیس کے بارے میں کہا یہ غیر معروف ہے، ابن حجر نے الفتح میں الطبری کے حوالے سے اسے ضعیف بتایا ہے۔

اجازت نہیں دی ہے بلکہ انہوں نے ہر اس آلے کے استعمال کی اجازت دی ہے جس سے شادی کا اعلان ہوتا ہو اور لوگوں میں اسے مشہور کیا جاتا ہو۔ (حضرت) ابو بکر صدیق (رضی اللہ تعلی عنہ) کے اس قول"یہ کیا ؟ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم-کے گھر میں شیطانی بانسری؟ چنانچہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "دعھن"اے ابوبکر، انہیں چھوڑ دو (یعنی بجانے دو)آج یوم عید ہے " کی بناء پر کہ شادی میں بانسری کا استعمال جائز ہے ۔ لیکن عورتوں کا مردوں کے سامنے آنا جانا اور بے پردگی جائز نہیں اور نہ ہی رفث (یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو) جائز ہے۔ (195)
اگر اس میں مذکورہ کوئی خلاف ورزی کی گئی تو یہ ابتدا ء ہی سے جائز نہیں اور یہ اپنے اصل حکم سے علیحدہ ہوجاتی ہے۔ ابی مالک ا لاشعری کی بخاری کی بخاری شریف میں وارد وہ حدیث شریف جس کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا: "لَيَكُونَنّ مِنْ أُمّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلّونَ الْحِرَ وَالْحَرِيرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ"، ترجمہ: "یقینا میری اُمت میں ایسی اقوام ہونگی جو لباس کو طویل ، ریشم ، شراب اور موسیقی کو حلال کرلیگی۔ (196)
ابن حزم نے اس حدیث کو منقطع بتایا ہے اور امام بخاری اور اور صدقہ بن خالد کے درمیان اس کا صلہ نہیں۔ اور اس باب میں کوئی چیز صحیح نہیں اس میں جو بھی ہے وہ موضوع ہے۔ خدا کی قسم یہ تمام یا ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد سلسلہ ثقات سے رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم- تک پہنچتی تو ہم انہیں قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے۔(197)

ان بیانات سے واضح ہوا کہ موسیقی کے ساتھ گانے بجانے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے اور اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ جس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہو توکوئی شخص کسی ایک مفتی کے قول کو لےتا ہے اور دوسرا شخص کسی دوسرے مفتی کے قول کوقبول کرتا ہے۔اور اس میں جس کسی کی رائے پسند آئے اسے قبول کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ نغمے گانے کے مسئلہ میں انتہائی ضروری بات یہ ہے کہ یہ آداب اسلامی اور اس کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔ مثلاً کسی نغمے میں شراب کی تعریف کی جائے، اس کے پینے پلانے کی طرف رغبت دی جائے، تو ایسا گانا پیش کرنا اور اس کا سننا دونوں حرام ہے اور دین ہر چیز یہاں تک کہ عبادت میں بھی غلو اور حد سے بڑھنے نیز اصراف کے خلاف جنگ کرتا ہے تو کھیل کود میں اصراف اور وقت ضائع کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب کہ وقت زندگی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جائز امور میں وقت کا اسراف کیا جائے تو ان میں واجبات کی ادائیگی کا وقت بھی ضائع ہوجاتا ہے اور کسی نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ میں نے کوئی اسراف نہیں دیکھا جس کے ساتھ ساتھ حق کا ضیاء نہ ہوتا ہو۔واللہ اعلم.

ڈاکٹر یاسر عبدالعظیم

105- کھیلوں کے مقابلہ دیکھنے کاحکم

195 احکام قرآن از ابن عربی ۵۲۷/۳.
196 البخاری معلقا ۵۵۹۰.
197 المحلی از ابن حزم ۵۶۵/۷.

سوال: کھیلوں کے مقابلے دیکھنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیا کہا گریہ انعامات ،یا کسی عوض کے لئے ہوں تو جائز نہیں لیکن جب اسمیں بے پر دگی و عریا نیت نہ ہو ،یا فرائض سے غافل نہ کرےاور عوض کے بغیر ہو تو جائز ہیں۔

فتاوی اللجنہ الدائمہ 15/238-239

الشیخ سعید عبدالعظیم www.alsalafway.com

تبصرہ:
کھیلوں کے مقابلے اور انکا دیکھنا دراصل جائز ہے بشرطیہکہ تمام کھیلوں میں مطلوبہ آداب کی حفاظت کے علاوہ کھیل میں حد سے تجاوز اور فرائض سے غفلت نہ ہو۔

علمی رد:
یہ ایک واضح حقیقت ہے کی وہ اشیاء جن میں کوئی ضرر نہ ہو اور انکی ممانعت میں شرعی نص بھی وارد نہ ہوئی ہو تو وہ اپنی اصل حالت جواز پر باقی رہتی ہیں ۔جسکی عمومی دلیل

یہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿هُوَ الّذِي خَلَقَ لَكُم مّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً﴾، ترجمہ: وہ جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے بنایا۔

اور اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَسَخّرَ لَكُم مّا فِي السّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ ترجمہ: "اور اسنے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے (نظام کے تحت)مسخر کر دیا ہے"۔

اور شرعی ذمہ داریاں بھی وسعت اور استطاعت کی حدود میں ہیں اور معقول حد تک انسان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے اور جسم و روح کی تسکین سے محروم نہیں کیا جاتا اور ورزشی کھیلوں (کا تعلق بھی) دلی خوشی سے ہے اور ہر قوم ان میں سے اپنے لئے مناسب (کھیل)کو پسند کرتی ہے ، فٹ بال قدیم کھیلوں میں سے ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تقریبا 3 ہزارسال پہلے چین میں شروع ہوا تھا اور اغریق کے زمانے میں یونان میں عام ہوا پھر اہل روم نے اسے پایا ، انگلینڈ میں منتقل ہوا پھر (وہاں) سےتقریبا تمام دنیا میں عام ہوگیا/چھا گیا۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ کھیلوں کے مقابلے اور انکا دیکھنا دراصل جائز ہے بشرطیہکہ تمام کھیلوں میں مطلوبہ آداب کی حفاظت کے علاوہ کھیل میں حد سے تجاوز اور فرائض سے غفلت نہ ہو۔

عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز کا فتوی ہے کہ:
فٹ بال اور دیگر کھیلوں کے مقابلوں میں کوئی شرعی ممانعت نہیں بشرطیکہ یہ شرعی ممنوعات سے خالی ہوں ۔جیسے مردوں کا عورتوں یا عوتوں کا مردوں کو دیکھنا یا فرض عین جیسےنمازپنچگانہ، والدین سے حسن سلوک میں غفلت کرنا ،یا کسی ایک ٹیم کی ایسی طرفداری کرنا جو دوسری ٹیم سے دشمنی یا بغض تک پہنچا دے یا ایسے الفاظ کہنا جو کہ شریعت اور آداب عامہ کے منافی ہوں۔[198]

ڈاکٹر انس ابو شادی

[198] ڈاکٹر عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکز۔فتوی نمبر 18809 تاریخ23- ربیع الثانی1423۔

106- اخبار میں کام کرنے کا حکم
سوال: کسی اخبار میں کام کرنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : جواب دیا کہ اخباروں پر شر کے غلبے اور حقیقت سے انحراف، اداکاروں اوراداکارؤں کی خبریں نشر کرے، فتنے،فساد کی اشاعت اور اشتعال انگیزی کی وجہ سے(ان میں کام کرنا) جا ئز نہیں ۔
فتاوی اللجنہ الدائمہ 53-52/15

تبصرہ:
اکثر شرعی قواعد یا مکمل طور پر شرعی قواعد کی پا بندی کرنے والے اخبار میں انسان کا کام کرنا جائز ہے۔اور اگر اس پر حرام اور مفسد مواد کا غلبہ ہو تو اس میں کام کرنا جائز نہیں ہے۔
علمی رد:
اخبار (میڈیا)نسل در نسل اخلاقیات ،افکار اور معارف کی منتقلی کا بنیادی ذریعہ شمار ہوتا ہے اور معاشرتی فکر کی عمدگی اسکی تہذیب کی تشکیل اور اسکی اخلاقیات کی حفاظت میں شریک ہوتا ہے ۔جیسا کہ وہ عام رائے سازی اور زندگی کے تمام پہلؤ ں میں فیصلے کرنے میں بھی معاون ہو تا ہے اور یہ دعوت اسلام کے بنیادی وسائل میں سے ایک ہے جسے ہر جگہ اور زمانے میں عام مسلمانوں کیلئے عمومی طور پر اورداعیان اسلام کے لئے خاص طور استعمال کرنا لازم ہے۔
خبر رسانی اور نشر و اشاعت اصلا مباح ہے اور اسپر پانچ قسم کے احکام مترتب ہوئے ہیں-واجب، مندوب،مباح، مکروہ اور حرام ۔اور یہ حکم پیش کردہ معلومات ، مستعمل وسیلے اور اس پر مترتب آثار اور کیئے جانے والے افعال کے انجام کے مطابق ہوتا ہے۔
خبر رسانی میں اخبار اور ان پر تبصرے افکار اور ان پر بحث و مباحثہ اور اسکے علاوہ دیگر موضوعات پیش کئے جاتے ہیں اور اس پر لازم ہے کہ وہ ان اقدار وآداب اور قانون کی پابندی کرے جو اسکے عدم انحراف اور اسکے پیغام کی کامیابی کی ضمانت ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔
(1) اخبار نقل کرنے میں سچائی اور حقیقت معلوم کرنے کی پابندی کرنا، صحافی کا مقابلے میں کامیابی کے لیئے (اسے)نشر کرنے میں جلدی نہ کرنا۔
(2) ان معلومات کا نشر کرنا جو کہ دینی اقدار اور صحیح قوانین کو تقویت دیں اور شاذ اور منحرف افکار کی ترویج سے اجتناب کرنا ۔
(3) تبصرے اور اآراء کی تنفید میں غیرجانبداری ، بے جا طرفداری اور تعصب نہ کرنا اور آداب کی حدود سے نہ نکلنا۔
(4) دین کے مقررہ قواعد کے بارے میں تنقید سے اجتناب کیونکہ یہ انکے انکار اور افکار کے بارے میں افرا تفری کا موجب بنتا ہے ۔
(5) صحافت کی آزادی مطلق آزادی نہیں بلکہ یہ دینی شعائر ، اخلاق اور صحیح رسم رواج کی جانب سے عائد کردہ قیودات کے پابندی ہے۔
(6) دینی حوالے سے لکھنے اور شائع کرنے میں شدید اہتمام (کی ضرورت ہے) کیونکہ دین کی وہ تا ثیر ہے جسکا فکر کی درستگی اور سلوکیات کی اصلاح کرنے میں کوئی مقابلہ نہیں۔

(7) اسلام دشمنی میں معروف اداروں میں کام کرنے سے اجتناب کرنا جبکہ انکے اعمال میں ظلم وستم اور عدوان کے مظاہر ہوں ،اور ان اداروں میں کام کرنے سے باز رہنا جو کہ شرعی طور پر ممنوعہ اعمال پر قائم ہیں جیسے رذائل اور فحاشی کے لیئے خاص کردہ میگزین اور ٹی وی چینل وغیرہ۔
مکمل طور پر یا اکثر شرعی قواعد کی پابندی کرنے والے اخباروں میں کام کرنا جائز ہے اور اگر اس میں حرام اور فتنہ انگیز مواد کا غلبہ ہو تو کام کرنا جائز نہیں۔

ڈاکٹر انس ابو شادی

107- چارٹر اکاؤنٹینٹ کے طور پر کام کرنے کا حکم
سوال: چارٹر اکاؤنٹنٹ کےطور پر کام کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا؟

خلاصہ فتوی : جواب دیا گیا کہ جائز نہیں کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم میں تعاون ہے۔
فتاوی اللجنہ الدائمہ 20/15

تبصرہ:
اکاؤنٹنگ یا جانچ پڑتال کرنا در حقیقت جائز ہے جب تک کہ وہ مباح سر گرمیوں سے متعلق ہو۔اور حرام سر گرمیوں میں اکا ؤنٹنگ کا کام جائز نہیں سوائے ضروری و اضطراری حا لات میں جو کہ ممنوعات کو مباح کردیتے ہیں۔
علمی رد:
چنانچہ اکاؤنٹنگ کے شعبے میں کام کرنا جائز ہے کیونکہ اکاؤنٹنٹ ایک فنی کام انجام دیتا ہےجسکی بنیاد ایک مباح کام پر ہے، اور اشیاء میں اصل حکم مباح ہے اور شرعی دلیل کے بغیر ممانعت نہیں،مگر وہ کمپنییاں یا ادارے جو براہ راست حرام اعمال انجام دیتے ہیں جیسے شراب یا خنزیر کی تجارت وغیرہ تو ان میں ملازمت جائز نہیں مگر شریعت کے مقرر کردہ ضوابط کے مطابق شدید حاجت کی صورت میں بقدر ضرورت جائز ہے۔اور (اسےچاہئے) کہ وہ اس (عذر) کو زائل کرنے کی کوشش کرے ۔اور اسکی نیت یہ ہو کہ جیسے ہی اسے متبادل موقع میسر آیا تو وہ اس کام کو ترک کر دیگا۔
جہاں تک تعلق ہے ان اعمال کا جن میں حلال اور حرام دونوں ملے ہوں اڈیٹر اسکے جانچ پڑتال کا ذمہ دار ہو تو ضرورتا رخصت کی وجہ سے جائز ہے۔ اور اسے چاہئے اہ وہ اپنی تنخواہ میں سے حرام کام کی مقدار کے مطابق مال نکال دے چونکہ اس کام میں شبہ باقی ہے لہذا ملازم کو چاہئے کہ وہ اسکے ساتھ ساتھ ایسے کام کی تلاش جاری رکھے جس میں شبہ نہ ہو۔
اکاؤنٹنگ میں مشترک ملازم (اکاؤنٹینٹ) کے کام میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ اسکا کردار صرف مالی فیصلوں کی اڈیٹنگ تک محدود ہوتا ہے اور وہ براہ راست شریک نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف امر واقع کا ناقل ہے۔ اور اس سے کوئی مستثنی نہیں سوائے ان کمپنیوں کے جنکی سرگرمیوں کا دائرہ کار بنیادی طور پر محرمات پر مشتمل ہے۔

عبداللہ فقیہ کی زیر نگرانی فتوی مرکزکا فتوی ہے:
اکاؤنٹنگ کا علم لوگوں کے دینی اور دنیاوی امور میں مفید اور اہم ہے ۔دنیوی اعتبار سے تو بہت واضح ہے۔

جہاں تک تعلق ہے دینی امور کا تو اسکے لئے قریب ترین مثال یہ ہے کہ میراث کو سمجھنے کے لئے اس قسم کے علوم کی ضرورت ہے۔
جب یہ ثابت ہو گیا تو اب مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ اس علم میں ماہر ہوں اور اس میں اعلی درجات حاصل کریں ۔چنانچہ جب اسے (اکاؤنٹنگ کا علم) حاصل کرلیں تو پھر اسے شرعی طور پر مباح چیزوں میں استعمال کریں اور شریعت کی جانب سے مباح کردہ (اعمال) کا میدان بہت وسیع ہے۔
جبکہ سود کے حساب وکتاب میں کام کرنا حرام ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح حدیث مبارکہ ہے: أنه "لَعَنَ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَشَاهِدِيهِ وَكَاتِبَهُ" اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے، ترجمہ: "رسول کریم صلی علیہ وسلم نے سود کھانے والے،کھلانے والے اور اسکے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ اللہ اعلم[199]

ڈاکٹر انس ابو شادی

108۔ قرآن مجید کی قسم اٹھانےکا حکم

سوال: سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے قرآن مجید کی جھوٹی قسم کھائی تو کیا اس پر کوئی کفارہ ہے ؟

خلاصہء فتوی: اس کا جواب دیا گیا کہ قرآن مجید کی قسم کھانا ناجائز ہے کیونکہ اس طرح کی قسموں کی سنت مطہرہ میںکوئی سند نہیں ہے .

الشیخ ابن عثیمین ، نور علیٰ الدرب، ص۴۳

تبصرہ:

قرآن مجید کی قسم عرف عام میں قسم سمجھی جاتی ہے لہذا شریعت میںبھی قسم شمار کی جائے گی اور قسم کو پوری کرنا واجب ہے ا لا یہ کہ گناہ کرنے کی قسم کھائی جائے کیونکہ اس صورت میں قسم کاتوڑنا اوراس کا کفارہ واجب ہے .

علمی رد:

کلام پاک یا قرآن مجید کی قسم کا رواج لوگوں میںعام ہوچکا ہے اسی وجہ سے شرعاً بھی اسے قسم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور قسم کو پوری کرنا واجب ہے بشرطیکہ یہ قسم گناہ کے ارتکاب کی نہ ہو کیونکہ گناہ پر قسم کی صورت میں قسم کھانے والے پر یہ ضروری ہے کہ قسم توڑ کر اس کا کفارہ اداکرے چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" اگر کوئی قسم کھائے لیکن اس کے خلاف میں بھلائی پائے تو بھلائی کرلے اور قسم کا کفارہ دے".

---

[199] مرکذ فتوی زیر نگرانی ڈاکٹر عبداللہ فقیہ فتوی نمبر 57923 –تاریخ ذیقعدہ 1425.

اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا ان کو کپڑے پہنانا ہے اگر کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے کی قدرت نہ ہو تو متواتر تین دن روزے رکھنا ہے. اور کھانا کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دووقت کھلایا جائے ،دوپہر اور رات کا کھانا اتنا کہ وہ سیرہوجائیں اور مذہب حنفی کے مطابق قیمت کی ادائیگی بھی کافی ہے اس کی صورت یہ کہ ہر ہر مسکین کو اتنی رقم دے دی جائے جودو وقت سیر ہوکر کھانے کے لئے کافی ہو. ([200])

ڈاکٹر انس ابو شادی

109۔ چھوٹے پائجامے میں کھیل کی مشق کا حکم

سوال: چھوٹے پائجامے میں کھیل کی مشق کرنے سے متعلق سوال کیا گیا.

خلاصہ فتوی: جواب دیا گیاکہ کھیل میں بھی ران کو بے سترركھنا جائزنہیں.
الشیخ ابن عثیمین فتاوی إسلامیہ 431/4

تبصرہ:
امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک ران ستر میں شامل نہیں ہے،لہذا اس رائے کی بنیاد پر چھوٹے پائجامے میں کھیل کی مشق درست ہے.

علمی رد:
ہر نماز کے وقت اور ستر پرنظر پڑنے کے وقت ستر کو چھپانا مرد وعورت دونوں پر فرض ہے،لیکن مرد وخواتین ہر دو کے سترکی پیمائش میں اختلاف ہے،چنانچہ چہرہ اور ہاتھ کو چھوڑ کر عورت کا پورا بدن ستر میں شامل ہے،اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلاَ يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلاَّ مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ (النور ٣١)، ترجمہ: "اور اپنی آرائش و زیبائش کو ظاہر نہ کیا کریں سوائے (اسی حصہ) کے جو اس میں سے خود ظاہر ہوتا ہے".
جہاں تک مرد کے ستر کا مسئلہ ہے تو واضح رہے کہ علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دونوں شرمگاہ عورت ہیں انہیں دیکھنا جائز نہیں،اوران کو چھپائے بغیر نماز باطل ہے، لیکن دونوں شرمگاہ کے علاوہ جیسے ران ، ناف اور گھٹنا تو ان کے بارے میں علمائے کرام کے درمیان اختلاف ہے، جمہور فقہائے کرام کی رائے میں یہ اعضاء ستر میں شامل ہیں اور ان کا چھپانا فرض ہے،امام احمد ،حاکم اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمر کے پاس سے گزر ہواجبکہ ان کی دونوں ران بے ستر تھیں

---

[200] فتاوی دار الافتاء المصریۃ: مضمون نمبر(٩٢٤)المفتی: فضیلۃ الشیخ حسن مامون١٧ ذوالقعدہ ١٣٧٦ھ١٥ جون١٩٥٧م، مضمون نمبر (٩٢٥) "قرآن کی قسم شرعی قسم ہے " المفتی: فضیلۃ الشیخ احمد هریدی ١٠ جولائی١٩٦٣م.

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: "غطِّ فخذيك فإن الفخذين عورة" اپنی دونوں رانوں کو چھپاؤ کیونکہ دونوں ران ستر ہیں. اورایک دوسرے شخص کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم فرمایا جیساکہ امام مالک کی روایت میں ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن قراردیاہے.

اسی وجہ سے جمہور فقہائے کرام نے شورٹس میں نماز کو باطل قرار دیا ہے جس میں ران کھلے ہوں،اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ چھوٹے پائجاموں میں کھیل کی مشق کرتے ہیں ان لباسوں میں ان کی نماز درست نہیں ہوتی ہے، اور جمہور کے نزدیک یہ ورزش مکمل ستر پوشی کرنے والے لباس میں ہی ہونی چاہئے، لیکن ضرورت اور مجبوری کے پیش نظر ایسے لوگ ان کی رائے اختیار کرسکتے ہیں جو ران کے ستر کے قائل نہیں ہیں کیونکہ امام بخاری کی روایت میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روزاپنی ران مبارک کو کھولا یہاں تک کہ میں ان کی ران مبارک کی سفیدی کو دیکھ رہا ہوں اور امام مالک رضی اللہ عنہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے. والله أعلم.([201])

ڈاکٹر انس ابو شادی

110۔ تالیاں بجانا جاہلیت کی رسم ہے

سوال: تقاریب اور جشنوں میں تالیاں بجانے کے کے بارے میں سوال کیا گیا.

خلاصہ فتویٰ: جواب دیا گیا کہ تالیاں بجانا جاہلیت کی رسموں کا ایک جز ہے، اور کم از کم مکروہ تو ضرور ہے.

الشيخ ابن باز فتاوى معاصرة ص ٦٧

تبصره:

تقاریب کے موقعے پر تالیاں بجانا عبادت نہیں، اور نہ ہی ان میں اللہ تعالی کی عبادت کی نیت شامل ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک قسم کی رسم ہے جسے کچھ لوگوں نے اپنا لیا ہے ، اس کے ذریعے وہ اپنے جذبۂ پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں.

علمی رد:

بے شک جو لوگ تالیوں اور سیٹیوں کے ذریعے اللہ تعالی کی عبادت کرتے ہیں وہ راہ خطا پر ہیں، امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے،اور ان نادان صوفیوں کی بھر پور مذمت کی ہے جو تالیاں بجاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں ان کی رائے میں یہ ایسا عمل ہے جس سے باشعور لوگ اپنا دامن بچایا کرتے ہیں، درحقیقت ایسی حرکت کرنے والے مشرکوں کی مشا بہت اختیار کرتے ہیں کیونکہ وہ کعبۃ اللہ کے نزدیک اس فعل کے مرتکب ہوتے تھے. ختم شد لیکن اس فتوی میں ذکر کردہ تالیاں بجانا عبادت میں شامل نہیں،کیونکہ اس سے اللہ تعالی کی قربت مقصود نہیں ہے، بلکہ وہ رسم و رواج کا ایک حصہ ہے جسے کچھ لوگوں نے اپنے جذبۂ پسندیدگی کے اظہار کے لئے اپنا رکھا ہے، شرعاً اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے ،اگرچہ افضل یہی ہے کہ مساجد میں منعقد ہونے والی تقاریب میں اس سے بچاجائے ،تاکہ

---

201 فتاویٰ دار الافتاء المصرية: مضمون نمبر(١٦٣)المفتى :فضيلة الشيخ عطية صقر، مئى ١٩٩٧.

ظاہری طور پر بھی ان مشرکوں کی مشابہت سے احتراز ہوسکے جو مسجد میں عبادت کی نیت سے ایسی حرکت کرتے تھے.
اس لئے فقہائے کرام نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ خطبہ و نماز کو چھوڑ کر باقی مقامات پر تالیاں بجانا درست ہے، خصوصاً جبکہ اجازت لینے کے لئے یا باخبر کرنے کے لئے یا حسن ترنم کو دوبا لا کرنے کے لئے یا عورت کا اپنے بچوں کو بہلانے جیسے خاص ضرورت کے پیش نظر ہو تو درست ہے لیکن بلا ضرورت مکروہ ہے.([202]) واُللہ أعلم.
ڈاکٹر انس ابو شادی

111۔ شطرنج کھیلنے کا حکم

سوال: شطرنج کھیلنے کے بارے میں سوال کیا گیا.

خلاصہ فتوی: شطرنج بازی کی ممانعت کا فتوی دیا گیا.

الشیخ ابن عثیمین اسئلة مہمة(اہم سوا لات)ص۱۸

تبصرہ:
شافعی فقہاء کے نزدیک اگرتین شرطیں پائی جاتی ہیں تو شطرنج حرام نہیں ہے ، جوا پر مشتمل نہ ہو ، نماز سے غافل نہ کرے، کھیلتے وقت بدگوئی سے زبان پاک رہے.
علمی رد:
اگر شطرنج میں جوا یا اور کوئی حرام امر شامل ہو جیسے شراب نوشی، بے پردگی،نامحرم کے ساتھ تنہائی،گالی گلوچ،فرائض میں کوتاہی، یا کسی قسم کا نقصان تو اس کا کھیلنا ناجائز ہے.
اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ شطرنج حرام نہیں ہے، انہیں میں شافعی فقہائے کرام بھی شامل ہیں، امام شافعی فرماتے ہیں: یہ ایک بے فائدہ کام کے مشابہ ہے ،اورمجھے ناپسند ہے لیکن اس کی حرمت مجھ پر اچھی طرح واضح نہیں ہوسکی ہے، اور امام نووی فرماتے ہیں جہاں تک شطرنج کا معاملہ ہے تو اس بارے میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ مکروہ ہے حرام نہیں،لیکن علمائے کرام کی ایک جماعت کا مذہب اس کی حرمت کے حق میں ہے،لیکن اس بارے میں کوئی قابل حجت حدیث نہیں پائی جاتی ہے جس میں اس کی حرمت کی صراحت ہو،([203])اور جس کی حرمت پر شریعت میں کوئی نص نہ ہو تو وہ اپنی جگہ جائز ہے، بشرطیکہ نقصان دہ نہ ہو یا نقصان دہ کام میںاس کا استعمال نہ ہو،لہذا اگرکوئی جائز فعل کسی حرام امر کا سبب بنے تو وہ اس کی وجہ سے حرام ہوگا نہ کہ بذاتٔ خود،مثال کے طور پر اگر شطرنج کھیلنے وا لااللہ تعالی کے فرائض یا اپنے اہل وعیال کے حقوق کو ضائع کر بیٹھے تو حرام ہوجائے گا. واللہ أعلم.([204])

---

[202] رد المحتار٦/٣٩٥، تحفة المحتاج٢/١٥٠، الفتاوى الفقهية الكبرى٣٥٦/٤.
203 الترغيب والترهيب٤/٤.
204 فضيلة الشيخ محمدرشيدرضا ، فتاویٰ دار الافتاء المصرية: مضمون نمبر(٧١)المفتی :فضيلة الشيخ عطية صقر، مئی ١٩٩٧.

یہاں یہ اعتراض بھی بے جا ہے کہ اس میں مجسمے ہوتے ہیں لہذا حرام ہے،کیونکہ اس کا جواب یہ دیا گیاہے کہ یہ پتھر کے مجسمے مکمل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ناقص ہوتے ہیں،دیکھنے والا ان جانوروں کے خدوخال علامات واجسام میں امتیاز نہیں کرپاتاہے کیونکہ وہ مٹے مٹے سے ہوتے ہیں اور مکمل بھی نہیں ہوتے، اور جب صورت حال یوں ہے تو حرام ہونے کی کوئی بات نہیں([205]).

اور یہ کہنا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالی کی یاد سے غفلت ہوجاتی ہے،تو یاد رہنا چاہئے کہ دنیا کے تمام جائز وناجائز امور کایہی حال ہے کہ وہ اللہ تعالی کی یاد سے غافل کردیتے ہیں، لہذا جو شخص ان چیزوں میں منہمک ہوکراپنی ذمہ داریوں کو پامال کردے تو اس پر حرام ہے،اور اس کو شراب پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ شراب اللہ تعالی کی یاد سے بایں طور غافل کردیتی ہے کہ عقل پرپردہ ڈال دیتی ہے جیساکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا،اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ لوگوں کی نماز میں امامت کی تو انہوں نے اس طرح قراء ت کردی"قل یا ایھا الکافرون، اعبد ماتعبدون، اناعابد ماعبدتم"([206]) یعنی آپ فرما دیجئے اے کافرو!جسکی تم عبادت کرتے ہو اسی کی میں بھی عبادت کرتاہوں،جسکی تم نے عبادت کی اسی کی میں بھی عبادت کر رہا ہوں.[207] لیکن شطرنج میں عقل زائل نہیں ہوتی ہے لہذا اگر ارادہ پختہ ہو تو اللہ تعالی کے ذکر سے غافل نہیں کرسکتی ہے.

اور یہاں اس اعتراض کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اس سے دشمنی اور عداوت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ جب معتدل لوگ کھیلتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا ہے،اور شرپسند لوگوں کا حوالہ درست نہیں کیونکہ یہ کھیلیں یا نہ کھیلیں بہرحال عداوت ودشمنی میں پڑتے ہیں، اسی طرح شراب سے عداوت و دشمنی اس طورپر بھی پیدا ہوتی ہے کہ شراب نشاط وکیف،دلیری وہمت کے جذبہ کو ہوادیتی ہے اور دشمنوں کی گرفت وانتقام کی خواہش میں اضافہ کردیتی ہے، چنانچہ حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ شراب کی کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں: ہم اسے پیتے ہیں تو وہ ہمیں بادشاہ بنا کر رکھ دیتی ہے، اور شیر بنا کرچھوڑ تی ہے ایسا کہ جنگ سے ہمیں کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی ہے. واللہ أعلم.

ڈاکٹرانس ابو شادی

---

[205] ۔شرح فتح القدیر ۴۱٦/۱، المبسوط ۴۷/۲۴:اور مسروق رحمہ اللہ سے مروی ہے بیان کیا ہے:حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پیتل کے مجسموں کو فروخت کئے جانے کےلئے سرزمین ہندوستان کو روانہ کیا تھا،کہا گیا ہے کہ یہ مجسمے میں غنیمت میں ہاتھ آئے تھے،چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں‌سرزمین ہندوستان میں بیچنے کا حکم فرمایا تاکہ ان کی قیمت سے جنگجو سپاہیوں کے لئے اوزار وہتھیار فراہم کئے جاسکے، اس روایت کی توجیہ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ وہ مجسمے اتنے چھوٹے چھوٹے تھے کہ دور سے دیکھنے والے کو نظر نہیں آتے تھے، اور اس طرح کے مجسمے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں‌حضرت دانیال علیہ السلام کی انگوٹھی دستیاب ہوئی جس پر دو بیلوں کے درمیان ایک آدمی کی تصویر تھی اور وہ دونوں اس آدمی کو چاٹ رہے تھے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی پر دومکھیوں کی تصویریں تھیں اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ چھوٹے کو رکھنے میں حرج نہیں ہے. اور فتاوی سبکی میں ہے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ملک شام سے مجسموں پر مشتمل ایک چاندی کا عود دان آیا تو انہوں نے اسے مسجد نبوی شریف کے مؤذنین کے دادا حضرت سعد کے حوالے کردیا ، اور فرمایا جمعہ اور رمضان شریف میں اس میں عود جلاؤ، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سعد ہر جمعہ کو اس میں عود جلایا جاتا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھا جاتا تھا.

206 احکام القرآن ابن العربی:۱٦۵/۲

112۔ پتے اورٹیبل فٹ بال کھیلنے کا حکم اونو Uno۔ منوپلی، Monopoly اور پوکیمونPokemon جیسے کھیلوں کا حکم.

سوال: تاش،ٹیبل فٹ بال،اونو۔ منوپلی کھیلنے کے بار میں سوال کیا گیا.

خلاصہ فتوی: ان کے ناجائز ہونے کا فتوی دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالی کی یاد اور نماز سے غافل کرتے ہیں، اور عموماً دیرینہ عداوت ودشمنی کا سبب بنتے ہیں.

فتاوی اللجنۃ الدائمۃ **۲۳۸/۱۵**

تبصرہ:

ان کھیلوں کی حرمت پر کوئی نص نہیں ہے، اور ہر وہ چیز جس کی حرمت پر شریعت میں کوئی نص نہ ہو،تو وہ اپنی جگہ جائز ہے، بشرطیکہ نقصان دہ یا نقصان دہ امور میں اس کا استعمال نہ ہو.

علمی رد:

ان میں سے کوئی کھیل بھی اگر جوا پر مشتمل ہو تو درست نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں کسی نہ کسی کوایک فریق کے نقصان پر دوسرے کو نفع ملتا ہے، اسی طرح اگر ان کھیلوں کے ساتھ کسی حرام چیز کی آمیزش بھی ہو توبھی حرام ہیں جیسےشراب نوشی کا ساتھ ہونا یا گالی گلوچ اوربدگوئی کا پایا جانا، یا کسی فریضےکا فوت ہونا یا کسی بھی قسم کے نقصان کاپایاجانا.

شافعی فقہائے کرام کا ان کھیلوں کے بارے میںجن کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے ایک عام قاعدہ ہے ، کہ جس میں حساب یا غوروفکرکا مادہ ہو جن سے ذہن تیز ہوتاہے تو جائز ہے لیکن نرد اور بے فائدہ کھیل درست نہیں([208]).

اس قاعدہ کی روشنی میں شطرنج اور نرد قیاس کی اصل ٹھہرے لہذا ان کھیلوں میں سے جو نرد کے مشابہ ہیں اور قسمت ونصیب پر مبنی ہیں ممنوع ہیں،اور زمانۂ جاہلیت کے پانسے کی طرح ہیں،اور جو کھیلنے والے کی مہارت اور چالاکی پر مبنی ہیں جیسے شطرنج تووہ جائز ہیں.

لیکن ظاہری حضرات کا قاعدہ اس سے قدرے مختلف ہے،چنانچہ ان کے نزدیک اصل یہ ہےکہ جس میں حرمت کی کوئی تصریح نہیں ہے وہ اپنی جگہ جائز ہے. اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً﴾ (البقرۃ ۲۹)، ترجمہ: "سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا، اوراللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ﴾ (الانعام۱۱۹)، ترجمہ: "حالانکہ اس نے تمہارے لئے ان (تمام) چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں".

لہذا اگر ان میں سے کسی چیزکی حرمت پرکوئی نص موجود نہ ہو تو وہ جائز ہے اور یہی مذہب شیخ محمد رشید رضا کا ہے چنانچہ ان کے نزدیک ان کھیلوں میں سے صرف وہی ناجائز ہے جو ضرررساں ہو،اور کھیلوں کے متعلق ان کا قاعدہ یہ ہے کہ کھیلوں میں سے جو حرام ہیں ان کی حرمت کی علت یہ ہے کہ ان میں نقصان ہے خواہ یہ نقصان دین سے متعلق ہو یا نفس سے یا عقل سے یا عزت وآبرو یا مال سے متعلق ہولہذا جس میں نقصان بھی نہیں ہے اور اس کی حرمت پر کوئی نص بھی موجود نہیں ہے تو وہ حرام نہیں.

---

[208] اسنی المطالب۳۴۴/۴ الفتاوی الفقہیۃ الکبری ابن حجر الھیتمی ۳۵۷/۴.

اسی وجہ سے بعض شافعی حضرات کا مذہب یہ ہے .چنانچہ تفریحی کام یا کھیلوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ :اگر مال نقصان سے دور ہو، اور زبان بدگوئی سے پاک رہے اور نماز نسیان سے محفوظ رہے، تو ایسا کام درحقیقت دوستوں کے ساتھ دل لگی کا سامان ہے اور حرام ہونے کا اس میں کوئی سوال نہیں([209])، بہرحال اس کے باوجود کھیل میں منہمک ہوجانا اور حد اعتدال سے تجاوز کرجانا کراہت سے خالی نہیں ہے .

جہاں تک ان کھیلوں میں مجسمے کی موجودگی سے متعلق سوال ہے یا یہ کھیل اللہ تعالی کی یاد سے غافل کرتے ہیں، یا دشمنی اور عداوت پیدا کرتے ہیں تو ان کا جواب شطرنج سے متعلق سابقہ فتوے میں گزرچکا ہے وہاں ملاحظہ فرمالیں . اور اللہ تعالی بہتر جاننے والا ہے .

بہرحال اگر یہ کھیل اس قسم کے محرمات سے پاک ہوں تو ممنوع نہیں ہیں لیکن بچوں کو وقت پر نماز کی پابندی کی تاکید کرنا اور ان کھیلوں کے ممکنہ نقصانات سے با خبر رکھنا ضروری ہے .

جیسے وہ کھیل جن میں نیک اہل زمین اور آسمان کے برے مخلوقات کے درمیان جنگ وجدال کی عکاسی کی جاتی ہے اور ان میں ایسے افکار کی ترجمانی کی جاتی ہے جن سے اللہ تعالی کو مورد الزام ٹھہرایا جاتاہے، اورمعززفرشتوں کی شان میں گستاخی کي جاتی ہے .

اسی طرح وہ کھیل جو صلیب یا کفر کے تشخص کی تعظیم توقیر کی تلقین مشتمل ہوتی ہے .

نیز وہ کھیل جن میں جادو کی حقانیت کی نمائندگی ہوتی ہے،اور جادو گروں کی عظمت شان دکھائی جاتی .

اسی طرح وہ کھیل جو اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عداوت پر مبنی ہیں، یا مسلمانوں کی توہین اور غیر کی تعظیم پر مبنی ہوں.

نیز وہ کھیل جو جوا یا شرط پر مبنی ہوں.

یا جسمانی ضرر پر مشتمل ہوں یا جن سے آنکھ یا اعصاب متأثر ہوں.

یا جن سے شدت پسندی یا جرم پروری یا قتل وغارت کو ہوا ملتی ہو.

یا بچے کی طبیعت میں واقعیت پسندی کی بجائے اوہام وخیالات اور ناممکنات کی دنیا میں جینے کا مزاج پیدا کیا جائے جیسے موت کے بعد پھر سے اسی دنیا میں واپس ہونے کا شوق پیدا کرنا، یا ایسی طاقت کی نمائش کرنا جو درحقیقت اس وجود میں ممکن نہیں، یا فضائی کائنات کی ایسی عکاسی کرنا وغیرہ وغیرہ.

واضح رہے کہ یہ نقصانات ان کھیلوں کے شرعی جواز کے درمیان ضرور رکاوٹ ہیں، الا یہ کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو بچوں کی مصلحت کے موافق ہو، جیسے انہیں راہ راست کی طرف رہنمائی کرتے رہنا اور اگر ضرورت پڑے تو ان کھیلوں کو مکمل طور پرموقوف کردینا ،اور تمام تر صورتوں میں ان کھیلوں میں ہار جیت کی ہرگز اجازت نہ دی جائے، کیونکہ اس صورت میں کسی بھی طرح جائز نہیں ہے اگر چہ وہ اپنی جگہ جائز بھی رہاہوتو شرط کی وجہ سے حرام ہوگیا. واللہ أعلم.([210])

ڈاکٹر انس ابو شادی

---

209 اسنی المطالب ۳۴۳/۴.

210 ماخوذ از کتاب فتاوی الاسلام سوال وجواب، الشیخ محمدصالح المنجدج۱ ...ص ۳۰۰۸ سوال نمبر ۲۸۹۸، بحوالہ المسابقات واحکامھا فی الشریعۃ الاسلامیۃ تالیف ڈ/سعد الشثری.

113۔ تعلیم وتربیت کی خاطر جھوٹے قصے تیار کرنے کا حکم
سوال: تعلیم وتربیت کی خاطر جھوٹے قصے لکھنے کے متعلق سوال کیا گیا۔

خلاصہ فتوی: تعلیم وتربیت کی خاطر جھوٹے قصے لکھنے کے ناجائز ہونے کا فتوی دیا گیا۔

فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۱۲/۱۸۷
الشیخ سعید عبد العظیم www.alsalafway.com

تبصرہ:

ہر وہ پسندیدہ مقصد جسکا حصول بغیر جھوٹ کے ناممکن ہو تو اس صورت میں جھوٹ جائز ہے ،بشرطیکہ مقصد بھی جائز ہو،اور اگر مقصد واجب کے درجے میں ہو تو جھوٹ بھی واجب ہے۔

علمی رد:

دراصل بات مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ،چنانچہ ہر وہ پاکیزہ مقصد جسکا حصول سچ اور جھوٹ دونوں طریقوں سے ہوسکتا ہو تو اس صورت میں جھوٹ حرام ہے،لیکن اگر اس کا حصول صرف جھوٹ کے ذریعہ ہی ممکن ہو سچ کے ذریعہ ناممکن ہو تو اس صورت میں جھوٹ جائز ہے،بشرطیکہ وہ مقصد بھی پاکیزہ ہوبلکہ اگر مقصد ضروریات میں سے ہو تو جھوٹ واجب ہے۔

اس پر حدیث صحیح کی دلیل شاہد ہے کہ مصلحت کی خاطر جھوٹ درست ہے لیکن کسی کونقصان پہچانے کے لئے درست نہیں، چنانچہ امام بخاری اور امام مسلم نے ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط سے روایت کی ہے بیان کیاہے: میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی"وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرتا ہے،کیونکہ وہ خیر کو فروغ دیتا ہے یا بھلی بات ہی کہتا ہے"اور ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی پایا جاتا ہے وہ بیان کرتی ہیں: میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی باتوں میں سے کسی بھی بات کي اجازت دیتے نہیں سنی ہے سوائے تین امور کے، یعنی جنگ، لوگوں کے درمیان صلح، شوہر کا اپنی بیوی کے لئے ، بیوی کا اپنے شوہر کے لئے۔ یہاں بیوی شوہر کے درمیان جھوٹ کا مطلب وہ باہمی پیار ومحبت کی باتیں ہیں جن سے خوشگوارزندگی پر مدد ملتی ہے اس پر بہت سارے دلائل موجود ہیں، لیکن ایسے امور میں جھوٹ درست نہیں جس سے ازدواجی زندگی متأثر ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ بعض علمائے کرام نے صرف اسی حد تک جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے جتنے کے بارے میںحدیث پاک میں صراحت ہے لیکن محققین نے ہر اس چیزمیں جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے جس میں مصلحت ہو اور کسی کا نقصان نہ ہو، اور اسی نوعیت کی وہ جھوٹ ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے ساتھ کیاجن کے متعلق

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی خوشخبری دی تھی چنانچہ وہ ان کی کیفیت دریافت کرنے کے لئے کئی دنوں تک ان کے ساتھ رہے اور یہ بتایا کہ ان کے والد ان پر برہم ہیں۔([211])

خلاصہء کلام یہ ہے کہ جائز جھوٹ میں صرف وہی شامل ہے جس سے کوئی نقصان نہ ہو بلکہ پاکیزہ مفاد برآئے، یاد رہے یہ جھوٹ جائزتو ہے لیکن نہایت ہی محدود دائرے میں اس کا استعمال ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے لوگوں کو نقصان پہونچتا ہے اگرچہ وہ نقصان جھوٹ بولنے والے کے نقطہء نظر سے مختصر ہی کیوں نہ ہو ،بہت ممکن ہے کہ وہی نقصان اس شخص کے لئے جس کے حق میں جھوٹ کہا گیا ہے بڑا نقصان ہو .
اور بچوں کے قصے ایسی شخصیات کے واقعات پر مشتمل ہوتے جو واقعتاً پیش آئے ہیں، اور کبھی کبھی خیالی قصے بھی ہوتے جن کا تعلق ماضی ، حاضر ، یا مستقبل سے جوڑ دیا جاتا ہے، اور اس قسم کا اسلوب درحقیقت تعلیمی اور تفریحی اسلوب ہے اور اگر شکل ومضمون راست بازی پر مشتمل ہو اور پاکیزہ مقصد پیش نظر رہے تو جواز میں خبر صادق کی طرح ہے.
اور اگر یہ شخصیات خیالی ہوں جیساکہ عموماً ان قصوں میں ہوتاہے جن سے غیر متعین شخص کا رول مراد ہوتا ہے، اور کبھی کبھی ایسے قصے جانوروں کی زبان پر ترتیب دے جاتے ہیں جیساکہ "كليلة ودمنة " میں ہوا ہے، بہرحال اگر مقصد درست ہو اور مضمون میں کوئی ممنوع چیز شامل نہ ہو، اور اس کے سیکھنے میں کسی فریضے کی ادائیگی کا ضیاع نہ ہو اور نہ ہی اور کوئی جسمانی ،یا عقلی، یا مالی ،یا اخلاقی ضرر ہواور تمام تر نقصانات سے پاک ہو تو جائز ہے([212])

یادرہے کہ باریکیوں پر مشتمل یہ قیود مقبول ومردود قصوں کے درمیان امتیاز کے لئے از حد ضروری ہیں، ان میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی اس کی ممانعت کے لئے کافی ہے، اور کمی بیشی کے اعتبار سے جس قدر خلاف ورزی ہوگی اسی قدر حرمت وکراہت کے احکام مرتب ہونگے،لہذا اگر کسی قابل تعظیم شخصیت پر کیچڑ اچھالنا مقصود ہو ،یا دین واخلاق کے منافی امور کی طرف دعوت دی جائے، یا حرام مضمون پر مشتمل ہو جیسے حدیث نبوی شریف کی طرف جھوٹی بات کی نسبت، یا ناقابل برداشت فتنے یا ضرر کا اندیشہ ہو ان تمام صورتوں میں جھوٹ درست نہیں. واللہ أعلم.([213])

ڈاکٹر انس ابو شادی

---

[211] امام احمد نے قابل قبول سند سے اس کی روایت کی ہے ،الترغیب والترہیب ج۳/ص۲۱۹.

212 اور رد المحتار میں مذکور ہے :"حدثوا عن بنی اسرائیل " یعنی بنی اسرائیل سے بیان کرو، والی حدیث سے غیر یقینی جھوٹ پر مشتمل عجیب وغریب قصوں کے سننے کا جواز ثابت ہوتا ہے لیکن صرف دل بہلانے کی حد تک نہ کہ دلیل کے طور پر، بلکہ یقینی طور پر آدمیوں کے یاجانوروں کے جھوٹے قصے بھی مثال کے طور پر، یا نصیحت کی خاطریا شجاعت کی تعلیم کے لئے بیان کرنا درست ہے، ابن حجر نے اسے ذکر کیاہے، (ابن حجر کا یہ کہنا ،: کہ مثال بیان کرنے کی خاطر جائز ہے الخ. اس کی مثال میں مقامات حریری کو پیش کیاجاسکتاہے کیونکہ بظاہر حارث بن همام اور سروجی کے قصے جو اس میں مذکور ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، انہوں نے اس عجیب وغریب اسلوب میں بیان کیاہے جو مطالعے کرنے والے پر مخفی نہیں ہے. رد المحتار ۴۰۵/۶.

213 فتاویٰ دار ا الافتاء المصرية: مضمون نمبر(۱۳)(٦٥)(۱۱٦)المفتی :فضيلة الشيخ عطية صقر، مئی ۱۹۹۷.